قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

فروری 2018 قیمت ₹15

ماہنامہ

اُردو دُنیَا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

سولاپور کل ہند کتاب میلے کی تصویری جھلکیاں

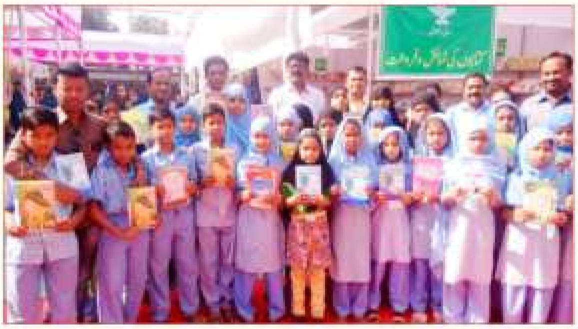

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20، شمارہ:02، فروری 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

معروف نغمہ نگار یوگیش سے ایک ملاقات — صدر عالم گوہر 8

کتاب میلہ

قومی اردو کونسل کا اکیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ — عبدالحی 13

زبان و تعلیم

السنہ عالم کے مختلف خاندانوں کا مختصر جائزہ — فصیح الدین 25

فروری کے فرتاب نشاں

غلام ربانی تاباں — شارب ردولوی 29

مولانا عبدالسلام ندوی اوران کے معاصرین — عبیداللہ ہارون 31

رومان وانقلاب کی معتدل آواز: جاں نثار اختر — محمد افضل 34

علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری — اسود گوہر 37

خراج عقیدت

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب طرز ادیب وخطیب — خیال انصاری 39

نقد و نگاہ

دبستانِ لکھنؤ اور اردو ڈراما — شاہد حسین 42

سکندر علی وجد کی نظم نگاری — مقبول احمد مقبول 46

سلسلۂ صحافت

اخبار 'وکیل' امرتسر — اوم پرکاش سونی 49

یاد رفتگاں

خداداد خاں مونس کی یاد میں — رؤف خیر 51

انور جلال پوری — محمد فرحان خان 53

نیا آسماں نئے ستارے

اردو شاعری میں پھولوں کا تذکرہ — محمد یاسین گنائی 55

فنون لطیفہ

ہندوستان کا عوامی طرز رقص — مقصود احمد انصاری 60

سماجیات

غیر سرکاری تنظیم کا تصور اور خدمات کی فراہمی — محمد شاہد رضا 63

کمپیوٹر

ونڈوز کی بنیادی باتیں 66

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ — ادارہ 71

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

زبان ایک ترسیلی اور ادراکی مظہر ہے۔ دنیا کی ساری زبانیں کسی خاص قوم، ملک اور نسل کے ثقافتی اور تہذیبی تشخص کو ہی ظاہر کرتی ہیں۔ زبانوں کے ذریعے ہی ان کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کا علم ہوتا ہے۔ زبانوں کے بغیر نہ ترسیل ممکن ہے اور نہ ہی تعلیم اور نہ ہی ترقی۔ زبان کے ذریعے ہی ہم ایک دوسرے کے احساسات، جذبات کو سمجھ پاتے ہیں۔

دنیا میں ہزاروں زبانیں ہیں اور ان زبانوں کے بولنے والے اپنی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کے لیے اپنی زبان کو زندہ رکھتے ہیں کیونکہ زبان ہی میں ان کا پورا ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی سرمایہ محفوظ ہے۔ ہندوستان بھی ایک ایسا ملک ہے جس کی شناخت لسانی تنوع کے اعتبار سے بہت مستحکم ہے اور یہی لسانی تکثیریت اور تنوع ہمارے ملک کا انفراد و امتیاز بھی ہے۔ ہندوستان میں بہت ساری زبانیں اور بہت سی بولیاں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ''کوس کوس پر بدلے پانی، چار کوس پر بانی'' یہی بدلتی بانی ہندوستان کے لسانی تنوع کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یہ اور بات کہ تمام بولیوں کا رسم الخط نہیں ہے لیکن جو رسم الخط والی زبانیں ہیں ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ یہاں بہت ساری ایسی زبانیں اور بولیاں ہیں جن سے ہم مکمل واقف بھی نہیں ہیں تاہم ان بولیوں میں بھی ایک بیش قیمت تہذیبی، سماجی سرمایہ محفوظ ہے اور بعض بولیوں میں تو ادب بھی تخلیق کیا جا رہا ہے۔ یہ ہندوستان کی لسانی خوبصورتی ہے کہ یہاں بہت سے لفظ ستارے ہیں جو مختلف علاقوں، منطقوں میں چمکتے رہتے ہیں۔

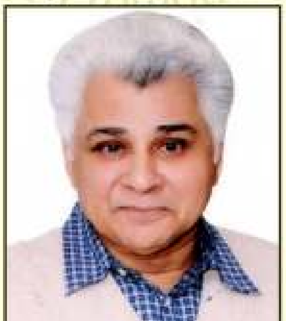

ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں جو سرکار سے تسلیم شدہ ہیں۔ ان زبانوں میں تعلیم و تدریس کا بھی انتظام ہے کہ بہت سے ہندوستانی اپنی مادری زبان میں ہی ابتدائی سطح کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ مادری زبان جسے پہلی زبان کہا جا سکتا ہے بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اسی اہمیت کے مدنظر 21 فروری کو یوم عالمی مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے تاکہ تمام مادری زبانوں کے تشخص اور بقا کو لازمی بنایا جائے اور مادری زبان کے تئیں بیداری پیدا کی جائے۔ دراصل یہ مادری زبان ہی ہے جس سے ہماری شخصی، سماجی اور ثقافتی شناخت وابستہ ہے۔ اسی سے ہمارے سماجی اور ثقافتی طرز احساس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مادری زبان پر ہمارے یہاں اس لیے بھی زور ہے کہ یہ انسان کو اپنی ثقافتی جڑوں سے جوڑتی ہے اور مادری زبان میں بنیادی تصورات کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے۔ تعلیم اس زبان میں دی جانی چاہیے جس سے بچے زیادہ مانوس ہوں اور زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہوں۔ بنیادی سطح پر مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے سے جہاں بہت سے نفسیاتی فائدے ہیں وہیں اس سے بچوں میں خود اعتمادی اور خود اظہاری کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے انھیں ترسیل اور تفہیم میں بڑی آسانی ہوتی ہے اسی لیے ہماری حکومت مادری زبان میں بنیادی تعلیم پر زور دے رہی ہے تاکہ بچوں کا نہ صرف صحیح طور پر ذہنی ارتقا ہو بلکہ تفہیم میں کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بنیادی تعلیمی تدریسی پروگرام میں مادری زبان کی شمولیت صرف اس لیے ہے کہ بچوں کو اس کے ذریعے سے اپنے ماحول، ثقافت، تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بچوں کی بنیاد مادری زبان میں ہی مضبوط ہو سکتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ علم و ادب کی بعض بڑی شخصیات نے مادری زبان کے ذریعے ہی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ ان کے لیے مادری زبان ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی۔ انھوں نے مادری زبان کے علاوہ اور دوسری زبانیں بھی سیکھیں مگر ابتدائی سطح پر انھوں نے مادری زبان کو ہی اہمیت دی اور اس کے ذریعے ماحول اور سماج کے جو تصورات تھے ان کے ذہنوں میں واضح ہوتے گئے۔

مادری زبان سے بچوں کو جوڑنا ہمارا بنیادی فرض ہے۔ چونکہ اسی کے ذریعے ہم زبانوں کو زندہ رکھ سکتے ہیں اور زبانیں وہی زندہ رہتی ہیں جن کا عوامی بول چال میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ جو زبانیں تعلیم و تدریس کا ذریعہ بنتی ہیں ان زبانوں کو زندگی ملتی ہے۔ ہندوستان نے اپنی تمام زبانوں کو یکساں احترام دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف علاقوں میں ان کی مادری زبانوں میں تعلیم و تدریس کا معقول انتظام ہے۔ حتیٰ کہ میڈیکل اور انجینئرنگ میں بھی مادری زبان کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ اردو بھی ایک ایسی زبان ہے جس کے بولنے والوں کی ہندوستان میں اچھی خاصی تعداد ہے۔ مادری زبان کی حیثیت سے یہ بھی تعلیم و تدریس کا ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں بہت سے اردو میڈیم اسکول بھی ہیں جہاں اردو کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں میڈیکل کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو ہی تھی اس لیے اردو میڈیم کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کا حصول بھی مشکل نہیں ہے۔ اب اردو زبان کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کو بہ حیثیت ذریعہ تعلیم فروغ دیں کہ اردو میں علمی، دینی موضوعات کے علاوہ سائنسی و سماجی علوم و فنون پر وافر مقدار میں مواد موجود ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

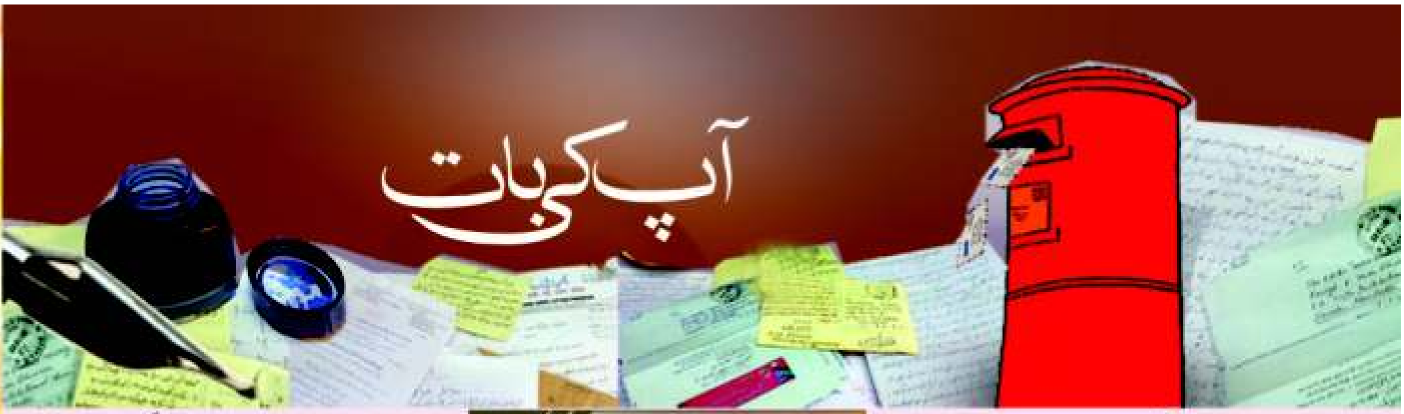

معصوم منظرکشی سے مزین اردو دنیا جنوری 2018 کا خوبصورت سرورق نظر کو بھا گیا، کاش اسی طرح پوری دنیا معصوم، مہذب اور امن پسند ہو جائے۔ اداریہ کے دو بلیغ الفاظ، مطلقاتی، تنازعے، خاصے پزیرائی کے مستحق ہیں۔ ایک مشاق مدیر بڑی بڑی باتوں کو در پردہ کس ہنرمندی سے بیان کر جاتا ہے یہ اس اداریہ میں دیکھنے اور پڑھنے کی چیز ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ 33 سطری اداریہ پوری ذمے داری کے ساتھ لکھا گیا ہے جو اپنے اندر ایک جہان معنی رکھتا ہے۔

مکرمی، عثمانی صاحب کے انٹرویو کا آغاز تو اچھا ہے لیکن اس کا درمیانی حصہ قدرے ہلکا محسوس ہوا، دوسری بات یہ کہ ن آ کی بجائے پورا ناز نام لکھنا چاہیے تھا کیونکہ یہ ایک چھوٹا سا نام ہے۔ صفحہ نمبر گیارہ کے عنوان کے لفظ بیس پر ہندسوں میں 20 لکھا ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کو base بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ عندلیب صاحب کا مضمون انتہائی معلوماتی اور معیاری مضمون ہے۔ احمد سہیل صاحب نے ایلیٹ کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ بھرپور تو نہیں ہے البتہ تشفی بخش ضرور ہے۔ عشرت ناہید صاحبہ کی بازیافت قابل قبول ہے اس مضمون کو حاصل شمارہ مضمون کہا جا سکتا ہے۔ زرنگار صاحبہ کی زرنگاری پسند آئی۔ جمیل مظہری کی نظموں میں رومانیت، نگار صاحبہ کا ایک عمدہ اور خاطر خواہ مضمون ہے۔ رقیہ صاحبہ کا چونکانے والا عنوان اچھا ہے، آفاقی صاحب واقعی ایک آفاقی فکشن نگار تھے۔ محترمہ فرزانہ بیگ کی تلاش لائق اعتناء ہے۔ نیلوفر صاحبہ جیسا کم از کم ایک مضمون ہر شمارے میں ہو تو بہتر ہے۔ سائنس نے سماج میں انقلاب تو برپا ہے مگر تعمیری کم تخریبی زیادہ ہے جس کے مضر اثرات مختلف حادثات کی شکل میں درپیش ہیں۔ مضمون استعجابیہ نیز اطلاعاتی ہے۔ الماس فاطمہ صاحبہ کو باذل عباسی کی محسنہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ خدا کرے کہ ہر گمنام کو ایک الماس مل جائے۔ صفحہ نمبر 62 سے 66 کی تحریر ہم قارئین اردو دنیا کے لیے نہایت مفید و منفعت ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی معاونت سے شائع شدہ تمام کتابیں اچھی لگیں اور ان پر کیے گئے تبصروں نے دل جیت لیا خدا یہ سلسلہ دراز کرے۔

شکیل سہسرامی: بہار قانون ساز کونسل پٹنہ بہار

'اردو دنیا' شمارہ جنوری 2018 بھی گزشتہ شماروں کی طرح عمدہ ہے۔ مضامین، خبرنامہ ودیگر مشمولات رسالے کی اہمیت کو بڑھاتے ہیں۔ میں آپ کی اسی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ اردو نے ہمیشہ سبھی کو محبت کا پیغام دیا ہے۔ رواں شمارے میں شامل مضامین میں، اردو خطوط نویسی کی تاریخ فن اور نمائندہ خطوط نگار، لکھنؤ کی صحافتی خدمات، ونڈوز پر کام کی شروعات اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ادارے کی طرف سے بچوں کی میگزین شائع ہوتی ہے لیکن پھر بھی اردو دنیا میں وقتاً فوقتاً بچوں کے لیے کچھ matter شائع کر دیا کیجیے تاکہ رسالے کی جامعیت بھی بنی رہے اور بچے اس پرچے سے خود کو زیادہ منسلک رکھ سکیں۔

رضوان خان: جنرل سکریٹری بزم اردو سیتاپور، شیخ سرائے، یوپی

اردو دنیا جنوری 2018 کا شمارہ ہاتھوں میں آیا، پڑھ کر خوشی ہوئی۔ محترمہ عشرت ناہید نے 'زلیخا بیگم' ایک اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ مہتاب عالم فیضانی نے قرۃ العین حیدر کے خاندانی پس منظر کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ رقیہ نبی نے پیغام آفاقی کی تخلیقات میں موجودہ زمانے کے رنج والم کے ساتھ ساتھ رشتے ٹوٹنے کے عناصر کو اجاگر کر دیا ہے۔ 'اکیسویں صدی میں اردو ناول' مضمون میں ناول نگاروں کے فکر وفن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی کتاب 'اردو فکشن کے پانچ رنگ' اور ڈاکٹر ایم اے حق صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا رنگارنگ ادبی رسالہ 'عالمی انوار تخلیق' رانچی، دونوں پر کیے گئے تبصرے پسند آئے۔

محمد علیم اسماعیل: ناندورہ مہاراشٹر)

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ 'اردو دنیا' اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین یہ ماہنامہ اردو دنیا میں لاجواب اور بے مثال ہے۔ ہماری بات میں ہر بار نئی بات ہوتی ہے۔ یقیناً ادب کا سرمایہ دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے سچ کہا کہ گذشتہ دنوں اردو دنیا نومبر کے شمارے کی ترتیب کے وقت قومی اردو کونسل کے مرتب کردہ ادبی کیلنڈر میں نومبر کے ماہ میں پیدا ہونے والی شخصیتوں پر مضامین کی جستجو کی گئی مگر یہاں بھی ناکامی ہی ہاتھ لگی۔ یہی حال دسمبر کے شمارے کی ترتیب کے وقت بھی ہوا اور آپ کو چند اشخاص کے سوا دوسری تحریریں نہ مل سکی۔ اس کی اصل وجہ ہماری یونیورسٹیوں کا گرتا معیار اور اساتذہ کی کمی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم ہر وقت اردو کا رونا روتے ہیں مگر ہر ماہ ایک یا دو کتابوں یا رسالوں کے خریدار نہیں بنتے۔ ہماری بات کے ساتھ ہی آپ کی بات بھی ایک ایسا کالم ہے جس میں قارئین دل کھول کر اپنی رائے پیش کرتے ہیں مگر اس میں بھی وہی نام بار بار دیکھنے کو ملتے ہیں اردو کا نیا قاری سامنے نہیں آ رہا ہے۔

دسمبر 2017 کا شمارہ میرے پیش نظر ہے۔ ف س اعجاز سے شکیل افروز کا انٹرویو سمندر کو کوزے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ انشاء کے خصوصی شمارے اردو دنیا میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ یہ انٹرویو کافی عرق ریزی سے لیا ہے۔ اس کے بعد کا جو مضمون ہے کثیر لسانی ملک میں زبان کی تعلیم یہ المیہ آزادی کے بعد سے آج تک ہے اور کبھی بھی حل ہونے والا نہیں۔ کیونکہ ہم غلام ہیں اور انگریزی ہماری زبان بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستوں نے اپنے طور پر سہ لسانی فارمولہ کو اپنا لیا۔ غالب کی ہشت پہلو شخصیت کا اچھا تجزیہ ہے۔ غالب سے منسوب یادگاریں سہیل انجم نے کافی معلومات فراہم کی ہیں بلکہ یہ یادگاریں ختم ہو جاتی اگر

ساحر لدھیانوی یہ نہ کہتے۔ غالب پہ کرم کر کے اردو پر ستم کیوں؟

دیوان غالب نسخہ عرشی تدوین میں مولانا امتیاز علی خان عرشی کا طریقہ کار گوشہ غالب کے تحت آخری مضمون عبدالرزاق کا ہے۔ بھگوت گیتا کا عام فہم ترجمہ دل کی گیتا محمد عتیق الرحمٰن کا معلوماتی مضمون ہے۔ نیا آسمان نئے ستارے کے تحت شوق نیموی کی غزل گوئی (ثاقب فریدی) اور اردو کا چینی نژاد شاعر شید اچینی (محمد عمران) نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

نانڈیڑ میں اردو صحافت (ضیاء الحسن)، اردو اور ٹکنالوجی (ریحان انصاری)، فلم کے تحت راما نند ساگر، (انیس امروہوی)۔ فلمی نغمہ نگاری کی تاریخ کا روشن باب (نشاط حسن)، ونڈوز کیا ہے۔ کتابوں کی دنیا پر تعارف و تبصرہ، عالمی اردو خبر نامہ شامل ہے۔ ہر شمارہ میں اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، سب شامل ہیں۔ ہر گھر میں اس رسالے کو ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر م ق سلیم: صدر شعبۂ اردو شاداں کالج

'اردو دنیا' دسمبر 2017 ہدست ہوا۔ اس میں 'ہماری بات' میں صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔ گویا ایک چیلنج ہے اور اب یہ نکتہ داں و نکتہ رس تلاش بسیار کے بعد بھی خال خال ہی نصیب ہوتے ہیں۔ ص 18 پر زبان کی تعلیم پر لکھا گیا مضمون بہت عمدہ ہے۔ اس میں مختلف ممالک میں زبانوں کی عمومی ترتیب اور تحتانوی مدارس میں نظام ترتیب اور ان سے متعلق مسائل اور ان کے حل کی بڑی عمدہ صراحت کی گئی ہے۔ اس مضمون کی زبان بڑی سادہ اور شیریں ہے۔ ایسی زبان لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں 'بنیادی تخم' اور 'تخم مادری زبان' جیسے الفاظ بڑا مزہ دیتے ہیں۔ پرائمری اور اپر پرائمری اسکول کے اساتذہ اور معلمات کو چاہیے کہ اس مضمون کا ضرور مطالعہ کریں مگر بڑے دھیان سے، کیونکہ یہ نظریہ سے زیادہ عملی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک اور بات ہائی پاور کمیٹی کی بجائے اعلیٰ اختیاری کمیٹی لکھ دیا جاتا تو عبارت کے انداز میں یہ الفاظ کھپ بھی جاتے اور بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آ ہی جاتی۔ "غالب کی ہشت پہلو شخصیت....." ص 15 پر لکھا گیا مضمون اچھا بھی ہے اور سرسری بھی۔ البتہ ص 18 پر غالب کی یادگاروں کے ساتھ روا رکھی گئی ناں منول (لکڑی اور کوئلے کی) اور غالب میوزیم میں در آئی بدنظمی پر ایک احتجاجی مضمون نما مراسلہ درج ہے۔ اسے متعلقہ شعبہ میں داخل کر کے اس پر دباؤ بنائے رکھنا زیادہ مؤثر ہوگا۔ ص 22 پر دیوان غالب کی تدوین میں

مولانا عرشی کے طریق کار کا جائزہ لیا گیا ہے جو ایک تحقیقی نسخہ لگتا ہے۔ ص 34 پر مخمور سعیدی سے متعلق لکھا گیا مضمون واقعی دل تڑپا گیا۔ انسانیت و ہر دل عزیزی کوئی ان سے سیکھے۔ ان کی معیت میں گزرے ہوئے وہ دن آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اتنی باصلاحیت شخصیت اور انکساری کا وہ عالم کہ جس پر شرافت کی تکمیل ہو جائے۔ ہم نے سخت گیر افسروں کو بھی ان کے معاملے میں نرم خو پایا۔ع کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔ ص 39 پر تصوف سے متعلق مضمون لکھا گیا ہے۔ مضمون کے مطالعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ غالباً تصوف کی بنیاد تقویٰ پر ہو۔ تقویٰ کے معنی خدا سے ڈرنے کے بتلائے جاتے ہیں یعنی جن افعال کی ممانعت ہو ان سے پرہیز کرنا۔ اس ضمن میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر نیکی کی جائے تو اکثر تھوڑی دیر میں کامل ہو جاتی ہے۔ مثلاً کھانا کھلانا، کپڑے پہنانا، صدقہ خیرات وغیرہ۔ اس کے برخلاف بدی سے تھوڑی دیر کی بجائے عمر بھر اجتناب کرنا پڑتا ہے۔ یہ پرہیزگاری ایک طویل ترین اور دشوار گزار عمل ہے اور یہی تقویٰ ہے۔ البتہ ثواب جاریہ سے اس کی ہمسری شاید ممکن ہو سکے۔ ص 50 پر لکھے گئے مضمون شیدا چینی میں بڑی ندرت ہے۔ ص 55 اور ص 65 پر لکھے گئے مضامین بالترتیب جدید تکنیک اور اردو اور کمپیوٹر سے متعلق ہیں۔ یہ بڑے عمدہ مضامین ہیں اور ان سے طلبہ کو بہت فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ص 58 اور ص 60 پر فلموں سے متعلق مضامین تفریحی اور معلوماتی ہیں۔ ص 69 سے ص 79 تک کوئی آٹھ عنوانات کے تحت مفصل و مختصر بائیس کتابوں پر تبصرے درج ہیں جو ٹھیک ہی ہیں۔ اور ص 80 تا ص 98 تک کونسل کی کارگزاریاں اور خبریں دی گئی ہیں۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری: روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' دسمبر کا شمارہ مرزا غالب کی خوبصورت تصویر والے سرورق سے آراستہ موصول ہوا۔ اس میں ڈاکٹر نشاط حسن صاحب کا فلمی نغمات و نغمہ نگاروں پر مبنی معلوماتی و تحقیقی مضمون ہے۔ اپنی شعری ندرت کے سبب یہ فلمی سے زیادہ ادبی درجے کے شعرا ہیں، مثلاً گلزار، شکیل، ندا فاضلی، کیفی اعظمی، جاوید اختر ایک ہی زمرے یا صف میں رکھے جانے کے لائق ہیں۔

جناب انیس امروہی کا فلمی ہدایت کار و ناول نگار راما نند ساگر پر مقالہ مختصر ہونے کے باوصف لائق مدح ہے۔

اس مقالے میں چند اغلاط عجلت میں ہی چلے گئے ہیں اور آگے قوسین میں اصلاحی الفاظ رقم کر رہا ہوں۔ صفحہ 62 پر راج مہدی علی خاں (راجہ)، 63 پر گڈ (گڈی)، رسالے کا نام 'پریت کی لڑی' (پریت لڑی)، تیسرے کالم میں پہلی بار 'پیارا' (پیاسا) وغیرہ۔ مشہور ہدایت کار کا نام 'گردت' کی بجائے 'گرودت' ہے۔

شریف الدین صاحب کے مقالے میں اردو ہندی کے مشترکہ ادیب اوپندر ناتھ اشک کے ایک افسانے کا نام 'جہنم کے سات پُل' (ص 29) کی بجائے 'جہلم کے سات پُل' درکار تھا۔ مضمون کے عنوان میں بھی سفر اسم کی صفت لفظ 'تخلیقی' کی جگہ 'افسانوی' سفر زیادہ مناسب ہوتا، کیونکہ اشک جی نے ناولوں کے ساتھ ڈراموں کا ایک ہمہ جہت سنسار تخلیق کیا تھا۔

کرشن بھاوک: کوٹھی نمبر A-201، گلی نمبر A-18، گورونانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

ماہ دسمبر 2017 کا ماہنامہ اردو دنیا اس مرتبہ تاخیر سے دستیاب ہوا جس کا شدت سے انتظار تھا۔ ملتے ہی ورق گردانی کی۔ یوں تو اداریہ 'ہماری بات' ہر ماہ کا مثالی ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ رسالے کی جان ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس ماہ کے اداریے میں جو بات آپ نے کہی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔'' کچھ ایسے ناموں کو تلاش کرنا چاہیے جنھوں نے اردو ادب اور کلچر میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔'' آج کے قلم کار جب بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں تو انھیں وہی دکھائی دیتا ہے۔ جو منظر عام پر ہے۔ پردے کے پیچھے ان کو دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی وہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پردے کے پیچھے ہے کیا۔

شکیل افروز صاحب کا ف س اعجاز سے انٹرویو عمدہ رہے۔ عتیق الرحمٰن صاحب کا خواجہ دل محمد کی 'دل کی گیتا' پر مضمون قابل تعریف ہے۔ 'ونڈوز کیا ہے' بہت ہی معلوماتی مضمون ہے۔ مزید مظفر حسین سید صاحب کا مضمون 'تصوف'

بہت خوب ہے۔ انھوں نے بہت محنت کی ہے مگر ان کی معمولی سی کوتاہی نے ان کی محنت پر گرہن لگا دی۔ انھوں نے کبیرداس کے دوہے کو غلط لکھا ہے۔ دوہا دراصل یوں ہے:

جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ
میں بپورا بوڑن ڈرا رہا کنارے بیٹھ

مجموعی طور پر ماہ دسمبر 2017 کا رسالہ بہت ہی اچھا ہے آپ کی کاوشوں اور محنتوں کو سلام۔

عبدالباری ایم کے: بلوئیسٹ بلڈنگ، سیکٹر نمبر 9، نوی ممبئی

اردو دنیا کے تازہ شمارہ میں جناب ف س اعجاز کا انٹرویو دلچسپی سے پڑھا۔ انھوں نے ادبی صحافت اور بنگال میں اخباری صحافت سے متعلق حقیقت پر مبنی باتیں کہی ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ انھوں نے مقامی ٹیلنٹ کی پرورش کی۔ اس کا ایک ثبوت خود میں ہوں۔ انھوں نے 1990 یا 1991 میں سب سے پہلے میری شعری تخلیقات لگاتار تین شماروں میں شائع کیں جس سے میری پہچان بنی۔ ان کے ساتھ روزنامہ آبشار کے نیوز ایڈیٹر جناب انجم عظیم آبادی نے بھی اسی زمانے میں ادبی صفحے پر میری تخلیقات شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ مگر بعد میں ف س اعجاز نے بک اسٹالوں کو انشا نہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا جس کے بعد انشا سے میرا رشتہ کٹ گیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ غالباً تجارتی وجوہات سے کیا تھا۔ وہ انشا کو زندہ اسی لیے رکھ پائے کہ انھوں نے تجارتی پہلو کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جتنی ادبی پہلو یا ادب کی خدمت کے پہلو کو۔ مدیر ادب کی خدمت تبھی کر سکتا ہے جب اس کا رسالہ تجارتی طور پر مستحکم ہو۔ لہٰذا، ادب کو زندہ رکھنے کے لیے تجارتی پہلو کو مستحکم بنانا بھی ضروری ہوتا ہے اور اعجاز صاحب اس معاملے میں کامیاب رہے۔ بہر حال، شکیل افروز نے سوالات کا دائرہ محدود رکھا انھوں نے صرف انشا اور کلکتہ سے متعلق ہی سوالات کیے۔ پھر بھی اعجاز صاحب نے خود ہی ادب کے موجودہ حالات اور خصوصاً بنگال میں ادب کی موجودہ صورت حال پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ بنگال میں اردو ادب کا حال حوصلہ افزا نہیں ہے۔ شعرا حضرات ہم عصر شعرا و ادبا جن کی ابھی کوئی شناخت نہیں بن سکی ہے کی تعریف میں ہی نظمیں لکھنے میں مصروف ہیں۔ ان کا کوئی آئیڈیل نہیں ہے کیونکہ ان کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے بھی شخصیات پر نظمیں کہی ہیں مگر وہ شخصیات عظیم شخصیات تھیں جنھوں نے ادب، سماج اور تہذیب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے جیسے گرو نانک، گوتم بدھ، سوامی رام تیرتھ، خوشحال خان۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک غیر معروف شخصیت فاطمہ بنت عبداللہ نامی ایک کمسن بچی پر بھی نظم لکھی جس نے خلافت عثمانیہ کی طرف سے جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے جان دی۔ اس کی کہانی Inspiring ہے۔ آج کا ادیب تاریخ، مذہب اور ادب کا مطالعہ نہیں کرتا تو لکھے گا کیا۔ ظاہر ہے وہ اپنے دوستوں پر ہی مضمون یا نظم لکھے گا تا کہ جیتے جی کچھ فائدہ مل جائے۔ جو مضامین آرہے ہیں ان میں زیادہ تر اپنے دوستوں اور گروپ کے شعرا و ادبا کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ قاضی نذرالاسلام نے جتنا گہرا مطالعہ اسلامیات کا کیا تھا اتنا ہی گہرا علم ہندو مذہب کا بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے اسلامی شخصیات پر پر اثر نظمیں لکھیں۔ شاعر جب تک گہرا مطالعہ نہیں کرتا اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں یعنی ادیبوں کو خود احتسابی کرنی ہوگی۔ مرحوم ظفر اوگانوی فرماتے تھے کہ میں ایک من پڑھتا ہوں تب ایک چھٹانک لکھتا ہوں۔ آج کے بنگال کے ادیب ایک چھٹانک بھی نہیں پڑھتے اور ایک من سے زیادہ کوڑا کرکٹ لکھ کر پیار دیتے ہیں۔ اخباری صحافت کے متعلق اعجاز صاحب نے جو بھی کہا وہ درست ہے۔ اخبارات میں زبان کا معیار افسوسناک ہے۔

سہیل ارشد، مرزا غالب اسٹریٹ، رانی گنج، مغربی بنگال

ماہنامہ 'اردو دنیا' کم از کم میری نظر میں ملک کا واحد موقر جریدہ ہے جو وقت پر اور کبھی کبھی وقت سے پہلے قاری کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اس امتیازی حیثیت کے لیے مدیر 'اردو دنیا' ان کی ٹیم کے ساتھ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ماہ اکتوبر کا شمارہ بھی 31 دسمبر کو موصول ہو گیا۔ زیر نظر اس شمارے میں کیرلہ میں اردو لغت نویسی (ریاض احمد) اور عالمی یونیورسٹی رینکنگ (پی ایف رحمان) مضامین بے حد معلوماتی ہیں۔ ابراہیم افسر اور گلشن عبداللہ نے سرسید کے نظریات کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ سید حسنین اختر کے مضمون پروفیسر نثار احمد فاروقی میں سنین کے اغلاط دماغ کو پریشانی میں مبتلا کرتے ہیں۔

ناصر شاھی: 10، شتوارا، برہان پور، مدھیہ پردیش

'اردو دنیا' اکتوبر 2017 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اداریہ بے حد فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے۔ اس شمارے کے بیشتر مشمولات معلوماتی، دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے قائم کردہ رسالے کی فہرست بے حد خوبصورت اور قابل تقلید ہے۔ قابل مسرت ہے کہ سرسید کے حوالے سے بھی چند مضامین شامل رسالہ ہیں۔ نقد و نگاہ کے ذیل میں اسداللہ صاحب کا مضمون بعنوان 'انشائیہ: شناخت اور حدود' پسند آیا۔ نگر نگر اردو کے تحت پروفیسر شبنم حمید صاحبہ کی تنقیدی و تحقیقی تحریر 'اردو کی ادبی و تہذیبی روایت اور الہ آباد' وہاں کی ادبی انفرادیت کو نہایت مدلل انداز میں سامنے لاتی ہے۔ اس مضمون میں الہ آباد کی ادبی و تہذیبی روح سمٹ آئی ہے۔ پروفیسر شبنم حمید صاحبہ الہ آباد سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھوں نے جس انحصار اور خوبی کے ساتھ وہاں کے ادبا و شعرا کا ذکر کیا ہے، وہ لائق مبارک باد اور قابل ستائش ہے۔ اس مضمون سے میری کئی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ عالمی ادب کا گوشہ بھی قابل توجہ ہے، جس میں دو مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون انگریزی ادب کے حوالے سے ہے جبکہ دوسرا عربی ادب کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر محبوب حسن کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ بعنوان 'جین آسٹین: انگریزی کی مایہ ناز ادیبہ' قارئین کو اپنے موضوع و انداز پیش کش کے اعتبار سے متوجہ کرتا ہے۔ اس بات کا اعتراف دیانت داری کی مثال ہوگی کہ اردو کی متعدد اصناف انگریزی کے زیر اثر ہی اردو میں داخل ہوئیں۔ ناول کی صنف بھی ان میں سے ایک ہے۔ میں نے اردو کے علاوہ انگریزی ادب میں بھی ایم اے کیا ہے۔ جین آسٹین میری پسندیدہ ادیبہ رہی ہیں۔ ان کے بیشتر ناولوں کا میں نے براہ راست مطالعہ کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کے تحت جین آسٹین کے معروف ناول "Pride and Prejudice" اور "Sense and Sensibility" کے ترجمے 'شکست پندار' اور 'حس اور احساس' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر محبوب حسن کے مضمون نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ہر چند کہ موصوف نے جین آسٹین کے شاہکار ناول 'پرائڈ اینڈ پریجوڈس' کو ہی اپنے مطالعے کا محور و مرکز بنایا ہے، تاہم یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اس تحریر میں جین آسٹین کی فکری و تکنیکی انفرادیت سمٹ آئی ہے۔ ڈاکٹر محبوب حسن کی کچھ باتوں سے نااتفاقی کے باوجود، جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں، وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ دراصل اردو میں مغربی ادبیات کے حوالے سے ایسی تحقیقی و تنقیدی تحریریں خال خال نظر آتی ہیں۔ اردو کے خود ساختہ ناقدین صرف مغربی ادبیات کے حوالے دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ بے حد معذرت کے ساتھ یہ بات کہنے کی جسارت کر رہی ہوں کہ اردو کے نام نہاد ناقدین کی تحریریں ادبی مسائل کو سمجھانے کی بجائے الجھاتی ہیں۔

ڈاکٹر شاھینہ عباس: شاہ گنج، جونپور، یوپی

■

انٹرویو

معروف نغمہ نگار یوگیش سے ایک ملاقات

صدر عالم گوہر

نغمہ نگار یوگیش کی کہانی افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر افسانے کا گمان ہوتا ہے اور لگتا ہے جیسے ایسا سچ ہو ہی نہیں سکتا۔ جبکہ یہ حرف حرف سچ ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے دوستی کی ایسی مثال پیش کی ہے جو فلموں یا افسانوں میں دیکھنے سننے کو ملتی ہے۔ دوستی کو اس حد تک نبھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں نے ان کی دوستی کی کہانی سنتے وقت یہ شعر ان کو سنایا تھا:

دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا　　　دوستوں کو آزماتے جائیے

اور میرے اس شعر کے بعد انھوں نے بھی دوستی پر اسی قبیل کا ایک شعر سنایا:

دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں ہے　　　دوستوں کی مہربانی چاہیے

لیکن آپ نے تو دوستی نبھانے کی وہ مثال پیش کی ہے جس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔

نغمہ نگار یوگش ایسے نغمہ نگار ہیں جنھوں نے شکیل، ساحر کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے فلموں میں اردو الفاظ کو اس طرح برتا کہ ریکارڈنگ کے وقت نغمہ کو سن کر اور ریہرسل میں گاتے ہوئے گلوکارہ نے موسیقار اوشا کھنہ سے بار بار پوچھا کہ اس نغمے کے شاعر صاحب کون ہیں۔ ریکارڈنگ کے وقت انہیں ضرور بلوائیے گا کیونکہ آشا بھوسلے نے یہ سوچا تھا کہ اس نغمے کے نغمہ نگار کوئی شیروانی اور علی گڑھیا پاجامے میں ملبوس کوئی البیلی سج دھج کے شاعر ہوں گے۔

اور جب نغمہ نگار یوگیش نے ہندی الفاظ کا استعمال شروع کیا تو لوگ انہیں پنڈت جی کہنے لگے اور لوگوں میں پنڈت جی کی شناخت بھی قائم ہوئی۔

نغمہ نگار یوگیش نے انٹرویو کے دوران بتایا کہ میری سب سے زیادہ پٹائی اردو پڑھنے کے لیے ہوئی۔ والد صاحب کو جب بھی پیٹنے کی طبیعت ہوتی تو مجھے اردو پڑھانے بیٹھ جاتے۔

اردو کے دو دبستان تھے۔ ایک دہلی اور دوسرا لکھنؤ تو ہمارے نغمہ نگار یوگیش انہیں دبستانوں میں سے دبستان لکھنؤ کے تھے۔ جہاں کا نوابی ٹھاٹ مشہور ہے۔ جہاں کی لچھے دار اردو اچھے اچھوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ جہاں کی نزاکت اور نفاست کے چرچے عام ہیں۔ یوگیش کے لکھنؤ سے ممبئی کا سفر بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ایک کسی ہوئی کہانی کی طرح ان کی روداد ہے۔ میں نے بمبئی میں گورے گاؤں میں ان کے گھر پر ایک انٹرویو لیا۔ انٹرویو کے بعد جب مجھے اس گھر کی تاریخ معلوم ہوئی تو مجھے ہنسی بھی آتی رہی کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں سردار سورن سنگھ یوگیش جی کو تلوار لے کر ڈھونڈنے آتے تھے۔ آئیے ان کے دلچسپ حالات زندگی کے چند ورق سے آپ کو روبرو کراتے چلیں:

صدر عالم گوہر: آپ اپنے بچپن کے بارے میں بتائیے؟

یوگیش: میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔ وہیں میری تعلیم وتربیت ہوئی لیکن اب جب میں لکھنؤ جاتا ہوں تو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ وہاں کی زبان بدل گئی ہے۔ اب وہاں دیہات سے لوگ آکر رہنے لگے ہیں اور وہ جو خالص اردو کا لہجہ تھا اردو کی نزاکت تھی وہ ختم ہوگئی۔

ص ع گ: آپ فلموں میں کیسے آئے؟

یوگیش: میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں فلموں میں نغمے لکھوں گا اور فلمی نغمہ نگار کہلاؤں گا۔ یہ تو میری ضرورت تھی اور میرے دوست کی ضد تھی جس نے مجھے نغمہ نگار بنا دیا ورنہ کہاں شاعری اور کہاں یوگیش اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔ لوگ اسکول کے دنوں سے الفاظ جوڑ توڑ کرتے رہتے ہیں۔

شاعری کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن میرا ادھر کبھی ذہن نہیں گیا اور نہ کبھی شاعری کرنے کی کوشش کی۔ ہوا یوں کہ میں پڑھ ہی رہا تھا کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ سارے خاندان کی ذمے داری میرے کندھوں پر آگئی کیونکہ میں اپنی فیملی میں واحد مرد تھا۔ اب میں بہت پریشان ہوا کہ اب کیا کروں۔ میرے سارے رشتے داروں نے منھ موڑ لیا۔ جن لوگوں کی میرے والدین نے ساری زندگی مدد کی ان لوگوں نے بھی منھ پھیر لیا۔ ایسے وقت میں میرا ایک دوست ستیہ پرکاش جسے میں پیارے سے سٹو کہتا تھا۔ مجھے بڑی تسلی دی۔ اور اس برے وقت میں میرے ساتھ رہا۔

ص ع گ: دوست کے بارے میں تو شاعروں نے کہا ہے:

دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا
دوستوں کو آزماتے جایئے

یوگیش: اور دوستی پر یہ شعر بھی:

دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں ہے
دوستوں کی مہربانی چاہیے

لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ مجھے ایک سچا دوست ملا جس پر مجھے فخر ہے۔ ایسے دوست دنیا میں نہیں ملتے ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسا دوست ملا۔ شاید اب ایسے دوست نہیں ملتے ہیں۔ اس نے میرے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ میرے حصے کا دکھ بھی اس نے اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ مجھے ایک کامیاب آدمی دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک فلمی رائٹر دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک فلمی نغمہ نگار دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی فکر نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ میرے لیے فکرمند رہتا تھا۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا اور جب میں پریشان تھا تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ بمبئی چلو۔ وہاں تمھارے بھائی فلموں میں کام کرتے ہیں۔ بڑا نام ہے ان کا ایک اچھے رائٹر کے طور پر ان کی شہرت ہے۔ وہ تمھیں فلموں میں کام دلوا دیں گے۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ فلم لائن میں بہت سے ڈپارٹمنٹ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم اگر جائیں گے تو کسی ڈپارٹمنٹ میں نوکری لگا دیں گے اور اسی امید پر میں بمبئی جانے کا قصد کیا۔ میرے دوست سٹو (ستیہ پرکاش) نے کہا۔ تم اکیلے جاؤ گے نہیں۔ میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ تم کو کام لگ جائے گا تو میں واپس آ جاؤں گا۔ پھر کیا تھا ہم دونوں لکھنؤ سے بمبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔ بمبئی کے بارے میں ہم لوگوں کو کوئی معلومات تو تھی نہیں کسی سے جان پہچان بھی نہیں تھی۔ ایک جان پہچان کے ملے تو وہ چرنی روڈ لے گئے۔ چرنی روڈ میں ایک آریہ سماج سنستھا ہے وہاں لے گئے۔ اور سات دنوں تک ٹھہرنے کا انتظام کر دیا، ایک گیلری تھی۔ اس میں اپنا سامان رکھا اور وہاں سے اندھیری آئے۔ بھائی صاحب سے ملنے کے لیے۔ بھائی صاحب سے مل کر بڑی مایوسی ہوئی۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ جیسے ہوتا ہے کہ بمبئی میں کوئی نیا آدمی جو قریبی رشتے دار ہوں وہ اگر ملے تو کہتے ہیں کہ ارے تم کیسے پہنچ گئے سامان کہاں ہے کہاں ٹھہرے ہو۔ یہ سب کچھ نہیں۔ سپاٹ لہجے میں بولے۔

''ہاں ماما جی کا سنا بڑا افسوس ہوا۔ میں نے کہا، لیکن بھائی صاحب مجھے تو اب کام کرنا پڑے گا تو آپ کہیں مجھے.... وہ بولے ضرور ضرور بس اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کہاں ٹھہرے ہو، کب آئے کچھ نہیں پوچھا تو میرے دوست نے کہا،'' یہ کچھ نہیں بھلا کرنے والا ہے تمھارا سمجھ گئے نا۔ میرا خیال ہے اب ہم لوگوں کو لوٹ جانا چاہیے۔ تو میں نے کہا میں وہاں لوٹ کر بھی کیا کروں گا۔ میرے حالات سے تم بخوبی واقف ہو۔ ایسا کرو کہ تم گھر واپس لوٹ جاؤ میں یہاں رہ کر دیکھتا ہوں کہ کیا ہوسکتا ہے۔ سٹو

مجھے ایک سچا دوست ملا جس پر مجھے فخر ہے۔ ایسے دوست دنیا میں نہیں ملتے ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسا دوست ملا۔ شاید اب ایسے دوست نہیں ملتے ہیں۔ اس نے میرے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ میرے حصے کا دکھ بھی اس نے اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ مجھے ایک کامیاب آدمی دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک فلمی رائٹر دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک فلمی نغمہ نگار دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی فکر نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ میرے لیے فکرمند رہتا تھا۔

بولا، پاگل ہوگیا ہے کیا میں تم کو اکیلا چھوڑ کے چلا جاؤں۔ یہ نہیں ہوگا ہم لوگ پانچ سو روپے لے کر آئے تھے۔ اس نے کہا چار پانچ دنوں میں کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ کم سے کم ایک دو مہینے ٹھہرنا پڑے گا اور ایک دو مہینے سر کے اوپر تو کوئی چھت ہونی ہی چاہیے۔ پھر ہم لوگ گرانٹ روڈ سے گھر دیکھنا شروع کیے۔ پانچ سو روپے میں گھر ڈھونڈ رہے تھے بمبئی میں۔ خیر گھر تلاش کرتے کرتے ہم لوگ اندھیری پہنچے۔ اندھیری میں ایک روڈ جاتی تھی ایسٹ میں ناگر داس روڈ اس سے بہت دور جا کر پارسی پنچایت روڈ پھر پہاڑی علاقے۔ اس علاقے میں طبیلے تھے بھینسوں کے۔ غریبوں کے لیے سستے ہوٹل وغیرہ۔ وہاں پر کچھ جھونپڑیاں دکھائی دی لکڑی کی اور اوپر کھپریل 10x12 کا گھر تھا جس میں کوئی لائٹ نہیں پانی نہیں جس کا کرایہ تھا بارہ روپیہ مہینہ ہم لوگ بارہ روپے دے سکتے تھے۔ اس لیے تین مہینے کے لیے وہ گھر لے لیا مگر سوال یہ تھا کہ وہاں رہ کر بھی کیا کریں گے۔ میں نے اپنے دوست کو پھر کہا، تو گھر جا تیرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اس نے کہا پہلے میں دیکھ تو لوں تیرا کیا ہوتا ہے لیکن میرا ہونا کیا تھا کچھ جانتا تو تھا نہیں۔ تو میرے دوست نے صلاح دی تو فلم لائن میں کوشش کر۔ میں نے کہا، میں کیا کوشش کروں۔ مجھے تو فلم کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ تو وہ بولا وہ جو لکھتے ہیں نہ، رائٹر ہوتے ہیں نہ جیسے تیرے بھائی ہیں۔ میں نے کہا، وہ کہانیاں لکھتے ہیں۔ میں کہانیاں نہیں لکھ سکتا۔ میں نے کہا کسی دوسرے ڈپارٹمنٹ میں دیکھتا ہوں پھر میں گیا ایکسٹرا کا کام بھی کیا۔ یہ کیا وہ کیا۔ بہرحال کہیں مستقل نہیں ہوسکا۔ میری پریشانی دیکھ کر اس نے کہا'' ایک کام کر جب تک تیرا کچھ ہو نہیں جاتا میں گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ میں نے کہا، میرا تو برسوں کچھ نہیں ہوگا۔ تو میرے لیے کیوں اپنی زندگی برباد کر رہا ہے۔ تو گھر چلا جا۔ اس نے کہا میرے دو بھائی ہیں اور میرا دل نہیں کر رہا ہے واپس جانے کا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں کوئی پاپ کر رہا ہوں تجھے چھوڑ کر اس حال میں۔ میں بھی سوچنے لگا کہ کیا کروں کیا کروں۔ سٹو اندر ہی اندر کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا۔ پھر اس نے کیا کیا کہ کسی کمپنی میں میرے جان پہچان کے کوئی رشتے دار تھے دور کے۔ وہ مل میں کام کرتے تھے منیجر تھے۔ وہ ان سے جا کر ملا اور میرے لیے کام کی بات کی تو انھوں نے کہا میرے یہاں چپراسی وغیرہ کا کام خالی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے انھوں نے کہا اگلے مہینے میں آنا۔

میں نے سوچا کہ خالی بیٹھ کر کیا کروں۔ ایک آدمی نے جان پہچان بڑھائی اور اس کو اپنی کہانی بتائی تو اس نے کہا کلیان کے ادھر Artificial Silk mill ہے وہاں پر ایک منیجر کی جگہ خالی ہے۔ میں نے کہا میں نے کبھی کام تو کیا نہیں۔ پھر بھی میں کروں گا لیکن سٹو (ستیہ پرکاش) کو نہیں بتایا۔ میں ستیہ پرکاش کو سٹو ہی کہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ساٹھ روپے مہینے ملیں گے۔ میں نے وہ کام پکڑ لیا مجھے کلیان جانے کے لیے 7 بجے نکلنا پڑتا تھا کیونکہ یہاں سے دادر، پھر دادر سے ٹرین بدل کر کلیان

جاتا تھا۔ ستو بولا تو سویرے سویرے کہاں جاتا ہے۔ میں نے کہا فلم لائن میں کوشش کر رہا ہوں۔ وہ بولا فلم کا کوئی آفس دس گیارہ بجے سے پہلے تو کھلتا نہیں ہوگا۔ خیر اس نے زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کی۔ لیکن ایک دن کیا ہوا کہ میں نے دیکھا کہ ستو میرے آفس میں میرے باس کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ میرے باس کو کہہ رہا تھا یہی بھاگا ہوا ہے گھر سے اور آپ نے اسے کام پہ رکھ لیا۔ بغیر کسی سکیوریٹی کے کل روپیہ لے کر بھاگ جائے گا تو کیش وغیرہ تو آپ کیا کریں گے۔ تو انھوں نے کہا سیدھا سادہ لڑکا ہے کوئی، اس لیے رکھ لیا۔ پھر باس نے کہا نہیں نہیں مجھے معاف کرو بھائی میں تمھیں کام پہ نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح ستو نے میری نوکری چھڑوا دی اور مجھے بولا تم اگر کام کرو گے تو صرف فلم لائن میں۔ ستو مجھے فلموں میں کام کرتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اس کا خواب تھا اس کی تمنا تھی۔ جو اوپر والے نے پوری کی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں گانے لکھ سکتا ہوں پھر ایک اور واقعہ ہوا جہاں میں رہتا تھا جو پیڑی میں میرے بغل میں کچھ مزدور رہتے تھے۔ اس نے کہا کہ یوگیش جی کرافورڈ مارکیٹ میں ایک دکان ہے اس میں بہت بڑا کوئی شوکیس بن رہا ہے۔ اس میں آدمی کی ضرورت ہے۔ آٹھ روپے روز لیں گے۔ میں نے پوچھا کتنے دنوں کا کام ہے تو اس نے کہا دس بارہ دن کا کام ہے۔ میں نے کہا میں چلوں گا لیکن میں سات بجے نہیں جاؤں گا میں تم کو ریلوے اسٹیشن پر ساڑھے نو بجے تک ملوں گا اور دوسری بات یہ ہے کہ ستو کو مت بتانا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے پھر میں وہاں گیا۔ دکاندار نے کہا یہ کس لڑکے کو پکڑ لایا ہے۔ اس کو نیچے اتارو۔ پینٹ شرٹ پہن کر کام کرنے کا یہ سب بنیان پہن کر کام کرتے ہیں اور بڑا بڑا لگا اس فٹ کر پائے گا۔ خیر میں کسی طرح وہاں کام کرنے لگا۔ تیسرے دن دیکھا تو سامنے ستو کھڑا تھا۔ اصل میں جو مجھے کام پر لایا تھا وہ پیتا تھا اس نے پی پا کر رات میں بتا دیا تھا۔ اب میں نے جو ستو کو دیکھا تو ڈر گیا کہ آج بہت مارے گا کیونکہ میں مان نہیں رہا ہوں اس کی بات میں کام کرنے لگتا ہوں وہ کوئی دوسرا کام کرنے نہیں دینا چاہتا ہے۔ بچپن کا دوست ہے۔ بہت مارے گا مجھے۔ اس نے اشارے میں کہا کپڑے پہن کر آؤ۔ تو میں ڈرتے ڈرتے اس کے پاس جا رہا تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ گلے لگا کر بہت رویا اور بولا میں مر گیا تھا کیا۔ میں کر رہا ہوں نہ اور دوسرے کام۔ تو کیوں ایسا کر رہا ہے۔ تو یہ سب کام کرنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ بمبئی میں۔ مجھے فلموں میں کام کرنا ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے کیوں ایسا لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی quality ہے۔ کچھ تو Quality ہونی چاہیے نہ۔ لیکن اس دن کے بعد سے میں بہت Serious ہو گیا۔ میں نے سوچا یہ زندگی مجھے کہاں لے کر آئی ہے۔ ماں کی بہت یاد آتی تھی۔ بہنوں کے بارے میں سوچتا تھا۔ طبیعت لگ نہیں رہی تھی اور یہ دوست مجھے کہاں سے مل گیا۔ میرے کئی گانوں میں یہ لائن ہے:

کہیں کوئی دل کبھی مل نہیں پاتے
کہیں سے نکل آئے جنموں کے ناتے

تو میرا دوست ستو اندر ہی اندر کسی کام دھندے کی تلاش میں لگا ہوا تھا تو میرے دور کے چچا جی تھے۔ انھیں کے یہاں اس کو Peon کی نوکری مل گئی۔

ص ع گ: جب آپ شاعری کرنا نہیں جانتے تھے تو پھر فلموں میں نغمہ نگاری کیسے کرنے لگے؟

یوگیش: میں اسے اللہ کی مہربانی سمجھتا ہوں کہ اس نے مجھے یہ ہنر دیا اور وہ بھی اس لیے دے دیا کہ یہ کہیں بھوکا نہ مر جائے میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ میں شاعری کروں گا۔ فلموں میں نغمے لکھوں گا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی شروع سے کچھ سوچتا رہتا ہے کہ مجھے یہ کرنا وہ کرنا ہے۔ مجھے یہ بننا ہے وہ بننا ہے لیکن میں نے شاعری کے بارے میں فلموں کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ تو تقدیر مجھے یہاں لے آئی اور مجھے فلمی نغمہ نگار بنا دیا۔ مجھے شاعری اچھی لگتی تھی۔ بچپن سے مجھے شعر و شاعری پڑھنے کا یاد کرنے کا شوق تھا لیکن میں نے کبھی شعر کہنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی شاعری کی طرف رجحان نہیں تھا۔ دوسروں کے بہت سارے اشعار مجھے یاد تھے۔ پھر مجھے فلم انڈسٹری کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا کہ گانا کیسے لکھا جاتا ہے لیکن ستو کا جو خواب تھا۔ اسی لیے مجھے فلمی نغمہ نگار بننے کی طرف سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس معاملے میں سنجیدہ ہو گیا اور سنجیدگی سے سوچنے لگا اور وہ مقولہ ہے نہ کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔ میں نے اپنے طور پر کچھ لکھنے کی کوشش کی۔ لکھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ فلموں میں 99.9% گانے جو ہیں وہ شاعر نہیں لکھتا یہ شاعر کی اپنی شاعری نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ یہ دھن پر گانے لکھے جاتے ہیں موسیقار لا لا لا کر کے دھن دیتا ہے اور شاعر اسی دھن پہ گانا لکھتا ہے۔ میں نے ابتدائی دور میں کچھ لکھا اور میرے جان پہچان کے تھے۔ بنگالی ان کو سنایا۔ انھوں نے سنا تو وہ بولے واہ بہت اچھا لکھا ہے۔ تم کل سے ادھر آؤ۔ پھر میں ان کے یہاں جانے لگا۔ وہ گھنٹوں ہارمونیم پر لگے رہتے تھے اور کچھ گنگناتے رہتے تھے۔ میں نے کہا آپ نے کہا تھا میرے گیت اچھے ہیں۔ آپ اس دھن کی گیت بناتے ہی نہیں ہیں۔ تو انھوں نے کہا میں یہ کیا کر رہا ہوں۔ دھن ہی تو بنا رہا ہوں۔ لو یہ دھن ہے اس پر لکھو۔ میں نے کہا اس پر کیا لکھوں مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟ آپ لا لا لا کر رہے ہیں۔ اس پر کیسے گیت لکھا جائے گا تو انھوں نے کہا اس پر گیت لکھا جائے گا۔ اسی کو دھن کہتے ہیں۔ اس کو اچھی طرح سمجھو اور اس پر لکھو۔ پھر میں نے اپنا ذہن Concentrate کیا تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آئی اور یہ اوپر والے کی مہربانی رحم و کرم سمجھیے کہ دھن سمجھنے لگا اور دھن پر لکھنا میرے لیے آسان ہو گیا۔

ص ع گ: سنتے ہیں کہ موسیقار سلیل چودھری کے ساتھ گانے لکھنا بڑا مشکل کام تھا۔ آپ نے ان کے ساتھ بڑے اچھے اچھے ہٹ نغمے دیے۔ سلیل چودھری کے ساتھ آپ نے کیسے تال میل بٹھائی؟

”

بچپن سے مجھے شعر و شاعری پڑھنے کا یاد کرنے کا شوق تھا لیکن میں نے کبھی شعر کہنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی شاعری کی طرف رجحان نہیں تھا۔ دوسروں کے بہت سارے اشعار مجھے یاد تھے۔ پھر مجھے فلم انڈسٹری کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا کہ گانا کیسے لکھا جاتا ہے لیکن ستو کا جو خواب تھا اسی لیے مجھے فلمی نغمہ نگار بننے کی طرف سوچنے پر مجبور کردیا۔ میں اس معاملے میں سنجیدہ ہوگیا اور سنجیدگی سے سوچنے لگا اور وہ مقولہ ہے نہ کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔ میں نے اپنے طور پر کچھ لکھنے کی کوشش کی۔ لکھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ فلموں میں 99.9% گانے جو ہیں وہ شاعر نہیں لکھتا یہ شاعر کی اپنی شاعری نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ یہ دھن پر گانے لکھے جاتے ہیں موسیقار لا لا لا کر کے دھن دیتا ہے اور شاعر اسی دھن پہ گانا لکھتا ہے۔

“

یوگیش: موسیقار سلیل چودھری کے ساتھ کام کرنے کے لیے کوئی تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ راجندر کرشن کو چھوڑ دیجیے۔ مجروح سلطانپوری صاحب ایک ہی فلم کے بعد بھاگ گئے ایک ہی فلم لکھی تھی انھوں نے سلیل چودھری کے ساتھ جس کا گانا لتا منگیشکر کی آواز میں:

جارے اڑ جارے پنچھی بہاروں کے دیس جارے

باقی شیلندر جی لکھتے تھے۔ باقی لوگوں کو ان کے ساتھ لکھنا آسان نہ تھا۔ ان کے میٹر جو ہوتے تھے بڑے عجیب بڑے لمبے لمبے جیسے میں آپ کو ایک مثال بتا رہا ہوں میں سلیل چودھری کے گھر سے آ رہا تھا اور انھوں نے کہا تھا لو یہ مکھڑا لو۔ کل صبح تک ایک اچھا سا مکھڑا لکھو۔ پھر میں انترا اپنا کر دوں گا۔ میں پیڈر روڈ سے اس مکھڑے کی ٹیون یاد کرتا ہوا آ رہا تھا۔ حاجی علی درگاہ کے پاس پہنچا تو حاجی علی کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ لاؤڈ اسپیکر پر کوئی ہٹ گانا مت بجا دینا نہیں تو میں ٹیون بھول جاؤں گا اور چلتے چلتے اندھیری تک آتے آتے میں اندر ہی اندر مکھڑا سوچ رہا تھا۔ سچویشن جو سلیل دا نے بتائی تھی وہ یہ تھی کہ ہیرو سائکل پہ گاتا ہوا جا رہا ہے۔ گورے گاؤں آیا اور تب تک راستے میں میں نے مکھڑا تیار کر لیا۔ گورے گاؤں آتے ہی میں نے سب سے پہلے سلیل دا کو فون کیا کہ سلیل دا مکھڑا لکھ لیجیے آپ۔ وہ گانا تھا انورادھا فلم کا کشور کمار نے گایا تھا:

گزر جائے دن دن کہ ہر پل گن گن گن

کسی کی ہائے یادوں میں کسی کی ہائے باتوں میں

کسی سے ملاقاتوں میں

کہ یہ سلسلے جب سے چلے

خواب میرے ہوگئے رنگین

ص ع گ: ارے اتنا لمبا مکھڑا۔ کیا بات ہے یہ صرف مکھڑا تھا؟

یوگیش: ہاں یہ مکھڑا تھا۔

ص ع گ: موسیقار سلیل چودھری کے ساتھ تو گلزار صاحب نے بھی لکھا ہے نہ؟

یوگیش: ہاں گلزار نے بھی لکھا ہے۔ گلزار نے دھن پہ شاید کم لکھے ہوں گے۔ موسیقار آر ڈی برمن کے یہاں دیکھا تھا میں ان کو وہ آکر کچھ بھی دے دیتے تھے لائن۔ پنچم یار بنا لینا اس کو۔ پھر دوسرے دن آتے۔ دوسری لائن دیتے۔

پنچم دا (موسیقار آر ڈی برمن) تو صرف ٹیون دیتے تھے۔

ص ع گ: اچھا موسیقار سلیل چودھری سے آپ کی ملاقات کیسے ہوئی؟ سنتے ہیں جلدی وہ کسی سے گھلتے ملتے نہیں ہیں۔

ہمارے والد صاحب اردو میں ہی لکھتے پڑھتے تھے اور مجھے اردو کے لیے بہت مار پڑتی تھی۔ والد صاحب کو اگر کوئی بہانہ نہیں ملتا پٹائی کرنے کا تو اردو لے کر بیٹھ جاتے لیکن اس وقت دھیرے دھیرے گاؤں سے لوگ آنے لگے تھے۔ شہر میں لیکن زبان بگڑتی نہیں تھی۔ اس وقت جب تک ہم لوگ تھے۔ ابھی تو اچھے پڑھے لکھے لوگ فلم انڈسٹری میں بھی ہیں نغمہ نگاری کرتے لیکن چند گی بولتے ہیں۔ ہم لوگ کبھی جندگی نہیں بولے ہمیشہ زندگی ہی کہا۔ کوئی اگر جندگی بولتا ہے تو بڑا ناگوار گزرتا ہے لیکن اب جب میں کبھی لکھنؤ جاتا ہوں تو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی زبان بگڑ گئی ہے۔

یوگیش: ہاں وہ بہت Reserve رہتے ہیں۔ پڑھا کرتے تھے بہت Encyclopedia پتہ نہیں کون کون سی کہاں کہاں کی کتابیں۔

ص ع گ: وہ تو رائٹر بھی تھے۔ انھوں نے فلم کی کہانی بھی لکھی ہے۔ Poet بھی تھے۔

یوگیش: ہاں وہ Poet بھی تھے۔ ان کا Poet ہونا میرے لیے ایک رحمت تھی۔ ان کے Poet ہونے نے میرا کام آسان کر دیا کیونکہ میں لکھنؤ سے تھا اور لکھنؤ میں اردو زبان تو تھی ہی۔ ہمارے والد صاحب اردو میں ہی لکھتے پڑھتے تھے اور مجھے اردو کے لیے بہت مار پڑتی تھی۔ والد صاحب کو اگر کوئی بہانہ نہیں ملتا پٹائی کرنے کا تو اردو لے کر بیٹھ جاتے لیکن اس وقت دھیرے دھیرے گاؤں سے لوگ آنے لگے تھے۔ شہر میں لیکن زبان بگڑتی نہیں تھی۔ اس وقت جب تک ہم لوگ تھے۔ ابھی تو اچھے پڑھے لکھے لوگ فلم انڈسٹری میں بھی ہیں نغمہ نگاری کرتے لیکن چندگی بولتے ہیں۔ ہم لوگ کبھی جندگی نہیں بولے ہمیشہ زندگی ہی کہا۔ کوئی اگر جندگی بولتا ہے تو بڑا ناگوار گزرتا ہے لیکن اب جب میں کبھی لکھنؤ جاتا ہوں تو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی زبان بگڑ گئی ہے۔

ص ع گ: موسیقار سلیل چودھری سے آپ کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی؟

یوگیش: پہلی ملاقات سلیل چودھری سے میری سبیتا دیدی (سبیتا چودھری) کے ذریعے ہوئی۔ میں نے جس موسیقار کے ساتھ گیت لکھنا شروع کیا ان کا نام تھا رابن بنرجی۔ رابن بنرجی سبیتا چودھری کو کلکتہ سے جانتے تھے دونوں کلکتہ کے تھے۔ رابن بنرجی موسیقار تھے اور سبیتا چودھری سنگر بننے آئی تھیں دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ موسیقار رابن بنرجی کے ساتھ ہم بھی سبیتا چودھری کے یہاں جاتے تھے اور ہم بھی سبیتا دیدی بولنے لگے۔ سبیتا چودھری پہلے سبیتا بنرجی تھیں سلیل چودھری سے شادی ہونے کے بعد سبیتا چودھری ہوگئیں۔ سلیل چودھری کی دو شادی تھی۔ پہلی بیوی باندرہ میں رہتی تھیں اور سبیتا دیدی سانتا کروز میں رہتی تھیں۔ سلیل چودھری سانتا کروز میں سبیتا دیدی کے یہاں آتے تھے۔ میرا سبیتا دیدی کے یہاں جانے کی ایک اور خاص وجہ تھی وہ یہ تھی کہ گراموفون کمپنی جس ریکارڈ میں گیت کار کے گانے ہوتے تھے اس گیت کار کو ایک کاپی دیتی تھی تو جس ریکارڈ میں میرے گیت ہوتے تھے وہ ریکارڈ گراموفون کمپنی کے مسٹر رے لے کر میرے پاس آتے تھے اور مجھے دیتے تھے لیکن میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ اس ریکارڈ کو ہم سنیں کہاں۔ ہم لوگ جھونپڑپٹی میں رہتے تھے۔ گراموفون تو تھا نہیں لیکن سبیتا دیدی کے پاس Juke Box تھا۔ تو ہم ان کے یہاں جاتے تھے اور ان سے کہتے تھے اس ریکارڈ میں میرا گانا ہے اور مجھے سننا ہے تو سبیتا دیدی بولتیں ہاں سن سن میں اپنا کام کرتی ہوں۔ وہ اپنے کام وام میں لگ جاتی تھی اور ہم جوک بکس میں چار پانچ گانے لگا دیتے تھے اور سنتے تھے سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک بار میں نے کہا سبیتا دیدی سلیل دا یہاں آتے رہتے ہیں بھی آپ مجھے بھی ان سے ملوایئے تو انھوں نے کہا ہاں ہاں ضرور ملواؤں گی۔ پھر شادی ہوگئی اور سبیتا دیدی سلیل دا کے یہاں پیڈر روڈ چلی گئیں۔ میں نے ان کو وہ بات یاد دلائی۔ دادا سے ملوانے کی تو انھوں نے کہا آ جاؤ۔ پیڈر روڈ میں ملوا دیتی ہوں۔ پھر میں ایک روز پیڈر روڈ گیا۔ سبیتا دیدی نے سلیل دا سے کہا، یہ یوگیش ہے۔ اور کچھ بنگالی میں بولی۔ میں نے کہا دادا نمستے۔ پھر دی دی نکل گئیں روم سے اور ہم وہیں پر کھڑے رہے۔ دادا نے کہا بیٹھ جاؤ۔ اس وقت دادا کے پاس کام ذرا کم ہوگیا تھا۔ جیسے ہر دور میں ہوتا ہے۔ کام کم زیادہ کا۔ تو اس وقت دادا کے پاس کوئی بڑی فلم نہیں تھی۔ چھوٹی موٹی فلمیں آتی ہوں گی کرتے ہوں گے۔ چونکہ دادا پیڈر روڈ چلے گئے تھے گلزار کو بلاتے تو نہیں آ پاتے تھے۔ ان دنوں ہدایت کاری میں زیادہ مصروف رہتے تھے۔ خیر جو بھی ہو تو ایک دن اچانک کوئی کلکتہ سے آیا۔ کوئی پروڈیوسر تھا فلم بنانی تھی

اس کوتو دادا نے سیتادی دی سے کہا بلاؤ ذرا اس اپنے رائٹر کو بلاؤ تو دیدی نے مجھے فون کیا، میں گیا تو پروڈیوسر سے ملوایا۔ دادا نے پھر کوئی کمپوزیشن دی اور بولے کہ اس پر گیت لکھو میں ذرا مارکیٹ سے آتا ہوں۔ وہ مارکیٹ چلے گئے اور ان کا اسسٹنٹ بیٹھا تھا۔ اس کا نام تھا اکھلیش برڑے میں دادا کے ساتھ پہلی بار کام کر رہا تھا۔ اس لیے میں پہلے سے نروس تھا۔ میں تو Concentrate کر رہا تھا کہ دماغ سے دھن نکل گئی۔ لا لا لا کر کے دھن دے گئے تھے۔ میں بہت یکسوئی سے سوچ رہا تھا پھر دھن کیسے دماغ سے نکل گئی اب کیا کروں۔ حالانکہ دادا آتے تو میں پوچھ لیتا مگر ڈر کے مارے کہ وہ کہیں یہ نہ کہیں کہ دھن تو یاد نہیں رکھ سکتے کام کیا کروگے۔ گیت کیسے لکھوگے۔ اس لیے میں نے ان کے اسسٹنٹ سے کہا کہ دادا ٹیون تو میں......

تو وہ ہنسنے لگے اور بولے یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں نے کہا آپ دھن دیں تو میں کوشش کروں تو وہ بولے ادھر سب کا کام نہیں ہے۔ ادھر شیلندر، راجندر کرشن وغیرہ لکھتے ہیں تم سے یہ سب نہیں ہوگا۔ یہ تمھارے بس کا روگ نہیں ہے۔

ص ع گ : آپ کا دل تو اور ٹوٹ گیا ہوگا؟

یوگیش: ہاں، میں بالکل ناامید ہوگیا۔ سوچنے لگا بڑی مشکل سے ایک موقع ملا تھا وہ بھی بیکار چلا گیا۔ سوچا اب چلوں یہاں سے لیکن دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اے اوپر والے مجھ پر رحم کر۔ ایک اچھا خاصا موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ میں پیڈر روڈ سے اتر کر جسلوک کے پاس بس اسٹینڈ پر بس کا انتظار کر رہا تھا۔ دل میں آیا کہ سلیل دا سے جا کے کہہ دیتا ہوں کہ دادا دھن بھول گیا میں۔ تو کیا وہ مجھے ماریں گے مگر دل میں یہ بھی آ رہا تھا کہ اب کا Impression غلط پڑے گا۔ اتنے میں دیکھا کہ بس آ رہی تھی بس جب تک آئی کہ مجھے جھٹ سے دھن یاد آگئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے بس چھوڑ دی اور سیدھا گیا دادا کے پاس اور گنگنا یا دادا نے اپنی مسز کو آواز دی۔ سیتا سیتا اور اتنے زور سے چلائے کہ میں تو ڈر گیا۔ کہ اب بولیں گے کہاں سے اسے پکڑ کے لائی ہو۔ شاید غلط میٹر میں میں نے لکھ دیا ہے لیکن بنگالی میں بولے 'کیا لکھا ہے؟ تو ان کا اسسٹنٹ کا نورائے پیپر رکھ کے میرا منھ دیکھنے لگا۔ پھر اس کے بعد دادا بہت خوش ہوئے۔ میری جان میں جان آئی۔ پھر دادا بولے انترا ابھی لے کر جاؤ اور اس کو کمپلیٹ کر کے لاؤ پھر میں نے وہ گانا لکھا۔

ص ع گ : تو کیا اس سے پہلے سارے Stunt فلموں میں آپ گیت لکھتے رہے تھے۔

یوگیش: ہاں، دارا سنگھ، انورادھا، آزاد وغیرہ کی

اسٹنٹ فلموں کے گیت لکھ رہا تھا اور اسی لیے تو بمبئی سے لکھنؤ بھاگ گیا تھا۔ اس وقت اصل میں ہوا یہ تھا کہ دو لڑکیوں والا گانا خوب چل گیا تھا۔ کلیان جی آنند جی کا 'ہنستا ہوا نورانی چہرہ' ورجی ایس کوہلی کا 'تم کو پیا دل دیا کتنے ناز سے۔ نیناں لڑ گئے کیسے بھولے بھالے دغا باز سے۔''

اس وقت اس طرح کے گانوں کی مارکیٹ میں مانگ بڑھ گئی تھی جس میوزک ڈائرکٹر کو دیکھو اسی طرح کے گیت لکھنے کی فرمائش کرتا۔ ہر فلم میں دو لڑکیاں ہیرو کے آگے پیچھے ناچ رہی ہیں۔ اس وقت میں بھی اسی طرح کے گیت 'میری زلفیں، میری ادا، میرا نشہ لکھتے لکھتے پریشان ہوگیا تھا اور اس سب کو چھوڑ چھاڑ کر لکھنؤ بھاگ گیا تھا۔

تو جب ہم لوگ فلم 'آنند' دیکھنے گئے تو پہلا گانا شروع ہوا۔ 'میں نے تیرے لیے ہی سات رنگ کے سپنے چنے' تو ہال میں نظر دوڑائی تو پتہ چلا کہ 25% پبلک ہال سے باہر جا چکی ہے۔ پھر اس کے بعد جب وہ گانا آیا۔ نا جیا لاگے نا۔ تب تو اور برا حال۔ سارا ہال خالی ہوگیا۔ لوٹس ٹاکیز میں تو کاٹنا پڑا تھا سارا گانا۔ پھر اس کے بعد جب گانا آیا 'کہیں دور جب دن ڈھل جائے' تو کم سے کم 50% پبلک باہر چلی گئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، کوئی بہت بڑا گناہ ہوگیا ہے مجھ سے یا مجھے گانا لکھنا ہی نہیں آتا۔ سوشل پکچر میں پہلی بار اوپر والے نے موقع دیا۔ مگر میری بدقسمتی کہ وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ میں اس موقعے کا فائدہ اٹھا نہیں سکا۔ صرف معلوم نہیں کیسے 'زندگی کیسی ہے پہیلی' یہ گانا تھوڑا چلا کیونکہ اس کی پکچرائزیشن بڑے اچھے طریقے سے ہوئی تھی راجیش کھنہ چوپاٹی پر رنگ برنگے بیلون لے کر یہ گیت گا رہا تھا۔ اس گانے میں تھوڑی سی پبلک بیٹھی۔

پکچر دیکھنے کے بعد لنک روڈ پر میرے دوست لوگ ملے اور انھوں نے کہا سلیل چودھری کو بولو بہت دنوں کے بعد ایک اچھا چانس ملا ہے اچھا میوزک دیا کرے۔ اب میں نے سوچا میں کیا کروں۔ میں بہت مایوس ہوگیا۔ میرا دل اندر سے ٹوٹ گیا۔ مجھے پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ میں نے اچھے گانے لکھے یا نہیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا شاید مجھے گانا لکھنا ہی نہیں آتا۔ دھیرے دھیرے تین چار مہینے بیت گئے۔ ایک دن Watchman آکر بولا۔ کوئی آپ سے ملنے آئے ہیں پٹنہ سے۔ میں نے کہا لے آؤ چار منزلہ چڑھا کر انھیں۔ وہ بولے آپ نے جو گانا لکھا ہے ''کہیں دور جب دن ڈھل جائے'' میں اس پر پی ایچ ڈی کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، یہ کیا بول رہا ہے۔ میں نے ساہتیہ کار کا ڈریس دیکھا بغل میں جھولا۔ میں تو ڈر گیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا تو انھوں نے کہا آپ کا اجازت نامہ چاہیے۔ میں نے کہا آپ لیٹر بھیج دیجیے گا۔ میں دستخط کر کے بھیج دوں گا۔ بعد میں وہ ڈین بن گئے۔ ابھی بھی میرے ٹچ میں ہیں۔ میں گھبرا گیا کہ یار اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میرے ٹچ میں ایک شاستری تھے۔ مایاپوری میگزین میں کام کرتے تھے۔ بے چارے کچھ کر نہیں پائے اور اب تو وہ بھی نہیں رہے۔ میں ان سے صلاح و مشورہ لیا کرتا تھا۔ میں گھبراتا بہت تھا۔ شاستری سے میں نے اس بارے میں گفتگو کی۔

■

Sadre Alam Gauhar
1138, Tazia Chowk, Azmi Nagar, Nala Par
Bhiwandi, Distt.: Thane - 421304 (MS)
Mob.: 7715980144

عبدالحی

قومی اردو کونسل کا اکیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ

ریاست مہاراشٹر یوں تو کئی معنوں میں زرخیز زمین رہی ہے۔ یہاں بڑی انڈسٹریاں ہیں، بڑے کاروبار ہیں۔ یہاں کے شہر ملک کے اہم تجارتی مراکز میں شمار ہوتے ہیں اور یہ ریاست ملک کی دوسری ریاستوں کے مقابلے زیادہ ترقی یافتہ بھی تصور کی جاتی ہے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ اور ارتقا کا ادھر بیس برسوں میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان کافی پھلی پھولی ہے اور وہاں بنیادی سطح پر بھی اردو تعلیم کا بہتر نظم ہے۔

مہاراشٹر کے اورنگ آباد، مالیگاؤں، ممبئی، بھیونڈی، پونے، ناگپور، امراوتی، ناسک، تھانے، جلگاؤں، بلڈانہ، سولاپور وغیرہ شہروں میں اردو کے تعلیمی اداروں کی بڑی تعداد ہے اور ان میں تعلیم حاصل کر رہے طلبا کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس کے پروفیسر عبدل شعبان کے ذریعے مہاراشٹر اسٹیٹ مائناریٹی کمیشن کے لیے کی گئی ایک ریسرچ کے مطابق پورے مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد 4900 ہے جب کہ اکیلے سولاپور میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد 164 ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو مہاراشٹر اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز بن کر ابھرا ہے۔ اردو زبان وادب کو اس ریاست نے ایک نئی پناہ دی ہے۔ اہل مہاراشٹر کی اردو زبان وادب سے محبت کو دیکھتے ہوئے ہی قومی اردو کونسل نے اپنے اکیسویں کتاب میلے کا اہتمام مہاراشٹر کے سولاپور میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے قبل مہاراشٹر کے بھیونڈی، مالیگاؤں، ممبئی اور اورنگ آباد میں کتاب میلوں کا انعقاد ہو چکا ہے اور ان تمام میلوں میں اردو داں حضرات وخواتین کی اردو زبان و ادب سے محبت اور کتاب دوستی کو لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں اور 'اردو دنیا' میں بھی ان کتاب میلوں کی روداد شائع ہو چکی ہے۔

مہاراشٹر کا سولاپور دکنی کاشی کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ سولاپور میں ہندوؤں کے کئی مقدس مقامات ہیں۔ سولاپور ممبئی سے 400 کیلو میٹر اور پونے سے 245 کیلومیٹر کی دوری پر بسا ہوا شہر ہے۔ اس کے شمال میں عثمان آباد اور احمد نگر ہیں، جنوب میں سانگلی اور بیجاپور ہیں، مشرق میں عثمان آباد اور گلبرگہ ہیں جب کہ مغرب میں ستارا اور پونے بسے ہیں۔ ممبئی، چنئی اور ممبئی، حیدرآباد ریلوے ٹریک پر بسا یہ شہر اپنی تاریخی اور تہذیبی حیثیت کے لیے مقبول رہا ہے۔ قومی شاہراہیں 9، 13، 211، سولاپور سے ہوکر گذرتی ہیں۔ سولاپور، آندھرا بھرتیاس، چالوکیوں، راشٹرکوٹ، دیوگری یادو اور بہمنی و بیجاپور سلطنتوں کے زیر انتظام رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سولاپور 16 گاؤں پر مشتمل ایک بڑا علاقہ تھا اس لیے اس کا نام سولاپور رکھا گیا۔ یہ گاؤں عادل پور، احمد پور، چپل دیو، فتح پور، جمدار وادی، کلاجاپور، کھدر پور، خاندر یگواڑی، محمد پور، رانا پور، سندل پور، شیخ پور، سولاپور، سونا لاگی، سونا پور اور ویدا کیواڑی تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق سولاپور کا نام پہلے سونالی پور تھا، بعد میں سوَل پور اور پھر سولاپور ہو گیا۔ مسلم حکمرانوں کے وقت اس کا نام سندل پور تھا، انگریزوں نے اسے شولاپور کہنا شروع کردیا اور پھر سولاپور میں تبدیل ہو گیا۔ سولاپور ضلع بننے سے قبل احمد نگر، ستارا اور پونے کا حصہ رہا ہے۔ 1838 میں اسے احمد نگر کا سب ضلع بنایا گیا۔ 1871 میں کچھ علاقوں کے ساتھ اسے سب ڈیویژن کا درجہ دیا گیا اور پھر جب 1956 میں ملک میں ریاستوں کی تقسیم کی گئی تو اسے ممبئی اسٹیٹ کے تحت رکھا گیا اور پھر 1960 میں سولاپور کو ایک الگ ضلعے کا درجہ دیا گیا۔

سولاپور کی تاریخ سے ایک انوکھا واقعہ جڑا ہے کہ یہ ملک کا واحد علاقہ ہے جہاں کے لوگوں نے ملک کی آزادی سے قبل تین دنوں کے لیے اسے انگریزوں سے آزاد کرا لیا تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ جب مئی 1930 میں مہاتما گاندھی کو گرفتار کیا گیا تو پورے ملک میں ہنگامے

سولاپور اردو کتاب میلے میں لگا شائقین اردو کا بے پناہ ہجوم: اردو کے لیے امید کی کرن

کسی زبان کی ترقی وترویج کا دارومدار اس زبان کے اختیار کرنے والی قوم پر ہوتا ہے پھر وہ چاہے کسی مذہب، ذات وفرقے یا پھر ملک سے تعلق رکھتے ہوں۔ زباندانی کا تعلق کسی مخصوص طبقے سے نہیں ہوتا یعنی اس زبان کو جس نے اپنایا وہ اس کی زبان ہوگئی۔ ایسا ہی کچھ اردو زبان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا مگر اس زبان کو مسلمانوں نے اپنے ساتھ جوڑ لیا یا حکومتوں یا دیگر طبقات نے اس کو مسلمانوں سے منسوب کردیا یہ بحث کا علیحدہ موضوع ہے لیکن اس زبان کی آبیاری جہاں مسلمانوں نے کی وہیں ہندوؤں نے بھی شجر اردو کی حفاظت کے لیے کمر کس لی اگرچہ ان کی تعداد قلیل ہے لیکن پر اثر ہے۔ اس کے برعکس آج اردو کے نام پر روزی روٹی سے منسلک احباب ایک کثیر تعداد خود اردو کے تئیں اپنی عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔ اب اس بات کو کیا کہیں گے کہ احقر کا تعلق جس علاقے سے ہے وہاں تقریباً 2000 احباب کی روزی اردو کے نام پر ملتی ہے مگر یہاں کوئی اردو رسالہ، اخبار یا کتاب کی خریدی تین ہندسوں تک نہیں پہنچ پاتی بلکہ مراٹھی اخبار اور رسائل خرید کر پڑھنا ان کا شیوہ بنا ہوا ہے۔ ایسے ماحول میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی اور بزم غالب شولاپور کے اشتراک سے سولاپور شہر کے پانگل اردو ہائی اسکول کے وسیع وعریض احاطے میں شائقین اردو کے لیے 9 روزہ اردو کتاب میلہ منعقد کیا گیا تھا 23 دسمبر 2017 تا 31 دسمبر 2017 تک اس میلے میں اردو کے شیدائیوں کے لیے مختلف ادبی، ثقافتی اور روایتی سرگرمیوں کا انعقاد عمل میں آیا۔

دراصل سولاپور شہر ہندوستان کی دکنی ومغربی سرحدی تہذیب کا مرکز ہے جہاں دکنی تہذیب مغربی تمدن کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنی منفرد روایات کو پروان چڑھانے اور اپنی شناخت کو قائم رکھنے میں مصروف ہے۔ سولاپور کی اس سرزمین پر کئی کردار ہیں جو اردو ادب کے فروغ اور ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ سولاپور شہر میں موجود شمع اردو کے پروانوں نے اردو دنیا کو نئے بازار سے آشنا کرنے کی غرض سے اردو میلے کا تصور دیا جو اردو کے شائقین کے ذوق وشوق اور جستجو کو نیا احساس دلایا۔ اسی نہج پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو کی فکر کرنے والی تنظیموں کے ہمراہ اپنے قدم آگے بڑھارہی ہے۔ ممبئی، بھیونڈی اور مالیگاؤں جیسی اردو بستیوں میں اردو میلوں کے کامیاب انعقاد کے بعد سولاپور میں بزم غالب کے ساتھ اشتراک وتعاون کرکے کونسل نے ہندوستان کے کونے کونے سے اردو پبلشرس کو اردو کتاب میلے میں شرکت کی دعوت دی۔ تقریباً 100 پبلشرس وکتب فروشوں نے اس میلے میں شرکت کی۔ سولاپور شہر کے علاوہ ضلع لاتور، عثمان آباد، احمد نگر اور پونا، بھیونڈی ممبئی اور ریاست کرناٹک کے گلبرگہ، بیجاپور سے بھی اردو کے پروانے اپنی شمع ریختہ پر نچھاور ہوتے رہے۔ احقر نے بھی اپنے محسن دوست شاعر اور ادیب ڈاکٹر خلیل صدیقی کے ہمراہ اردو کی عقیدت میں دو یوم اردو میلے میں گذارے تو وہاں میلے میں کتب خریدی کا جو لاَویز منظر دیکھا تو اہالیان سولاپور کی اردو زبان سے عقیدت کو سلام عرض کرنے پر مجبور ہوا اورنگ آباد کے مشہور کتب فروش مولانا مرزہ عبدالقیوم ندوی نے کہا کہ انھوں نے قومی کونسل کی جانب سے شائع ہونے والا ماہنامہ بچوں کی دنیا کی فروختگی کا عالمی ریکارڈ بنایا ہے۔ ساٹھ دنوں میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد رسالے فروخت کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ اس کتاب میلے میں جہاں بچوں کے ادب، اسلامی دینی، سائنس وٹکنالاجی اور طبابت وانجینئرنگ کے موضوعات پر مبنی کتب کو اہمیت دی گئی وہیں خواتین کے لیے بھی مختلف عنوانات پر کتب موجود تھیں۔ تاریخ اور قدیم نایاب کتابوں کے شائقین کے ذوق کی تکمیل کے لیے بھی میلے کے ایک گوشے میں نادر ونایاب کتب کا اسٹال قائم تھا۔ اس میلے کو کامیاب بنانے کے لیے جہاں بزرگ شخصیت بشیر پرواز صاحب اور سیاسی ہستی یو این بیریا صاحب کی راست نگرانی تھی بلکہ اردو کے نوجوان سپاہی جناب آصف اقبال صاحب اپنی پوری اردو پلٹن کے ساتھ اردو کے تحفظ وپاسداری کے لیے ہمہ تن موجود تھے۔ اگرچہ اس میلے کی کامیابی کے لیے کوشاں پس پردہ کئی ایسے نفوس بھی شامل ہیں جن سے ہمارا تعارف نہیں ہے لیکن ان تمام کو ہمارا سلام ہے۔ اس میلے کے ضمن میں قومی کونسل برائے فروغ اردو کے شعبہ اشاعت کے ذمے دار جناب خرم صاحب اور کونسل کی جانب سے شائع ہونے والے مختلف رسائل وجرائد کے مدیر جناب عبدالحی صاحب سے راست گفتگو بھی ہوئی۔ ان حضرات نے اردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل کی جانب سے چلائی جانے والی سرگرمیوں کا احاطہ کیا۔ اور کونسل کے مقاصد کا بھی اجمالا جائزہ پیش کیا۔

سولاپور میں منعقدہ اس کتاب میلے میں نہ صرف کتب کی نمائش اور فروختگی کو ہی مقدم مانا گیا بلکہ دیگر زبانوں کے فروغ اور ترویج کے لیے جن سرگرمیوں کو عوام کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے عین اسی طرح اردو کے پرستاروں کے لیے بھی روایتی طرز کے مزاحیہ، ادبی اور تہذیبی ڈرامے، مشاعرے اور بچوں اور خواتین کی دلچسپی کے لیے روزانہ سرگرمیوں کو ترتیب دیا گیا تھا جس کو نہ صرف اہالیان سولاپور ہی نہیں مختلف مقامات سے اردو کے شیدائی نے محظوظ ہوئے اور اردو زبان نے اپنی عالمگیر یت کا لوہا منوالیا۔ ایک بات اس میلے سے ثابت ہوئی کہ اردو کی قدیم بستیوں میں اردو میلے تو کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہی ہیں لیکن مخلوط تہذیب وتمدن اور اردو کی نئی آبادیوں میں بھی اردو جیسی شیرین زبان کے شیدائیوں نے ہاتھوں ہاتھ لینے میں کسی قسم کی کسر نہ چھوڑی جو اہالیان اور پاسداران اردو ادب کے لیے بانگ ہے کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی''

— محمد مسلم کبیر، لاتور، مہاراشٹر

شروع ہوگئے سولاپور میں بھی ریلیاں نکالی گئیں اور پورے شہر میں انگریزوں کے خلاف لوگوں کا غصہ پھوٹ پڑا۔ سولاپور کی بہادر عوام نے سارے پولس تھانوں سے انگریز پولس آفیسروں کو بھگا دیا اور پھر تین دن 9 سے 11 مئی 1930 تک کوئی بھی انگریز سپاہی سولاپور میں نہیں داخل ہوا۔ اس دوران کانگریس کے مقامی رہنماؤں نے شہر میں نظم ونسق کو بہتر بنائے رکھا۔ یہ تین دن سولاپور کی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ سولاپور میونسپل کونسل ملک کی پہلی میونسپل کونسل تھی جس نے سب سے پہلے 6 اپریل 1930 کو ترنگا لہرایا تھا جس کے بعد انگریزوں نے سولاپور میں مارشل لا نافذ کردیا تھا۔ بڑی تعداد میں آزادی کے متوالوں کو گرفتار کیا گیا اور انہیں پھانسی دی گئی۔

سولاپور اپنی چادروں، ہینڈلوم، پاورلوم اور بیڑی کارخانوں کے لیے مشہور رہا ہے۔ سولاپور کے تولیے، یونیفارم اور سوتی کپڑے بھی اچھے مانے جاتے ہیں۔ یہاں سدھیشور مندر، وٹ ورکچھ مندر، سوامی مٹھ مندر بھی ہندوؤں کے لیے متبرک مقامات ہیں جہاں پورے ملک سے زائرین آتے ہیں۔ سولاپور میں مسلم حکمرانوں کے بنائے قلعوں کی باقیات بھی موجود ہیں۔ سولاپور اپنی صفائی کے لیے بھی مشہور ہے۔ ملک کے دس سب سے زیادہ صاف ستھرے ریلوے اسٹیشنوں میں سولاپور بھی شامل ہے اور اسے چوتھا مقام ملا ہے۔ سولاپور کو اسمارٹ سٹی بنانے کے لیے چنے گئے شہروں میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ شہر اردو زبان وادب، تہذیب وثقافت اور فنون لطیفہ سے دلچسپی

رکھنے والوں کا شہر ہے۔ مشہور و معروف مصور مقبول فدا حسین کا تعلق بھی سولاپور سے تھا اور وہ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ یہی نہیں سشیل کمار شندے (سابق وزیر داخلہ) ششی کلا، اتل کلکرنی (فلم اداکار)، ڈاکٹر جبار پٹیل، ناگراج منجولے (ہدایت کار) سلیل انکولا، پالی امریگر (کرکٹ کھلاڑی) اناگھا دیش پانڈے (خاتون کرکٹ کھلاڑی) وندنا شان باگ (اتھلیٹ) جیسی باصلاحیت شخصیات بھی سولاپور سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں کئی ڈراما گروپ ہیں جو وقتاً فوقتاً ڈراموں کی پیش کش کرتے رہتے ہیں۔ سولاپور میں کل ہند اردو ڈراما فیسٹول بھی منعقد ہو چکا ہے جس میں کئی اہم ڈراما گروپوں نے حصہ لیا تھا۔

سولاپور جیسے تاریخی شہر میں قومی اردو کونسل نے اس لیے بھی کتاب میلے کے انعقاد کا فیصلہ کیا کہ یہاں اردو اسکولوں کی بڑی تعداد ہے اور اردو سے محبت کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ سولاپور کے سوشل اردو ہائی اسکول کے طالب علم تنویر مَنیار نے 1997 میں میٹرک کے امتحان میں پورے مہاراشٹر میں 96 فیصد مارکس لاکر پہلا مقام حاصل کیا تھا۔ آج کل وہ لندن کی ایک بڑی کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ سولاپور میں کتاب میلے کی خبر سن کر وہ بھی کتاب میلے میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ آئے اور کتابوں کی خریداری کی۔ تنویر مَنیار نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنا بڑی کامیابی کا ضامن ہے۔

یہاں کے اردو اسکول اس معاملے میں بھی قابل تعریف ہیں کہ نہ صرف پڑھائی بلکہ ماحولیات کے تئیں عام لوگوں میں بیداری بھی پیدا کرتے ہیں۔ یہاں کے ایس ایس اے پرائمری اسکول کے اساتذہ اور بچوں نے ایک مہم کے تحت پورے شہر میں 2000 درخت لگانے کی مہم چلائی تھی جس کی ریاستی سطح پر کافی ستائش کی گئی تھی۔ یہاں کی مقامی تنظیم خادمان اردو نے اسکولوں سے تعلیم منقطع کر چکے بچوں کو پھر سے اوپن اسکولنگ کے تحت تعلیم سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی کوششیں ہی سماج کو بہتر بنانے میں معاونت کرتی ہیں۔ طالب سولاپوری بھی قابل ذکر ہیں کہ سکھ بھائیوں کے فلاحی کاموں کے لیے لکھی ان کی نظم سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی تھی اور پوری دنیا میں اس نظم کو مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اسی سولاپور کے ایم اے پانگل اینگلو اردو ہائی اسکول کے وسیع و عریض میدان میں قومی اردو کونسل نے اپنے اکیسویں کتاب میلے کا اہتمام کیا تھا۔ 9 دنوں تک چلنے والے اس کتاب میلے میں جشن کا سماں تھا۔ سولاپور اور اطراف کو لوگوں نے اردو کتابوں کے اس جشن کو کامیاب بنانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ جہاں کتاب میلہ منعقد کیا گیا تھا ٹھیک اس کے پیچھے ایک ایسی مسجد بھی ہے جسے اورنگ زیب نے تعمیر کرایا تھا۔ ایسی تاریخی جگہ میں کتابوں کے جشن کا انعقاد بھی تاریخی رہا اور اہالیان سولاپور و مضافات کے اردو شیدائیوں کی شرکت نے اس میلے کو یادگار بنا دیا۔ میلے کا باضابطہ آغاز تو 23 دسمبر 2017 کو ہوا لیکن اس سے قبل تقریباً ایک ڈیڑھ مہینے سے ہی سولاپور شہر میں کتاب میلے کے تعلق سے تیاریاں چل رہی تھیں۔ مقامی تنظیم بزم غالب کو مقامی سطح پر میلے کے اہتمام اور ثقافتی پروگراموں کی ذمے داری سونپی گئی تھی اور بزم غالب کے صدر معروف ڈراما نگار بشیر پرواز، کارگذار صدر ایڈووکیٹ یو این بیریا، شفیع کیپٹن، انور کمشنر، نظام الدین، ڈاکٹر ہارون رشید باغبان، محترمہ سیمہ انگلگی، سراج سولاپوری، محمد عرفان کاریگر، اقبال باغبان و دیگر کارکنان نے جی توڑ محنت کی اور اس تاریخی میلے کو کامیاب کرایا۔ اخبارات، مقامی ٹی وی اسٹیشن، ایف ایم ریڈیو، اردو و مراٹھی اخبارات کے علاوہ چوک چوراہوں اور بازاروں میں کتاب میلے کے تعلق سے بینر لگائے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اردو کتاب میلے کا پیغام پہنچ سکے۔ سولاپور کے اسکولی اساتذہ کی تنظیموں نے اس کتاب میلے کے لیے کتاب خریدنے اور کتاب میلے کو کامیاب بنانے کی ایک مہم بھی چلائی تھی جس کی بدولت لاکھوں روپے کی کتابیں خریدی گئیں اور میلہ بے حد کامیاب رہا۔ اس کتاب میلے میں ملک کے تقریباً 60 اردو پبلشروں کے 92 اسٹال لگائے گئے تھے۔ جن پر ادب، ثقافت، تاریخ، سیاست، سائنس، لسانیات، طب و صحت جیسے موضوعات

پرسیکڑوں کتابیں دستیاب کرائی گئی تھیں۔ اردو کے علاوہ مراٹھی اخبارات میں ہر روز نمایاں طور پر اردو کتاب میلے کی خبریں شائع ہوتی رہیں جس سے پورے شہر میں میلے کے تئیں دلچسپی میں اضافہ ہوا۔

پہلا دن

23 دسمبر کا دن سولاپور کے لیے یادگار دن تھا جب پورا شہر اردو کے رنگ میں رنگا ہوا تھا اور ہر طرف اردو اور کتاب میلے کے نغمے گونج رہے تھے۔ میلے کے آغاز سے قبل صبح کے ساڑھے 9 بجے بزم غالب کے زیر اہتمام ایک اردو ریلی نکالی گئی جو شہر کے اہم حصوں تک پہنچی اور اس میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے۔ ایم اے پنگل ہائی اسکول اور قمر النساء ہائی اسکول کے اساتذہ اور طلبا و طالبات اردو کے بینر، پوسٹر اور تختیاں لے کر چل رہے تھے۔ بزم غالب کے صدر بشیر پرواز اور کارگذار صدر ایڈووکیٹ یو این بیریا نے ریلی کو ہری جھنڈی دکھا کر ریلی کو روانہ کیا۔ اس ریلی میں آصف اقبال کے تحریر کردہ گیت ترانہ کتاب میلہ کا افتتاح بھی ہوا۔ ریلی میں بچے اردو کتاب میلے کا سائن بورڈ، اشتہار اور دیگر ہورڈنگ لیے چل رہے تھے ساتھ میں ''شہر میں آیا کتاب میلہ' نغمہ بھی گونج رہا تھا۔ اردو کے اس روح پرور نظارے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اردو ابھی زندہ ہے اور آگے بھی زندہ رہے گی۔

میلے کا افتتاح سولاپور کی میئر محترمہ شوبھا تائی بن شیٹی، سابق ایم ایل اے یونس بھائی شیخ اور قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے ربن کاٹ کر کیا۔ افتتاحی تقریب میں استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان و ادب کی صورت حال ملک کے دوسرے علاقوں سے قدرے بہتر ہے۔ یہاں ہم نے اردو کی بزم سجائی ہے تاکہ آپ سب لوگ اس کتاب میلے میں اردو کی کتابیں خریدیں اور اس میلے کو کامیاب بنائیں۔ انھوں نے سولاپور کی اردو برادری کا بھی میلے میں تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام اور بزم غالب سولاپور کے اشتراک سے منعقدہ اکیسویں کل ہند اردو کتاب میلے کا افتتاح کرتے ہوئے مہمان خصوصی سولاپور کی میئر شوبھا تائی بن شیٹی نے کہا کہ 'اردو ایک خوبصورت زبان ہے، اس زبان کے فروغ کے لیے میں اپنے طور پر کوشش کرنے کے لیے ہمیشہ تیار ہوں۔ انہوں نے مزید کہا 'سولاپور کے لیے یہ ایک اچھا موقع ہے، ہمیں اس میلے سے زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدنی چاہئیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ میلہ کامیاب ہوگا۔' دوسرے مہمان خصوصی سابق ایم ایل اے یونس بھائی شیخ نے کہا کہ 'اردو زبان کسی مذہب کی نہیں بلکہ عوام کی زبان ہے۔' سولاپور میں ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب میلہ تاریخی ثابت ہوگا۔' انہوں نے عوام سے میلے میں زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدنے کی درخواست کی۔ بزم غالب کے کارگذار صدر ایڈووکیٹ یو۔ این۔ بیریا نے کہا کہ 'بزم غالب اور کونسل کے ذریعے منعقدہ یہ کتاب میلہ اردو زبان وادب کے فروغ کی ایک کوشش ہے۔' افتتاحی تقریب میں بطور مہمان ذی وقار سینئر صحافی اور مسلم دنیا کے مدیر ڈاکٹر زین شمسی نے بھی شرکت کی۔

کتاب میلہ

کتاب میلہ ، کتاب میلہ ، شہر میں آیا کتاب میلہ
کتاب میلہ ، کتاب میلہ ، وہ دیکھو آیا کتاب میلہ
حسین اردو کے گلستاں میں ہر ایک بلبل چہک رہی ہے
ہوائیں اُردو کی چل رہی ہیں ، دلوں میں اُردو مہک رہی ہے
ہر اک دِشا سے بہار بن کر ، دل و نظر کا خُمار بن کر
ہماری بستی میں پیار بن کر ، چلو حسیں اعتبار آیا
کتاب میلہ ، کتاب میلہ ، شہر میں آیا کتاب میلہ
کتاب میلہ ، کتاب میلہ ، وہ دیکھو آیا کتاب میلہ
کتاب ہی سے حیات اپنی ، کتاب ہی سے نجات اپنی
کتاب اُلفت کا نور جیسے ، کتاب عشق و خمار جیسے
کتاب دل کا سرور جیسے ، خزاں کی رُت میں بہار جیسے
کلی کلی مسکرا رہی ہے ، ہر ایک گل پر نکھار آیا
کتاب میلہ ، کتاب میلہ ، شہر میں آیا کتاب میلہ
کتاب میلہ ، کتاب میلہ ، وہ دیکھو آیا کتاب میلہ
کتاب سے ہے مکان روشن ، ہر ایک دل کا جہان روشن
زمین روشن ، زمان روشن ، زبان روشن ، بیان روشن
کتاب دل کا شباب جیسے ، کتاب بوئے گلاب جیسے
ہمیں تجسس تھا جس کا آصفؔ ، چلو وہ دل کا قرار آیا
کتاب میلہ ، کتاب میلہ ، شہر میں آیا کتاب میلہ
کتاب میلہ ، کتاب میلہ ، وہ دیکھو آیا کتاب میلہ

— آصف اقبال، سولاپور

افتتاحی تقریب کا آغاز تلاوت قرآن شریف سے ہوا۔ اس کے بعد استقبالیہ گیت پیش کیا گیا۔ سولاپور اردو کتاب میلے کے لیے خاص طور سے تیار کیا گیا ''ترانہ اردو کتاب میلہ'' کی پیشکش کو حاضرین نے بہت پسند کیا۔

کتاب میلے کے افتتاحی دن محمد شفیع کیپٹن، ناصر الدین النکر، پرنسپل ہارون رشید باغبان، نظام الدین شیخ، پرنسپل عبدالجبار شیخ، انور کمشنر، آصف اقبال، ڈاکٹر محمد غوث، یوسف میجر، عرفان کاریگر کے علاوہ شہر کی معزز شخصیات، اسکولوں، کالجوں کے اساتذہ اور مختلف شعبۂ حیات سے وابستہ ادب نواز ہستیوں نے شرکت کی۔ طالب علموں کی ایک بڑی تعداد بھی میلے میں موجود رہی۔

شام 7 بجے مشہور و معروف حیدرآبادی مزاحیہ ڈراما 'ڈیڑھ متوالے' پیش کیا گیا۔ اس کے سیکڑوں شو ملک کے مختلف شہروں میں ہو چکے ہیں۔ اس ڈرامے کے ہدایت کار حامد کمال ہیں۔ حامد کمال، غلام سبحانی اور ان کی ٹیم لافٹر چیلنج جیسے معروف شو کا بھی حصہ بن چکی ہے۔ اس مزاحیہ شو میں شائقین کی بڑی تعداد موجود تھی اور حیدرآبادی کامیڈی سے خوب لطف اندوز ہوئے۔

دوسرا دن

میلے کا دوسرا دن کتابوں سے محبت کرنے والوں کی بھیڑ ساتھ لایا۔ اردو کتاب میلہ اردو برادری کو اپنی تہذیب وثقافت سے جوڑنے کی ایک کوشش ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ کتابوں سے دوستی کریں اور اپنی شاندار تہذیبی وراثت کی حفاظت کی ذمے داری لیں۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ریسرچ آفیسر اور اکیسویں کتاب میلے کے انچارج شاہنواز محمد خرم نے میلے کے دوسرے دن کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم سب آج موبائل، انٹرنیٹ کے اسیر ہو گئے ہیں جبکہ ہمیں ان سے جانکاری مل سکتی ہے، علم کتابوں سے ہی ملے گا۔ بزم غالب کے صدر جناب بشیر پرواز نے بھی کہا کہ کتاب میلے کی وجہ سے شہر میں اردو کا ماحول بنا ہے اور اردو کے تئیں لوگوں کی دلچسپی بڑھی ہے۔

میلے کے دوسرے دن اسکولوں کے طلبا و طالبات کے درمیان بیت بازی اور اردو کوئز کے مقابلوں کا بھی انعقاد ہوا جس میں ایم اے پانگل اردو ہائی اسکول، ایس ایم سی اردو ہائی اسکول اور ایس ایس اے اردو ہائی اسکول کے طلبا کو بالترتیب اول، دوم و سوم انعامات سے نوازا گیا۔ مقابلہ بیت بازی کے صدر ڈاکٹر عبدالرشید ارشد نے کہا کہ بیت بازی سے طالب علموں میں شعری ذوق پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اردو کوئز میں پروگریسیو اردو ہائی اسکول اور ایم اے پانگل اردو اسکول اور بی کیو کے گرلز اردو ہائی اسکول کے طلبا نے انعامات حاصل کیے۔

اس کے علاوہ شاداب مومن صاحبہ کی کتاب 'نیرنگی خیالات'، ابوالکلام مقبول احمد کی کتاب 'انمول اقوال' 'گلدستہ معلومات' اور طاہرہ عبدالشکور صاحبہ کی کتاب 'بنت حوا کی ہنرمندی' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ کتابوں کی تقریب اجرا کی صدارت ایڈووکیٹ یو این بیریا نے کی جب کہ کتابوں کا اجرا عبدالرشید ارشد، سید بشیر احمد بشیر، محمد شفیع کیپٹن اور عبدالشکور شعور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ آصف اقبال نے چاروں کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مہمانان کا استقبال کیا۔ پروگرام کی نظامت نجم الدین انجم نے کی۔ میلے کے دوسرے دن ڈاکٹر جی ایم پٹیل کی ہدایت کاری میں حیدرآبادی زبان کی چاشنی سے بھرا ہوا سلیمان خطیب کی تحریروں پر مشتمل ڈراما میرے چھورے کو چھوری ہونا پیش کیا گیا۔ یہ ڈراما بہت مقبول رہا ہے اور اس میں سلیمان خطیب کی نظموں کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے کے سبھی کرداروں کی اداکاری اور مکالموں کی ادائیگی نے اہل سولاپور کو ہنسنے ہنسانے کا خوب موقع فراہم کرایا۔ جناب تنویر بیجاپور نے بڑے اچھے انداز میں ڈرامے کے ہدایت کار اور کرداروں کا تعارف پیش کیا۔

تیسرا دن

میلے کے تیسرے دن ممبر آف پارلیامنٹ (راجیہ سبھا) اور مہاراشٹر کے سابق وزیر حسین دلوائی نے بھی کتاب میلے کا جائزہ لیا اور یہاں مختلف اسٹالوں پر کافی وقت گذارا۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی اس پہل کو

اردو کتاب میلہ

اہلِ یقیں کا جلوہ اُردو کتاب میلہ　　انسانیت کا شیوہ اُردو کتاب میلہ
امن و اماں کا جذبہ اُردو کتاب میلہ
توحید کا نظارہ اُردو کتاب میلہ
ربِّ العلیٰ تصور اقبالؔ کا تفکر　　احساس میرؔ و غالبؔ سیدؔ کا وہ تدبّر
تہذیب کا اُجالا اُردو کتاب میلہ
اہلِ یقیں کا جلوہ اُردو کتاب میلہ

ق

آزادؔ کی حسرتؔ کی تگ و دو کا نظارہ
سردارؔ کے مخدومؔ کے جذبوں کا اشارہ
افکار جوشؔ و ساحرؔ و مجروحؔ و مجازؔ
یہ سرزمین ہند کی امید کا تارا
سینوں میں ذوقِ عرفاں ارمانِ دید بجاں　　یہ کائنات ساری تحریر دستِ رحماں
چہروں سے آشکارہ اُردو کتاب میلہ
اہلِ یقیں کا جلوہ اُردو کتاب میلہ

ق

اک روز ہمیں شانِ ادب بن کے رہیں گے
کردار سے پہچانِ ادب بن کے رہیں گے
پائیں گے حقیقت کا نشاں ذوقِ نظر سے
افکار سے پیمانِ ادب بن کے رہیں گے
ہم کو عزیز تر ہے واللہ خاکساری　　ہم جانتے ہے واللہ انساں کی بیقراری
ہر روح کی تمنا اُردو کتاب میلہ
اہلِ یقیں کا جلوہ اُردو کتاب میلہ

ق

صحرا سے جو اُٹھی تھی صدا ہم نے پائی ہے
مقبولِ عرش ہے جو دُعا ہم نے پائی ہے
اُردو زباں کا رُتبۂ اعلیٰ نہ پوچھئے
الہام کی حقیقی ندا ہم نے پائی ہے
ظلمت میں ماہ پارہ شہرِ ادب ہمارا　　محنت کشوں کا حاصل منظر یہ پیارا پیارا
روحِ قدیر و یکتا اُردو کتاب میلہ
اہلِ یقیں کا جلوہ اُردو کتاب میلہ

ق

اُردو زباں کے لطف کا احساس لئے ہم
تہذیب و تمدن کا قوی پاس لئے ہم
ہر حرف ہر ایک لفظ ہے اسرار کی صورت
معراجِ عشق و مستی کی اک آس لئے ہم
قسمت میں آئی اپنے نورِ یقیں کی وادی　　تحریر میں ہماری عرشِ بریں کی وادی
اُمید کا نظارہ اُردو کتاب میلہ
اہلِ یقیں کا جلوہ اُردو کتاب میلہ

ق

انوارِ ازل سے ہے عیاں اپنی حقیقت
حجت تمام ہم پہ ہے ہم آخری صورت
معیار، زندگی کا اگر ہے تو ہمیں سے
ہم جو نہیں، تو جانیے آغازِ قیامت
اہلِ یقیں کا جلوہ اُردو کتاب میلہ　　انسانیت کا شیوہ اُردو کتاب میلہ
امن و امان کا جذبہ اُردو کتاب میلہ
توحید کا نظارہ اُردو کتاب

—— میر افضل میر، شولاپور

قابل ستائش قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب کے فروغ لیے کونسل بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ کونسل کے اسٹال پر میلے کے انچارج اور کونسل کے ریسرچ آفیسر شاہنواز محمد خرم نے ان کا استقبال کیا اور انہیں کونسل کے رسالے اور اردو لرننگ کورس کا ایک سیٹ پیش کیا۔ کتاب میلے کے تیسرے دن شائقین کتب کی اچھی خاصی تعداد میلے میں کتابیں خریدتی نظر آئی۔ بچوں کے ادب کا وافر ذخیرہ موجود ہونے کی وجہ سے اسکولی بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ آ کر کتابیں خرید رہے تھے۔ میلے میں خواتین سے متعلق موضوعات مثلاً مہندی، سلائی کڑھائی، کھانا پکانا، طب وصحت جیسے عنوانات پر بھی کافی کتابیں موجود تھیں۔ برقع پوش خواتین کی بھی بڑی تعداد میلے میں نظر آ رہی تھی۔

شام میں بچوں کے تمثیلی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں مقامی اسکولوں کے بچوں نے ماجد دیوبندی، شبینہ ادیب، عمران پرتاپ گڑھی، نکہت امروہی، کمار وشواس، عبید اعظم اعظمی، لتا حیا، قاضی مطیع اللہ، جیسے مقبول شعرا و شاعرات کے روپ میں ان کے مشہور کلام پڑھے اور حاضرین سے ڈھیروں داد و تحسین وصول کیے۔ تمثیلی

مشاعرے کی نظامت عاقب مدیل نامی بچے نے بڑے خوبصورت انداز میں کی۔ طالب سولا پوری اور تنویر بیجاپوری کی محنت مشاعرے میں نظر آئی۔

چوتھا دن

3 دنوں کی تعطیل کے بعد اسکول کھلے تو بڑی تعداد میں مختلف اسکولوں کے اساتذہ اپنے طالب علموں کو لے کر آئے اور کتابیں خریدیں۔ لوگوں کی گہما گہمی دیکھ کر پبلشروں اور کتب فروشوں کے چہرے کھل اٹھے، کتابوں کے سبھی اسٹالوں پر لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ کتاب میلے میں نہ صرف سولا پور اور اطراف کے لوگ شرکت کر رہے ہیں بلکہ بھیونڈی، اورنگ آباد، مالیگاؤں، ممبئی، بیدر، گلبرگہ اور چٹنی سے بھی لوگ کتابیں خریدنے آرہے ہیں۔ میلے میں غیر اردو داں حضرات بھی دیکھے گئے جو اردو رسم الخط سے واقف نہیں تھے لیکن اردو شعر و سخن کی شیرینی سے متاثر ہوکر اردو شاعری کی کتابیں ہندی یا مراٹھی میں تلاش کر رہے تھے۔ سولا پور کے اسکولوں کے اساتذہ کی مختلف تنظیموں نے بھی کتابوں کی فروخت میں اضافے کی کوشش کی ہے اور اپنے طلبا سے کتابیں خریدنے کی اپیل کی ہے۔

میلے میں ایم اے پانگل ہائی اسکول، ایس ایس اے ہائی اسکول، کریسینٹ اسکول، قمر النسا کاریگر ہائی اسکول کے طلبا نے مختلف ثقافتی پروگراموں سے سماں باندھ دیا۔ ایم اے پانگل ہائی اسکول کے وسیع و عریض لان میں آج بچوں نے حمد، نعت، گیت، قوالی، ڈراما اور صوفیانہ کلام پیش کیا۔ پانگل ہائی اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر ہارون رشید باغبان نے بتایا کہ ان پروگراموں کے لیے اساتذہ و طلبا گذشتہ کئی دنوں سے رات دن محنت کر رہے تھے۔ معروف شاعر طالب سولا پوری اور عبدالرشید شیخ نے ثقافتی پروگراموں کی تیاری میں اہم رول ادا کیا اور ان کی محنت سے یہ پروگرام بہت کامیاب رہے۔ حاضرین نے سبھی بچوں کی خوب خوب حوصلہ افزائی کی۔ پروگرام کے آغاز سے قبل بزم غالب کے صدر جناب بشیر پرواز نے کہا کہ میلہ بہت کامیابی سے چل رہا ہے لیکن یہ میلہ صرف پروگراموں سے کامیاب نہیں ہوسکتا ہے بلکہ اس کے لیے آپ سب کو کتابیں بھی خریدنی ہوں گی۔ آپ سب یہاں پروگرام سے بھی لطف اندوز ہوں اور زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں جس سے اردو زبان و ادب کا فروغ ہو۔ بطور مہمان خصوصی، رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کے پرنسپل ضیاء الرحمان انصاری نے شرکت کی۔ واضح ہو کہ قومی اردو کونسل کے ذریعے بھیونڈی میں رئیس ہائی اسکول کے میدان میں ہی بیسواں کتاب میلہ منعقد کیا گیا

کتاب میلے پر کچھ اہم شخصیات کے تاثرات

بشیر پرواز، ڈراما نگار اور صدر بزم غالب سولا پور: یہ کتاب میلہ سولا پور میں اردو زبان و ادب کے فروغ کی ایک کوشش ہے اور یقیناً اس سے اردو زبان کو مضبوطی ملے گی۔ قومی اردو کونسل کے ہم شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمارے شہر کو اس کتاب میلے کے لیے منتخب کیا۔

یو این بیریا کار گذار صدر بزم غالب سولا پور: اس کل ہند کتاب میلے کے انعقاد سے یہاں کے اسکولوں کے بچوں کو نایاب کتابیں ملی ہیں۔ ملک کے مختلف پبلشروں کا ایک ساتھ ہمارے شہر میں جمع ہونا ہمارے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور یہاں کے طلبا، طالبات اور عام اردو قارئین اس کتاب میلے سے کافی فیضیاب ہوئے ہیں۔

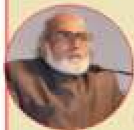

پروفیسر حمید سہروردی سابق صدر شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی: قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اور بزم غالب کے اشتراک سے منعقدہ کل ہند اردو کتاب میلے سے سولا پور اور اطراف کے علاقوں میں اردو کے تئیں دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ قومی اردو کونسل نے اس کتاب میلے کو یہاں سجا کر ہمیں کتابیں خریدنے کا اچھا موقع فراہم کیا ہے۔ اب ہمیں چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں اور کتاب میلے کو کامیاب بنائیں۔

عبدالرشید ارشد، معروف شاعر: اس کتاب میلے کے انعقاد سے ہم سبھی کو خوشی ہو رہی ہے اور شہر میں اردو زبان و ادب کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔ کتاب میلے میں منعقدہ مختلف ثقافتی پروگراموں نے بھی اردو کے شیدائیوں کو پورے میلے میں جوڑے رکھا اور سبھی لوگ میلے کے بعد بھی اسے مہینوں یاد رکھیں گے۔

حامد اکمل، معروف شاعر اور مدیر روزنامہ ایقان ایکسپریس: کتاب میلہ سولا پور میں اردو زبان و ادب کا جشن ہے۔ اس کتاب میلے کے انعقاد سے اردو والوں کو بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ڈاکٹر ہارون رشید باغبان پرنسپل ایم اے پانگل اینگلو اردو ہائی اسکول سولا پور: ہمارے اسکول میں کتاب میلے کے انعقاد سے ایک جشن کا ماحول ہے اور ہمارے بچوں نے اس کتاب میلے سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم قومی کونسل کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے اسکول میں اس میلے کا اہتمام کیا۔

خیال انصاری، معروف شاعر، ادیب اور مدیر ہفت روزہ خیر اندیش: اردو کتاب میلہ اپنی تہذیبی وراثت کو باقی رکھنے کا ایک وسیلہ ہے۔ ہم یہاں نہ صرف کتابیں خریدتے ہیں بلکہ مختلف رنگا رنگ اردو پروگراموں سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ مجھے اس میلے میں آکر بڑا سکون محسوس ہو رہا ہے۔

ایاز پٹیل، وائس آف مہاراشٹر اور بالی ووڈ گلوکار: اردو کتاب میلے میں آنا ایک خوشگوار تجربہ رہا۔ فلموں میں، نغموں میں تو اردو ہی استعمال ہوتی ہے۔ اس کتاب میلے سے سولا پور میں اردو زبان و ادب کا ایک ماحول تیار ہوگا۔

آصف اقبال، ہیڈ ماسٹر ایس ایس اے پرائمری اسکول اور شاعر: اردو کتاب میلہ سولا پور کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ ہم اہل سولا پور قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے شہر کے اسکولی بچوں نے اس کتاب میلے سے لاکھوں روپیوں کی کتابیں خریدی ہیں۔

مرزا عبدالقیوم ندوی (اورنگ آباد): قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اور بزم غالب کے اشتراک سے منعقدہ اس کتاب میلے نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ مہاراشٹر کے اردو کتاب میلے سب سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

تھا۔ میلے میں معروف شاعر، ادیب اور ہفت روزہ خیر اندیش کے مدیر جناب خیال انصاری اور سید قاسم امام نے بھی شرکت کی۔

شام میں تین یک بابی ڈراموں کو اسٹیج کیا گیا۔ ایکسپیریمنٹ، جلوس اور کام دھینو کو شائقین نے کافی پسند کیا۔ ڈرامے کے ختم ہونے تک طلبا اور اردو نوازوں کی بڑی تعداد موجود رہی۔

پانچواں دن

کتاب میلے کا پانچواں دن مرزا اسداللہ خاں غالب کے نام رہا۔ غالب شناسی کوئز، غالب سمینار اور دیر شام غالب کی غزلوں پر مشتمل شام غزل کا انعقاد کیا گیا۔ غالب سمینار میں گلبرگہ سے پروفیسر حمید سہروردی اور پربھنی سے جناب سلیم محی الدین نے شرکت کی اور غالب کی عظمت پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر حمید سہروردی نے کہا کہ غالب کی شخصیت کئی پرتوں میں مخفی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ہمارے سامنے کئی روپ میں آتا ہے۔ اس کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ غالب نے اپنی شاعری میں انسان دوستی کی بات کی ہے۔ جناب سلیم محی الدین نے کہا کہ غالب ہر دور کا شاعر رہا ہے۔ آج بھی اس کی شاعری اتنی ہی مقبول ہے جتنی ان کے وقت میں تھی۔ کتاب میلے کے حوالے سے پروفیسر حمید سہروردی نے کہا کہ قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اور بزم غالب کے اشتراک سے منعقدہ کل ہند اردو کتاب میلے سے سولاپور اور اطراف کے علاقوں میں اردو کے تئیں دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ قومی اردو کونسل نے اس کتاب میلے کو یہاں سجا کر ہمیں کتابیں خریدنے کا اچھا موقع فراہم کیا ہے۔ اب ہمیں چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں اور کتاب میلے کو کامیاب بنائیں۔ معروف شاعر اور روزنامہ ایقان ایکسپریس گلبرگہ کے مدیر حامد اکمل نے کہا کہ کتاب میلہ سولاپور میں اردو زبان کی بنیادوں کو مضبوطی فراہم کرے گا۔ اس کتاب میلے کے انعقاد سے اہل سولاپور کو بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ سمینار کے دوران محمد شمس الدین ظفر گلبرگوی کے مجموعہ کلام بوستان سخن کا اجرا بھی کیا گیا۔ سمینار کے بعد مشہور طبلہ نواز استاد آنند بادامیکر کے ہمراہ مقبول گلوکار اکمل بیلے نے غالب کی غزلوں کو اپنی خوبصورت آواز میں پیش کرکے سامعین کو مسحور کردیا۔ اکمل بیلے کا تعارف آصف اقبال نے پیش کیا اور شام غزل کی نظامت بھی انجام دی۔ کل کتاب میلے میں سولاپور کے سابق ایم ایل سی یونس بھائی شیخ، توفیق ہتورے، نصیر خلیفہ، اعجاز نبی کاریگر، ہیم کرن پچکی، میر افضل اور شہر کی کئی معزز ہستیوں نے شرکت کی۔

غالب کے یوم پیدائش کی مناسبت سے غالب شناسی کے موضوع پر بین المدارس کوئز اور سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ غالب کوئز میں اول دوم اور سوم انعامات بالترتیب پروگریسیو اردو ہائی اسکول، محمد یونس موڈل اردو ہائی اسکول اور سٹیزن اردو ہائی اسکول کو دیے گئے۔ اس پروگرام کے صدر ڈاکٹر عبدالرشید شیخ اور کنوینر محمد جاوید تاڑے تھے جب کہ پروگرام کی تیاری میں عبدالرشید ارشد نے نمایاں رول نبھایا۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر محمد فیروز عالم نے کہا کہ اس طرح کے مقابلوں سے طلبا میں اردو شعروسخن کے تئیں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ایسے پروگراموں کا انعقاد ہونا چاہیے۔ کتاب میلے میں مقامی ایم ایل سی دتا ساونت، گروناتھ واگی کر، منظور عالم، عبدالماجد کلادگی، ڈاکٹر فیض احمد فیض، پروفیسر طیب علی چنئی، خرم عماد گلبرگہ، سلیم محی الدین پربھنی اور عثمان آباد سے صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ تبسم سلطانہ نے 50 اساتذہ کے ساتھ میلے میں شرکت کی اور اپنی پسند کی کتابیں خریدیں۔

چھٹا دن

قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ نے کتاب میلے کے حوالے سے کہا کہ سولاپور اردو سے محبت کرنے والوں کا شہر ہے۔ یہاں ہم نے کل ہند اردو کتاب میلے کا انعقاد اسی لیے کیا ہے کہ یہاں اردو زبان و ادب کو مزید فروغ حاصل ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہاں آکر بہت خوشی ہورہی ہے۔ آج طالبات کے ثقافتی پروگرام سے وہ کافی دیر تک لطف اندوز ہوئے اور طالبات کی پیش کش کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ یہاں

لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے جو یقیناً ایک خوش آئند بات ہے۔ یہ میدانی علاقوں میں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح کے پروگرام پیش کیے گئے ان سے قومی یک جہتی اور بھائی چارہ بڑھے گا۔

کتاب میلے میں صبح میلے کے معینہ وقت سے قبل ہی لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ خواتین اور طالبات کی تعداد زیادہ دیکھی گئی۔ مختلف اسکولوں، کالجوں کے اساتذہ بھی اپنے طلبا کے ساتھ کتاب میلے میں تشریف لائے تھے۔ کتاب میلے میں بچوں کی دلچسپی سے متعلق کتابیں زیادہ توجہ کا مرکز تھیں۔ جب کہ امور خانہ داری اور دینیات سے متعلق کتابوں کو خواتین نے کافی پسند کیا۔ میلے میں طالبات کا ثقافتی پروگرام پیش کیا گیا جس میں سولا پور کے مقامی اسکولوں کی طالبات نے حصہ لیا۔ طالبات نے حمد، نعت، غزل، اردو ڈراما، قومی گیت اور دیگر پروگرام پیش کیے۔ ان پروگراموں سے طالبات کی محنت کا اندازہ ہورہا تھا۔ اس پروگرام میں بطور مہمان خصوصی قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ اور اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم نے شرکت کی۔

شام میں کل ہند خواتین مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کے کنوینر سولا پور کے مشہور شاعر سراج سولا پوری تھے۔ جب کہ مشاعرہ کمیٹی میں محترمہ سبینہ انگلکی، کنیز فاطمہ کانچ والا، آمنہ جنواڑکر، مہہ جبیں ملا اور ممتاز شیخ شامل تھیں۔ مشاعرے کی صدارت دہلی سے تشریف لائیں ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے کی جبکہ نظامت ممبئی سے آئیں محترمہ سہانہ ناز نے انجام دی۔ مشاعرے میں نکہت مراد آبادی، حنا انجم (الہ آباد) معصومہ تبسم (مالیگاؤں) نکہت امروہی، ڈاکٹر نزہت انجم (لکھنو) وغیرہ نے شرکت کی۔ مشاعرے میں بطور مہمان خصوصی مقامی ایم ایل اے محترمہ پرنیتی شندے نے شرکت کی اور خواتین شاعرات کو ان کے کلام پر خوب داد دی۔ انھوں نے اس کتاب میلے کے اہتمام کے لیے قومی اردو کونسل اور بزم غالب کی ستائش بھی کی۔ مشاعرے سے قبل طالبات نے ایک قوالی پیش کی جسے سامعین نے کافی پسند کیا۔

ساتواں دن

کل ہند اردو کتاب میلے کے ساتویں دن کتابوں کی فروخت اچھی خاصی ہوئی اور مختلف شہروں سے اہم شخصیات کی شرکت بھی ہوئی ہے۔ یہاں کی اساتذہ تنظیموں نے قابل تعریف کردار ادا کیا جن کی کوششوں سے طلبا اور دیگر لوگوں نے کتابوں کی فروخت میں دلچسپی دکھائی۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر اور میلہ انچارج جناب شاہنواز خرم نے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمارا مقصد کتابوں کی فروخت کا کوئی ریکارڈ قائم کرنا نہیں ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ لوگ اردو کتابوں کے قریب آئیں۔ کونسل نے لوگوں کے دروازے تک کتابیں پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کونسل ہندوستان میں اردو زبان وادب کے فروغ کی نوڈل ایجنسی ہے۔ ہمارا مقصد ہے کہ اردو زبان ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر شخص تک پہنچے۔ کتاب میلے کا انعقاد بھی اسی کوشش کی ایک کڑی ہے۔ قومی اردو کونسل نے یہ میلہ سولا پور کی مقامی تنظیم بزم غالب کے اشتراک سے منعقد کیا ہے۔ بزم غالب کے صدر اور مقبول شاعر و ڈراما نگار جناب بشیر پرواز نے کہا کہ سولا پور اور اطراف کے علاقوں میں اردو کے چاہنے والے بڑی تعداد میں رہتے ہیں اور اس کتاب میلے سے یقینی طور پر سولا پور میں اردو کا ایک نیا جہاں آباد ہوا ہے۔ پورا شہر اردو کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ میلے میں بیجاپور، بیدر اور اعظم کیمپس پونے کے اساتذہ وطلبا کا وفد تشریف لایا اور بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں۔

میلے کے ساتویں دن شام میں مہاراشٹر کے معروف گلوکار محمد ایاز اور ان کی ٹیم نے پروگرام "فلموں میں اردو شاعری" کے تحت فلموں میں گائے گئے مختلف شعرا کے نغمے سنائے۔ ساحر، علی سردار جعفری، میر، ندا فاضلی، شہریار، حسرت جے پوری وغیرہ کے لکھے نغموں کو محمد ایاز

نے خوبصورتی سے پیش کیا۔ اہل سولا پور نے محمد ایاز کی خوب تعریف کی۔

آٹھواں دن

میلہ جیسے جیسے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا کتابوں کی خریداری اور لوگوں کی شرکت اسے ایک عظیم کامیابی کی جانب لے جارہی تھی۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر محمد فیروز عالم نے کہا کہ سولا پور کتاب میلے کے آخری دنوں میں کتابوں کی فروخت میں اضافہ ہوا ہے۔ اہل سولا پور کی اردو زبان وادب سے محبت قابل رشک ہے۔ کتاب میلے کے دوران پیش کیے گئے ثقافتی اور تعلیمی پروگرام بھی بہت اچھے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سولا پور میں صلاحیتوں کی کوئی کمی نہیں ہے بس انھیں ذرا مہمیز کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کے طلبا نے جس طرح کے پروگرام پیش کیے وہ یقینا قابل تعریف ہیں۔ اسٹیج پر آکر تقریر کرنا یا کوئی کلچرل پروگرام پیش کرنا یہاں کے بچوں کی خود اعتمادی کو دکھاتا ہے۔ قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر اور کتاب میلے کے انچارج شاہنواز محمد خرم نے پبلشروں کے مطالبے پر میلے کے آخری دو دنوں تک میلے کا وقت رات 10 بجے تک کرنے کا اعلان کیا تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ کتابیں خرید سکیں۔

کتاب میلے کے آٹھویں دن ممبئی، بھیونڈی، مالیگاؤں، اورنگ آباد، بیجاپور، پونے، بیدر، لاتور، ہبلی، گلبرگہ وغیرہ سے اردو کے قدردان حضرات وخواتین نے شرکت کی اور کافی تعداد میں کتابیں خریدیں۔ بیجاپور اور گلبرگہ سے آئے وفد نے قومی اردو کونسل کے اس کتاب میلے کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے میلوں کا انعقاد ہمارے شہر میں بھی ہونا چاہیے۔ اساتذہ کی مختلف تنظیموں نے کتاب میلے میں کتاب خریدنے کی ایک مہم چلائی تھی جس کے تحت انھوں نے درخواست کی تھی کہ اگر اساتذہ زیادہ کتابیں خریدیں گے تو انھیں اساتذہ تنظیم اتنی ہی رقم کی کتابیں بھی خرید کر پیش کرے گی۔ کتاب خرید و مہم کے تحت مختلف اسکولوں کے ذمے داران کے درمیان کتابوں کی تقسیم کی گئی۔ میلے میں جونیئر وسینئر کالج کے طلبا کے درمیان تقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا جس میں سنگھاد کالج سولا پور کے طالب علم ثاقب خان کو اول انعام جبکہ ایس ایس اے آرٹس وکامرس کالج سولا پور کی طالبات سمرین سورمے والا اور صفوانہ جمعدار کو دوم وسوم انعامات کا حقدار قرار دیا گیا۔ اس پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر عبدالرشید شیخ اور عرفان پٹیل تھے جب کہ صدر کمیٹی ڈاکٹر غوث شیخ تھے، پروگرام کے صدر نظام الدین شیخ اور جج عبدالرشید ارشد تھے۔

شام میں مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت عبدالرشید ارشد نے کی جبکہ نظامت کے فرائض فیروز رشید نے انجام دیے۔ مشاعرے میں احمد علوی میرٹھی، جہاز دیوبندی، کلیم شرر بدایونی، شیخ نظامی، بچپا پالپوری، درپن سورتی، اثر جعفری، وحید پاشا قادری، طالب سولا پوری، سراج سولا پوری نے اپنے مزاحیہ کلام سے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ مشاعرے میں اہالیان سولا پور کی بڑی تعداد دیر رات تک موجود رہی۔ مشاعرے میں رسم شکریہ جناب انور کمشنر نے ادا کی اور سبھی شعرا وحاضرین کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ سولا پور کے لوگ شعروسخن کو پسند کرتے ہیں۔

نواں دن

سولا پور میں اردو کتاب میلے کے انعقاد سے اردو زبان وادب کو نئی مضبوطی ملی ہے۔ یہاں کی بچیاں بہت باصلاحیت ہیں اور یہاں اردو کے تئیں کافی بیداری ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ نے کتاب میلے کی اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی مختلف اسکیموں کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ کونسل اردو زبان وادب سے متعلق سیمنار، کانفرنس اور کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون فراہم کرتی ہے، ساتھ ہی کتاب میلے کا انعقاد بھی کرتی ہے تاکہ اردو کی کتابیں لوگوں تک آسانی سے پہنچ سکیں۔ انھوں نے میلے کے کامیاب انعقاد کے لیے بزم غالب کا بھی شکریہ ادا کیا۔ میلے میں پیش کیے گئے

مختلف ثقافتی پروگراموں کی بھی تعریف کی اور کہا کہ سولا پور میں لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے جو ملک کے دوسرے علاقوں میں نہیں ہے۔ یہاں کے اساتذہ اور والدین قابل مبارکباد ہیں جو اپنی بچیوں کی تعلیم وتربیت کی فکر کر رہے ہیں۔ انھوں نے سولا پور کی انتظامیہ کا بھی شکریہ ادا کیا۔ بزم غالب کے صدر اور مقبول شاعر وڈراما نگار جناب بشیر پرواز نے کہا کہ اس میلے نے سولا پور کی عزت ووقار میں اضافہ کیا ہے۔ ہمارا مقصد تھا کہ اردو زبان وادب کو فروغ ملے اور اس میلے کے انعقاد سے یقیناً یہاں اردو زبان وادب کو نئی جہت حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے میلے کو کامیاب بنانے کے لیے کونسل کے ذمے داران، بزم غالب کے کارکنان اور مقامی اسکولوں، کالجوں کے اساتذہ وطلبا کا بھی شکریہ ادا کیا۔ بزم غالب کے کارگذار صدر جناب یو این بیریا نے بھی اس موقع پر سبھی اراکین اور قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اردو کتاب میلے نے سولا پور کو ملکی سطح پر اردو کے حوالے سے ایک نئی شناخت عطا کی ہے۔

سابق وزیر داخلہ جناب سشیل کمار شندے نے سولا پور میں منعقدہ اکیسویں کل ہند اردو کتاب میلے کی اختتامی تقریب میں صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے شہر میں اردو کے تئیں دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ اردو بہت میٹھی زبان ہے اور اس کو سبھی لوگ پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل اور بزم غالب کی اردو زبان وادب کے لیے کی گئی یہ کوشش دیرپا ثابت ہوگی اور اردو کی جانب لوگ راغب ہوں گے۔ تقریب میں بطور مہمان خصوصی سولا پور کے کمشنر جناب مہادیو تامہزے نے شرکت کی۔

قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر اور کتاب میلے کے انچارج جناب شاہنواز محمد خرم نے کلمات تشکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ اہل سولا پور خصوصاً اسکولوں کے طلبا و اساتذہ کی کتابوں سے محبت ہمیں یاد رہے گی۔ آپ سب نے جس طرح سے یہاں آکر زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں وہ آپ کی اردو نوازی کو ظاہر کرتا ہے۔ 9 دنوں کے اس کتاب میلے کو آپ سب نے جشن کی صورت دے دی اور جوق در جوق آئے اور میلے کو کامیاب بنایا۔ انھوں نے پرنٹ میڈیا والیکٹرانک میڈیا کا خصوصی شکریہ ادا کیا جن کی وجہ سے یہ کتاب میلہ اتنا کامیاب رہا۔ بزم غالب کی جانب سے جناب شفیع کیپٹن نے شکریہ ادا کیا اور اس میلے کو کامیاب قرار دیا۔

اختتامی تقریب میں مورخ جناب جے سنگھ پوار کولہاپوری کی کتاب ''راجرشی شاہو چھترپتی: سماجی انقلاب کا بادشاہ'' کی رسم اجرا بھی انجام دی گئی۔ اس اجرا میں مصنف کی اہلیہ محترمہ وسودا جے سنگھ پوار موجود تھیں۔ کتاب کے مترجم سید افتخار احمد ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی اس کل ہند میلے میں رونمائی کو ایک تاریخی لمحہ قرار دیا۔ اس پروگرام کی نظامت ایم اے پانگل اینگلو اردو ہائی اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر ہارون رشید باغبان اور محمد ریاض نے کی۔ اختتامی تقریب کے آخر میں قومی گیت پیش کیا گیا۔ بزم غالب کے مطابق اس کتاب میلے میں تقریباً 62 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

کتاب میلے کی کامیابی میں بزم غالب کے منتظمین، ایم اے پانگل اسکول وقمر النساء کارگیر ہائی اسکول کے اساتذہ، طلبا وطالبات اور قومی اردو کونسل کے اسٹاف کا اہم رول رہا۔ کتاب میلے کی خبریں انقلاب (ممبئی)، اردو ٹائمز (ممبئی)، اردو نیوز (ممبئی)، صحافت (ممبئی)، منصف (حیدرآباد)، کے بی این ٹائمز (گلبرگہ)، شمس ٹائمز، رہنمائے دکن (حیدرآباد)، تاثیر (پٹنہ)، اورنگ آباد ٹائمز (اورنگ آباد)، نظام آباد مارننگ ایکسپریس، ملت ٹائمز، آمنا سامنا میڈیا، فکر وخبر (نیوز پورٹل)، کامل یقین، کاوش جمیل، سحر، ورق تازہ، ناندیڑ ٹائمز (ناندیڑ)، وغیرہ میں تواتر کے ساتھ شائع ہوئیں جس سے مہاراشٹر اور قریبی ریاستوں کی اردو برادری تک کتاب میلے کی جانکاری پہنچی۔ ہفت روزہ اردو میلہ نے اپنا پورا شمارہ کتاب میلے کے نام کیا اور اپنے چار صفحات پر کتاب میلے کی خبریں شائع کیں۔ ان کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات نے کتاب میلے کی خبروں کو شائع کیا، ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ سولا پور کے تقریباً آدھے درجن مراٹھی اخبارات نے ہر روز ہماری خبریں نمایاں طور پر شائع کیں۔ محمد اقبال باغبان ان خبروں کو اردو سے مراٹھی میں ترجمہ کرکے بھیجتے تھے۔ ہم اقبال باغبان اوران تمام مراٹھی اخبارات کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

■

Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

اردو کتابوں کی فروخت کا ریکارڈ

قومی اردو کونسل کے کتاب میلوں کا حساب کتاب

	ماہ	سال	مقام	مجموعی فروخت
1	نومبر	2000	لال قلعہ، دہلی	10 لاکھ روپے
2	نومبر	2001	لال قلعہ، دہلی	12 لاکھ روپے
3	جنوری	2003	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	16 لاکھ روپے
4	ستمبر	2003	سری نگر، جموں کشمیر	22 لاکھ روپے
5	جنوری	2004	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	23 لاکھ روپے
6	دسمبر	2004	حیدرآباد، آندھرا پردیش	24 لاکھ روپے
7	دسمبر	2005	لکھنؤ، اترپردیش	23 لاکھ روپے
8	دسمبر	2006	کولکاتہ، مغربی بنگال	16 لاکھ روپے
9	نومبر	2007	پٹنہ، بہار	14 لاکھ روپے
10	جنوری	2009	ممبئی، مہاراشٹر	26 لاکھ روپے
11	فروری-مارچ	2010	حیدرآباد، آندھرا پردیش	52 لاکھ روپے
12	مارچ	2011	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	15 لاکھ روپے
13	جنوری	2012	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	52.4 لاکھ روپے
14	نومبر	2012	لکھنؤ ، اترپردیش	25 لاکھ روپے
15	ستمبر	2013	شیواجی، چھوٹا میدان، بنگلور، کرناٹک	31 لاکھ روپے
16	دسمبر-جنوری	2013-14	مالیگاؤں	87 لاکھ روپے
17	دسمبر-جنوری	2014-15	عام خاص میدان، اورنگ آباد	1,29,40,722 روپے
18	نومبر	2015	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	ایک کروڑ سے زائد
19	دسمبر	2015	قلی قطب شاہ اسٹیڈیم، حیدرآباد	
20	دسمبر	2016	رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی، مہاراشٹر	ایک کروڑ 12 لاکھ روپے
21	دسمبر	2017	ایم ایے پانگل اینگلو اردو ہائی اسکول	تقریباً 62 لاکھ روپے

فصیح الدین احمد

السنہ عالم کے مختلف خاندانوں کا ایک مختصر تعارفی جائزہ

زبان کے تعلق سے قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، کیونکہ دنیا میں اب بھی ڈھیر ساری ایسی زبانیں ہیں جن کے بارے میں بہت کم معلومات فراہم ہیں۔ بعض زبانیں ایسی ہیں جن کی تحریر انتہائی گنجلک اور غیر واضح ہے۔ بعض کا علم ہمیں چٹانوں پر لکھے ہوئے کندہ اور مسخ شدہ کتبات سے ہوتا ہے۔ بعض کا علم سکوں سے ہوتا ہے اور بعض کا کسی دوسری زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے، لیکن یہ بھی ایک مسلمہ صداقت ہے کہ جن زبانوں کا مطالعہ کافی تفصیل سے اور بھرپور سطح پر ہوا ہے، ان کو ماہرین لسانیات نے جغرافیائی اعتبار سے چار بڑے خطوں میں تقسیم کیا ہے:

(1) یوریشیائی

(2) جزائر بحرالکاہل کا خطہ

(3) افریقی خطہ

(4) امریکی خطہ۔

اس کے علاوہ بعض علما ایسے بھی ہیں، جنھوں نے تمام اہم اور غیر اہم زبانوں کو سیدھے طور پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا ہے، گرچہ یہ تحقیق بھی ہنوز تشنہ اور نامکمل ہے، اس سلسلے میں پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"1822 میں جرمن عالم ہمبولٹ نے طے کیا کہ دنیا میں زبانوں کے کل 13 خاندان ہیں۔ پارٹی رچ نے دس ہی مانے۔ فریڈرک مولر اور بعض دوسرے علماء کے مطابق 100 خاندان ہیں۔ لیکن J.W. Powell نے 1891 میں امریکہ ہی میں 54 خاندان قرار دیے تھے۔ سیپر نے 1929 میں انھیں چھ بڑے خاندانوں میں اسیر کیا ہے۔ جب ایک علاقے کی زبانوں میں اتنا اختلاف ہو تو پوری دنیا کے خاندانوں کی کس طرح قطعی حد بندی کی جاسکے۔"[1]

پروفیسر گیان چند جین کی یہ رائے حقیقت پسندانہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زبانوں کی قطعی حد بندی نہیں کی جاسکتی لیکن زبان کے مطالعے کے لیے کسی نہ کسی نہج پر پہنچنا ضروری ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری اور ساری ہے۔ پروفیسر محی الدین قادری زور اپنی کتاب ہندوستانی لسانیات میں محض 8 بڑے خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔[2] اس طرح یہ فہرست بھی نامکمل ہے۔ ڈاکٹر دیوندر ناتھ شرما کچھ زیادہ واضح انداز میں دنیا کی تمام زبانوں کو چار بڑے لسانی خطوں پر مشتمل 18 بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔[3] ان کے مطابق دنیا کے مختلف خطوں سے وابستہ لسانی خاندانوں کے نام اعداد و شمار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

(1) **یوریشیائی خطہ**: (1) ہند یوروپی خاندان (2) دراویڈی (3) یوروشکی (4) یورال التائی (5) کاکیشی (6) چینی خاندان (7) جاپانی کوریائی (8) ہائپر بوری (9) باسک (10) سامی خاندان (بعض علما نے اسے یوریشیائی خطے میں شمار کیا ہے اور بعض نے افریقی)

(2) **جزائر بحر الکاهل کا خطه**: (11) ملائے پولی نیشیائی (12) پاپوئی (13) آسٹرولیائی (14) جنوب مشرقی ایشیائی خاندان۔

(3) **افریقی خطه**: (15) سوڈانی (16) بانتو (17) ہوتین توبوشمینی

(4) **امریکی خطه**: (18) امریکی خاندان

مندرجہ بالا تمام خاندانوں کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

(1) یوریشیائی خطه:

اس خطے کی سب سے اہم شاخ ہند یوروپی ہے، کیونکہ اس خاندان میں اکثر ایسی زبانیں شامل ہیں جو اپنے علمی اور ادبی ذخیروں کے لحاظ سے اعلیٰ ترین زبانیں کہی جانے کی مستحق ہیں۔ اس خاندان کی زبانیں ہندوستان، افغانستان، ایران، کوہ قاف کے پاس آرمینیا کے علاوہ یوروپ، امریکہ، جنوبی افریقہ کے بالکل جنوبی

حصے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں بولی جاتی ہیں۔ قدیم زبانوں میں سنسکرت، یونانی اور لاطینی کے علاوہ جدید زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی، ہندی، اردو، مراٹھی، بھوجپوری، گجراتی، پنجابی اور بنگلہ وغیرہ خاص طور سے مقبول ومشہور ہیں۔ چونکہ اس خاندان سے ہماری اپنی زبان اُردو کا تعلق ہے اس لیے آئندہ ایک نئی سرخی کے ساتھ اس پر تفصیل سے باتیں کی جائیں گی۔

(2) دراویڈی خاندان:

دوسرا بڑا اور اہم خاندان دراویڈی ہے۔ اس خاندان کی زبانیں جنوبی ہند کے بیشتر حصوں کے علاوہ بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کے بہت سے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ دور افتادہ مقام بلوچستان کی براہوئی بھی اسی خاندان کی زبان ہے۔ اس سلسلے میں بشپ کاڈویل پہلے شخص ہیں جنھوں نے انیسویں صدی عیسوی میں دراویڈی زبانوں کی تقابلی قواعد لکھی۔ اُن کا خیال ہے کہ پہلے یورال التائی کو تورانی خاندان کہا جاتا تھا۔ جون بیمز نے دراویڈی کو بھی تورانی زبان کہا ہے۔ بعض دوسرے علما نے بھی دراوڑ اور یورال خاندان کی مماثلتوں پر زور دیا ہے۔ تامل، تلگو، کنڑ اور ملیالم وغیرہ اس خاندان کی مشہور زبانیں ہیں۔ تامل زبان تامل ناڈو اور لنکا کے شمالی حصے میں بولی جاتی ہے۔ یہ دراوڑ زبانوں میں سب سے قدیم ہے۔ بنگالی کے ساتھ تامل ادب ہندوستان کی زبانوں میں سب سے زیادہ اہم اور وسیع ہے۔

تلگو کے بولنے والے سب سے زیادہ ہیں۔ اس میں سنسکرت الفاظ کی بہتات ہے۔ لفظوں کے اخیر میں مصوتہ ہوتا ہے۔ اس میں یورال التائی زبانوں کی طرح مصوتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ زبان کافی شیریں اور نرم ہے۔ اسے مشرقی اطالوی کہا جاتا ہے۔ اس کا ادب گیارہویں صدی عیسوی سے ملتا ہے۔ قدیم ترین کتابیں قواعد اور سنسکرت مہابھارت کا ایک ترجمہ ہیں۔

کنڑ، کرناٹک کی زبان ہے۔ یہ تامل سے ملتی جلتی ہے، لیکن اس کا رسم الخط تلگو ہے۔ دراویڈی کا سب سے قدیم کتبہ بالمیدی (450 ق م) ہے جو کنڑ کا ہے۔ کنڑ میں بہت پہلے سے ہی ادب لکھا جانے لگا تھا۔ اس میں دسویں صدی عیسوی کی کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ابتدائی لکھنے والے جین تھے جو بہت کچھ سنسکرت سے متاثر تھے۔

ملیالم نویں صدی میں تامل سے الگ ہوئی۔ یہ کیرالہ کی زبان ہے۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ کافی ہیں، لیکن مالابار کے موپلا مسلمانوں کی زبان سنسکرت اثرات سے مبرا ہے۔ اس میں تیرہویں یا چودھویں صدی عیسوی سے ادب لکھا جانے لگا ہے۔ ابتدا میں تامل اور سنسکرت شاعری کی نقل تھی، لیکن سترہویں صدی تک آتے آتے اس کے ادب اور رسم الخط دونوں کو خاص اہمیت وحیثیت حاصل ہوگئی۔

(2) یوروشکی خاندان:

ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں بولی جانے والی زبانیں قدیم ہندوستان میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں، مگر اب اس کی اہمیت وقدر وقیمت بہت کم ہے۔

(3) یورال التائی خاندان:

علمائے لسانیات میں سے کسی نے اس کو ایک خاندان تسلیم کیا ہے اور کسی نے دو الگ الگ خاندان اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بعض مصوتی ہم آہنگی کی بنا پر دونوں خاندانوں کو ایک سمجھا گیا تھا اور تورانی کا نام دیا گیا تھا، مگر دونوں خاندانوں کی زبانوں میں اہم فرق ہے۔ دونوں کی تعریف بالکل مختلف ہے۔ یورالی میں متعدد مصوتے بکثرت ہوتے ہیں جب کہ التائی میں بالکل نہیں ہوتے، اس لیے ذیل میں دونوں پر الگ الگ غور کیا جاتا ہے۔

یورال خاندان:

ظاہر ہے کہ اس خاندان کا نام کوہ یورال کی وجہ سے پڑا ہے۔ اس لسانی خاندان کا وطن کوہ قاف کے شمال میں ہوسکتا ہے۔ بعض ماہرین نے یورالی کو ہند یوروپی سے ملانا چاہا ہے اور بعض نے منڈا خاندان سے، لیکن یہ دونوں تعلق خارج از امکان ہے۔ یورالی خاندان کی زبانوں میں فینی (Finny) لیپی (Leepy) استھونی (Asthoni) مکبار (Magbar) وغیرہ ہیں۔ وسطی والگا سے نکل کر سب سے پہلے لوگ یورال گئے۔ مسیحی عہد تک فینس بالٹیک کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ 900ء کے قریب یورال سے مکبار لوگ ہنگری پہنچے۔ ہنگری کی زبان اور ملک کو مکبار کہتے ہیں، اس کا قدیم ترین کتبہ ہنگری میں تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل کا ہے۔

فینس کو چالیس لاکھ آدمی بولتے ہیں۔ اس کا ادب سولہویں صدی عیسوی سے ہی ملنا شروع ہوجاتا ہے۔ اس میں ایک قومی رزمیہ نظم 'گلے ولا' ہے۔ استھونیا کا ادب سولہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ یورال خاندان کی زبان مصوتی ہم آہنگی اب محض فینس اور لیپی زبانوں میں بچی ہے۔

التائی خاندان:

التائی پہاڑ کے نام پر اس خاندان کا نام پڑا ہے۔ یہ پہاڑ التائی یعنی وسط ایشیا میں ہے۔ اسی کے نام پر ان زبانوں کو التائی کہا گیا ہے۔ التائی خاندان کی مشہور زبانوں میں ترکی، ازبیک، منگول، مانچوئی وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔

کاکیشی یا قفقازی خاندان:

اس خاندان کا تعلق کوہ قاف کے علاقے سے ہے جو روس کے جنوبی سرے پر، بحرِ خضر (کیسپین) اور بحرِ اسود کے بیچ ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے، جہاں مختلف حملہ آوروں سے بچ کر بھاگے ہوئے لوگ پناہ لیتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے یہاں زبانوں کی کثرت ہے اور ان زبانوں میں خاصا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ یہ خاندان ہند یوروپی سے بہت پہلے یوریشیا میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایران کی 'ایلی' عراق کی 'سمیری' وغیرہ سے ہم نسب تھی۔ اس خاندان کی بعض خصوصیت باسک زبانوں سے ملتی ہے۔ اس خاندان کی ایک اہم زبان جارجیائی ہے، اس کا ادب پانچویں صدی عیسوی سے ملتا ہے۔ اس زمانے میں بائبل کا ایک ترجمہ کیا گیا ہے جس کے کچھ حصے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ لیگی، منیگلی اور اجائی وغیرہ اس خاندان کی اور حمارہ، ناما، سندوا، اکیوے یا اوکیوے وغیرہ اس کی خاص زبانیں ہیں۔ اس خاندان کی زبانوں میں ایک ایسی آواز ہوتی ہے جس کی ادائگی سانس کو اندر کی جانب کھینچتے ہوئے کی جاتی ہے۔

تبت چینی خاندان:

اس خاندان کی زبانیں یک رکنی مادوں پر مشتمل غیر ترکیبی ہوتی ہیں۔ ان کی بہتر نمائندہ چینی زبان ہے۔ ابتدا میں غالباً چینی لفظ زیادہ طویل تھے اور ان میں چسپے اور تصریف دونوں تھے۔ اس زبان کی ایک بڑی خصوصیت لفظوں کو 'سُر' کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ ایک ہی لفظ کو مختلف سروں میں بولنے سے معنی بدل جاتے ہیں۔ چین، تبت، میگھالیہ، ناگالینڈ، تریپورہ، برما اور تھائی لینڈ میں اس خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس خاندان کے بولنے والے ہند یوروپی کے بعد سب سے زیادہ ہیں۔

بعض علما کا یہ خیال ہے کہ پورا تبت چینی گروہ، آسٹرو ایشیائی خاندان اور کسی جنوب مشرقی ایشیائی زبان کے میل سے بنا ہے، لیکن یہ قیاس ابھی ثابت نہیں ہوا ہے۔ اصل تبت چینی بلکہ اصل قدیم چینی تک کی بازتشکیل مشکل ہے۔

جاپانی کوریائی خاندان:

اس خاندان کی زبانیں جاپان اور کوریا وغیرہ میں بولی جاتی ہیں۔ اس خاندان کی زبانوں کا ابھی تک کوئی بھرپور اور خاطر خواہ مطالعہ سامنے نہیں آسکا ہے، لیکن جو بھی تحقیق ہوئی ہے اس کی روشنی میں بعض علما نے اس

خاندان کا رشتہ 'ملایا' سے قائم کیا ہے، لیکن یہاں پر مذکورہ خاندان کو باضابطہ ایک علیحدہ خاندان ہی تسلیم کرنا زیادہ مناسب ہے۔ جاپانی ایک ترقی یافتہ زبان ہے اس کا ادب بھی ترقی یافتہ ہے۔ اس میں پانچویں صدی عیسوی کی شاعری کے نمونے موجود ہیں۔ جاپانی زبان کا رسم الخط چینی ہے۔ جاپان کی تحریری اور تقریری زبان میں کسی قدر فرق ہے۔ تحریری زبان کو بدو (Baddo) اور بول چال کی زبان ڈو (Doo) کہا جاتا ہے۔ آخرالذکر کا صوتی نظام پیچیدہ ہے، لیکن خیالات ادا کرنے کی سہولت ہے۔ اس میں جتنے تکلفات و آداب ہیں۔ اتنے کسی اور میں نہیں۔

کوریائی خاندان:

یہ ایک امتزاجی زبان ہے۔ اس پر منگول اور مانچو کا اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے التائی خاندان میں رکھ دیا گیا ہے، لیکن التائی سے اس کا رشتہ ثابت نہیں ہے۔ 372ء میں بودھ دھرم آنے پر کوریا میں چینی کلچر آ گیا۔ اس میں کچھ ادب بھی پائے جاتے ہیں۔ کوریائی زبان صرف ونحو میں جاپانی سے بہت ملتی ہے لیکن حالتوں کو ظاہر کرنے والے حروف جار (Post Position) جاپانی سے بہت مختلف ہیں۔

ھائپر بوری خاندان:

اس خاندان کی زبانوں کو عتیق ایشیائی گروہ بھی کہتے ہیں۔ ایشیا کے شمال مشرق پر اس خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ 'یک گرئی'، 'چک چی' اور 'رینو' وغیرہ اس گروہ میں شامل ہیں۔ رینو بولیاں جاپان کے شمال اور اس کے گردونواح میں بولی جاتی ہیں۔ شاید یہ کبھی جاپان کی دیسی زبان تھی، جس طرح ایلورا یا ہند یوروپی کا تعلق واضح نہیں ہے، اسی طرح ان دونوں کا اور اسکیموں زبانوں کا تعلق بھی مبہم ہے۔

باسک خاندان:

باسک کے بولنے والے اسے ایوسکا رایا ایوکورا کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اسپین، پرتگال وغیرہ میں ایک زبان Ibevian بولی جاتی تھی، اس کا نسب واضح نہیں، اس سے Aquitanian نکلی جس کے تقریباً دو سو اعلام ملتے ہیں، اسی سے باسک نکلی۔ کسی زمانے میں یہ شمال میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب یہ فرانس اور اسپین کی سرحد پر پیرینز پہاڑ کے مغربی ضلع میں بولی جاتی ہے۔ اس کے قدیم ترین ریکارڈ میں آٹھویں صدی کے مقاموں کے نام ہیں۔ سب سے پرانی کتاب 1545 کی ہے جس کے بعد باقاعدہ تحریریں ملنے لگتی ہیں۔ ان میں بہت سی بولیاں ہیں۔

سامی خاندان:

یوریشیائی خطے کی ایک اہم شاخ سامی خاندان ہے۔ سامی خاندان سام بن نوح سے منسوب ہے جن کا ذکر قرآن مقدس اور انجیل مبارک میں ملتا ہے اور جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ان تمام قوموں کے جد اعلیٰ ہیں جو اس وقت سامی زبانیں بولتی ہیں۔ قدیم ترین سامی زبان 'اکادی' ہے، جس کے کتبے 2800 ق م کے ملتے ہیں۔ 400 ق م کے بعد سے عراق کا علاقہ سامی ہوگیا۔ گو 'سمیری' زبان بھی مذہبی کاموں کے لیے باقی رہی۔ 1900 ق م میں یہاں کی زبان 'بابلی' ہوگئی اور ان کے شمال میں 'آشوری' تھی۔ آٹھویں صدی ق م میں آرامی نے بابلی کی جگہ لے لی اور دارائے اعظم کے عہد تک تجارت میں استعمال ہوتی رہی۔ سامی خاندان کی زبانوں میں 'عبرانی'، 'آرامی' اور 'عربی' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سامی قبائل کنعان کے علاقے میں پہونچ کر بس گئے۔ کنعانی زبانوں میں عبرانی سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ غالباً 1100 ق م یا اس سے پہلے رائج ہوئی۔ توریت عبرانی زبان میں ہے اور اس کی ترتیب کا زمانہ 800 ق م کے قریب کا ہے۔ کلاسیکی عبرانی کا رواج 600 ق م یا چوتھی صدی ق م تک رہا۔ قدیم عبرانی پہلی صدی عیسوی کے آخر تک کتبوں میں رائج رہی۔ جدید عبرانی کو 'حکیم' کہتے ہیں جس کے معنی ہیں حکیموں کی زبان۔ یہ زبان ساتویں صدی تک زندہ رہی، اسلام کے ظہور کے بعد یہ بالکل ختم ہوگئی۔

عبرانی کے زوال کے بعد آرامی زبان سارے مغربی ایشیا اور مصر میں سیاست وتجارت کی زبان بن کر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک 'مغربی' اور دوسری 'مشرقی'۔ مغربی آرامی زیادہ تر یہودیوں کی زبان ہے اور مشرقی آرامی عیسائیوں کی۔ اس کے کتبے اکادی علاقے میں نویں صدی ق م سے ملتے ہیں۔ اس کی بولیوں میں بابلی اور تالمودی وغیرہ ہیں۔

عربی:

مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی وجہ سے عربی نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی۔ یہ حقیقت ہے کہ عربوں کا دوسری زبانوں اور تہذیبوں سے رابطہ رہا ہے، لیکن خود عربی باہر کے اثرات سے بہت کچھ مبرا رہی ہے۔ قرآن پاک کی وجہ سے زبان خالص شکل میں رہ گئی۔ عربی کی دو خاص شاخیں شمالی یا کلاسیکی عربی ہیں۔ شمالی عربی کے قدیم ترین کتبے لحیانی خط میں دوسری صدی قبل مسیح اور چھٹی صدی عیسوی کے بیچ کے ہیں۔ عربی کی قدیم بولیوں میں سے صرف مکہ میں بولی جانے والی حجازی باقی ہے، لیکن وادی نجد کی بولی زیادہ خالص اور بیرونی اثرات سے پاک ہے۔ اب بھی یہ بدویوں کی زبان ہے۔

دوسرا بڑا اہم خطہ جزائر بحرالکاہل کا ہے۔ اس خطے کے تحت درج ذیل خاندان آتے ہیں:

ملائے پولنشائی، پاپوئی، آسٹریلیائی اور جنوب مشرق ایشیائی خاندان وغیرہ اس خاندان کی مشہور شاخیں ہیں جن کی تفصیل آگے ہے۔

ملائے پولنشائی

مذکورہ خاندان کی سب سے اہم شاخ ملائے پولیشیائی ہے۔ اس کی دو شاخیں ہیں ایک انڈونیشیا، ملیشیا پر مشتمل ہے، دوسری کورونیشیا کہا گیا ہے جو انڈونیشیا اور نیوگنی کے مشرق، نیوزی لینڈ کے شمال اور ہوائی کے جنوب کے علاقے پر مشتمل ہے۔ انڈونیشیائی کی دو شاخیں بہت اہم ہیں۔ پولیشیائی اور میلیشیائی۔ گویا پورے ملائے پولیشیائی کو تین اہم خاندانوں، انڈونیشیائی، پولیشیائی اور میلیشیائی میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پولیشیائی کا علاقہ ہوائی جزیرے اور اس کے بالکل جنوب میں سیمو اور ٹونگا تک پھیلا ہوا ہے۔ میلنیشیائی کا علاقہ نیوگنی اور نیوزی لینڈ کے بیچ ہے۔ انڈونیشیائی خاندان کی تین شاخیں شمالی، جنوبی اور مغربی ہیں۔ شمالی شاخ فارموسا اور فلپائن جزیروں پر مشتمل ہے۔ فارموسا کے مغربی حصے میں چینی زبان اور مشرق حصے میں فارموسائی بولی جاتی ہے۔ فارموسائی پر چینی زبان کا شدید اثر ہے۔ فلپائن میں تگال سب سے زیادہ اہم ہے۔ جنوبی شاخ ملیشیائی اور انڈونیشیائی پر مشتمل ہے۔ اس میں ملیشیا، سماترا اور بورنیو کی زبان ملایا ہے اور یہ پورے آسٹرک خاندان کی سب سے اہم زبان ہے۔

پاپوئی:

یہ خاندان نیوگنی کے مشرقی حصہ، آس پاس کے جزائر اور جزیرہ نیوبرٹن کے بعض حصوں میں بولی جاتی ہے۔ اس میں بھی سابقے اور لاحقے دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں تقریباً 132 زبانیں ہیں۔ نیوگنی کی مشہور زبان مفورائی ہے۔ یہ زبانیں غیر امتزاجی ہیں۔

آسٹریلیائی:

اس خاندان میں تقریباً سو زبانیں ہیں جو آسٹریلیا کے شمالی اور جنوبی حصے میں بولی جاتی ہیں۔ اس خاندان کی زبانیں بھی غیر امتزاجی ہیں۔ آسٹریلیائی کو ڈراویڈی کے علاوہ افریقہ کے بعض خاندانوں ملایا پولیشیائی، پاپوئی اور انڈمانی سے ملانے کی کوشش کی گئی لیکن بے سود، گرے کے مطابق ملائے پولیشیائی اور آسٹریلیائی میں کوئی فرق

نہیں۔ ہم ان دونوں کو آسٹرک خاندان کی شاخیں جو قرار دیتے ہیں علاقائی بنا پر ان کے بولنے والے بہت بچھڑے ہوئے قبائلی ہیں اور روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ یہ زبانیں بھی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

جنوب مشرق ایشیائی خاندان:

اسے اسٹروایشاٹک (Astro Asiatic) خاندان بھی کہا جاتا ہے۔ آسٹروایشیائی زبانوں کا تاریخی مواد نہیں۔ ممکن ہے ان سے پہلے کوئی اور زبانیں بولنے والے رہے ہوں۔ ان کی زبانوں کے واقعات زیریں سطح کے طور پر آسٹروایشیائی زبانوں میں مل گئے ہوں۔ ان وجوہ سے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جنوب ایشیا کی زبانیں ہیں کہ نہیں۔ ان زبانوں کے درمیان آپس میں کافی فرق ہے۔ اس خاندان کی زبانیں امتزاجی ہیں جس میں چسپے، ابتدا، وسط اور آخر میں کہیں بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ مادے دورکنی ہوتے ہیں۔ اس خاندان کی زبانیں انام، سیام، ملبوریائی، کمبوڈیائی کے علاوہ ہندوستان اور جزیرہ نکوبار میں بولی جاتی ہیں۔ یہ خاندان تین اہم حصوں میں منقسم ہیں۔ (1) مغرب میں منڈا یا کول (2) مشرق میں انام اور وسط میں مدن کھیر۔

(1) منڈا زبانیں:

پہلے ان زبانوں کو کول کہا جاتا تھا۔ ان زبانوں میں 'کول' کے معنی 'آدمی' ہیں لیکن سنسکرت میں 'کول' کے معنی 'سور' ہیں، اس لیے گریرسن نے ان کا نام بدل کر 'منڈا' رکھ دیا۔ 'منڈا' اسی خاندان کی ایک زبان منڈاری کا لفظ ہے جس کے معنی 'سردار' کے ہیں۔ ہندوستان میں آریوں کی آمد سے پہلے ڈراوڈی بستے تھے اور ڈراوڈوں سے پہلے بھی آسٹروایشیائی یا منڈا۔ یہ لوگ ہاتھی پالتے تھے، چنانچہ شمالی ہند میں مہاوت، ہاتھی کو جن الفاظ میں حکم دیتے تھے وہ منڈا زبانوں کے ہی ہیں۔ گنگا ندی کا نام بھی منڈا زبان کا ہے۔ منڈا زبانوں کا مرکز چھوٹا ناگپور ہے یعنی بنگال، بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کے سنگم کا علاقہ۔ اس کے علاوہ آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش اور ہماچل کے بعض علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ (2) انامی زبان کمبوڈیا، کوچین، چائنا اور گونگن میں بولی جاتی ہے۔ پہلے یہ ادبی زبان تھی۔ اس میں 1084 کے کتبے ملتے ہیں۔ اب اسے برما اور تھائی لینڈ کے بعض حصوں میں بولتے ہیں۔ کھیمر لوگ کبوڈیائی تھے، ان کی زبان کے کتبے ساتویں صدی کی ابتدا سے ملتے ہیں۔ اب یہ زبان برما اور تھائی لینڈ کی سرحدوں پر بولی جاتی ہے۔

افریقی خطہ:

اس خطے کی زبانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ وہ دو گروہ یہ ہیں (1) سوڈانی خاندان اور بانتو خاندان۔ سوڈانی خاندان کی زبانیں خط استوا کے شمال میں مغرب سے لے کر مشرق تک بولی جاتی ہے۔ اس کے شمال میں سامی خاندان ہے اور مغرب بانتو خاندان:

اس خاندان کی زبانیں جنوبی مغربی حصے کو چھوڑ کر تقریباً سارے جنوبی افریقہ میں بولی جاتی ہیں۔ اس کے شمال میں سوڈانی خاندان ہے۔ اس خاندان کی خاص اہم زبانیں سواحلی، کافری، ژولو وغیرہ ہیں۔ اس کی زبانیں بیشتر سابقہ امتزاجی ہیں۔ ان کے جملے اکثر یکساں آواز سے شروع ہوتے ہیں اور یہ سابقوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان زبانوں میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں۔ فعل یا ضمیر کی بنا پر فرق نہیں۔ یہ زبانیں نرم و شیریں ہوتی ہیں، ان کا صوت رکن مصوتے پر ختم ہوتا ہے۔ بعض زبانوں میں سُر بھی ہوتے ہیں مگر ان کی معنوی قدر نہیں۔

امریکی خطہ:

اس خطے کی زبانیں امریکہ میں بولی جاتی ہیں جن کی تعداد کم و بیش ایک ہزار ہے۔ اس خاندان کی صحیح حد بندی نہیں ہو سکی ہے۔ اس خطے کے تحت شمالی، وسطی اور جنوبی امریکہ آتے ہیں۔ شمالی امریکہ میں کناڈا اور اقوام متحدہ آتے ہیں۔ اس خاندان کی اہم زبانوں میں اتھ وسکی، الگونی، ہوکا اور سیوئی اور یوروکوا وغیرہ ہیں۔ کناڈا اور یو ایس اے کی زبانوں میں الگولی خاندان کا سب سے زیادہ مطالعہ کیا گیا کیونکہ کناڈا والوں کو سب سے پہلے اسی زبان کے بولنے والوں سے سابقہ پڑا۔ شمالی امریکہ کی زبانوں میں اتھ وسکی سب سے زیادہ علاقے یعنی پورے کناڈا اور شمالی یو ایس اے میں پھیلی ہوئی ہے۔

میکسیکو اور وسطی امریکہ میں گرے کے مطابق 20 خاندان ہیں جن میں الگولی اور سیوئی زبانیں زیادہ اہم ہیں۔ پورے امریکہ میں صرف وسطی امریکہ ہی ایسا مقام ہے جہاں کے قبائلیوں میں فن تحریر کے نمونے موجود ہیں۔

جنوبی امریکہ کی زبان کا اور بھی کم مطالعہ ہوا ہے۔ فادر شمٹ نے یہاں 36 خاندان قرار دیے ہیں۔ اس خاندان کی اہم زبانوں میں گوارنی (Guarni)، ٹوپی (Tupi)، چبو چا (Chibocha)، کریب اور کوئی چوا (Koi Chua) وغیرہ خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں دو خاندانوں کا تفصیلی مطالعہ ہوا ہے۔ اراوک خاندان جنوبی امریکہ میں سب سے اہم ہے اور بڑے حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ براعظم کے علاوہ Antille جزیروں میں بھی رائج ہے۔ اسپینیوں کی آمد سے پہلے کریب قبیلے نے ان جزیروں کو فتح کر کے تمام اراوک مردوں کو مار دیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب عورتیں اور بچے اراوک زبان بولنے لگے اور مرد کریب۔ یہ روایت کئی نسلوں تک چلی۔

جنوبی امریکہ کی زبان کا اور بھی کم مطالعہ ہوا ہے۔ فادر شمٹ نے یہاں 36 خاندان قرار دیے ہیں۔ اس خاندان کی اہم زبانوں میں گوارنی (Guarni)، ٹوپی (Tupi)، چبو چا (Chibocha)، کریب اور کوئی چوا (Koi Chua) وغیرہ خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں دو خاندانوں کا تفصیلی مطالعہ ہوا ہے۔ اراوک خاندان جنوبی امریکہ میں سب سے اہم ہے اور بڑے حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ براعظم کے علاوہ Antille جزیروں میں بھی رائج ہے۔ اسپینیوں کی آمد سے پہلے کریب قبیلے نے ان جزیروں کو فتح کر کے تمام اراوک مردوں کو مار دیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب عورتیں اور بچے اراوک زبان بولنے لگے اور مرد کریب۔ یہ روایت کئی نسلوں تک چلی۔

دوسری اہم زبان یوروکو ہے۔ یہ طے نہیں ہے کہ یہ واحد زبان ہے یا مماثل زبانوں کا خاندان۔ یہ پیرو کی مہذب قوم کی زبان تھی۔ یہ اب بھی پیرو میں اسپینی کے ساتھ بکثرت بولی جاتی ہے۔ جنوبی امریکہ کی زبانوں میں یہ واحد زبان ہے جو کولمبس کی آمد سے پہلے ایک تہذیب کا ذریعہ تھی۔

گرین لینڈ کی اسکیمو (Escimo) زبان بھی اسی خاندان کی ہے۔ اس خاندان کی اکثر زبانیں مکمل شمولی ہیں، لیکن اب اس میں کچھ لاحقے بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ گرین لینڈ کی علمی زبان ڈنمارک کی Danish ہے۔

حواشی:

(1) عام لسانیات: از پروفیسر گیان چند جین ص 744
(2) ہندوستانی لسانیات: از پروفیسر محی الدین قادری زور ص 84
(3) بھاشا و گیان کی بھومیکا: از ڈاکٹر دیوندر ناتھ شرما ص 114

Dr. Faseehuddin Ahmad
Dept. of Urdu, B.N. Mandal University
Madheypura - (Bihar)

غلام ربانی تاباں

(15 فروری 1914، 7 فروری 1992)

شارب ردولوی

تاباں صاحب سے میری پہلی ملاقات 1954 میں ہوئی جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھا اس کے بعد جب بھی وہ لکھنؤ آتے تو مجھے اطلاع دیتے یا کسی شاعر کے ساتھ خود میری قیام گاہ پر آجاتے اور دیر تک ساتھ رہتے۔ تاباں صاحب کی شاعری میں ایک ایسا موڑ آیا کہ انھوں نے نظمیں لکھنی بند کردیں حالانکہ نظموں کی وجہ سے ان کی کافی شہرت تھی۔ ایک بار میں نے دریافت کیا کہ آپ نے نظمیں کہنی کیوں بند کردیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ غزل نظم سے زیادہ توانا صنف ہے، کہنے لگے یہ بات نہیں ہے نظم اپنی جگہ پر بیحد اہم ہے۔ اس میں بات کہنے کی زیادہ گنجائش ہے لیکن اول یہ کہ ہم نے نظم کا استعمال صحیح نہیں کیا پھر آزاد نظموں کے ساتھ ہمارے نئے لکھنے والوں نے بڑی زیادتی کی اس کو انھوں نے اپنے عجز کا پردہ بنالیا۔ دوسرے شاعری تو اشاروں کی زبان ہے بغیر اس کے اس میں کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔ انھوں نے کہا کہ شعر گوئی پر قدرت ہونی چاہیے آپ موزوں اور پابند شعر کہہ سکتے ہوں اور اس میں ہر طرح کے خیال کے اظہار کی قدرت رکھتے ہوں اس کے بعد اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آزاد یا معرا نظم کے ذریعے آپ کسی موضوع یا خیال کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کر سکتے ہیں تو ضرور لکھیں۔

غزل ہی کے موضوع پر گفتگو میں ایک بار انھوں نے کہا کہ غزل کو روایتی اور ناقص قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ بہت اچھی بات نہیں تھی اس وقت سب کو جوش تھا اور بلند بانگ شاعری پسند کی جاتی تھی میں غزل اس لیے لکھنے لگا کہ اس میں بڑی گنجائش ہے اور بیشتر باتیں اس میں کہی جاسکتی ہیں بشرطیکہ آپ کو کہنے کا سلیقہ ہو۔

غزل اور ادب کے بارے میں ان کے بڑے واضح نظریات تھے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار بہت کھل کر کرتے تھے لیکن کبھی کسی پران خیالات کے مان لینے پر زور نہیں دیتے تھے یہی سبب ہے کہ انھوں نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ وہ غزلیں کہے یا نہ کہے۔ لیکن غزل ان کے لیے ایسی نازک، ایسی دلکش، ایسی دلفریب صنف تھی کہ وہ اس میں ڈوب جاتے تھے۔ خود ان کا پورا مزاج اور زندگی غزل میں ڈھلی ہوئی تھی۔

غلام ربانی تاباں نئی غزل کے بنیاد گزاروں میں ہیں انھوں نے غزل کو شورش عشق وجنوں اور شکوۂ جور و جفا سے نکالا۔ انھوں نے غزل کو ایک نئی تہذیب سے آشنا کیا۔ تاباں ایک ایسے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اردو شاعری کے کئی بہت اہم نام ملتے ہیں مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری، فیض، فراق، مخدوم، انھیں کے ساتھ دو شاعر ایسے ہیں جو دھیمی لے کے شاعر ہیں ایک جذبی دوسرے تاباں، ان کی غزلیں ایک نئی فکر اور نئی شعری جمالیات کی غزلیں ہیں۔ تاباں نے 1950 تک نظمیں لکھیں 'سازلرزاں' کی اشاعت کے بعد تاباں غزل کی دنیا میں آ گئے جو زمانہ غزل کی مخالفت کا تھا ترقی پسند ادبا اور شعرا ہی نہیں کلیم الدین احمد اور عندلیب شادانی جیسے غیر ترقی پسند ناقدین بھی غزل کے مخالف تھے۔ تاباں خود ترقی پسند، وسیع النظر، کشادہ ذہن اور کلاسیکی مزاج رکھتے تھے۔ ان کی غزل کا اگر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہی چار عناصر ان کی پوری غزلیہ شاعری میں کارفرما ہیں۔ ان کے یہاں غزل کا خیالی دنیا سے حقیقی دنیا کا سفر ملتا ہے۔ ان کے عہد کے دوسرے شعراء وہ خواہ مجاز ہوں یا فیض، مخدوم، ساحر، جاں نثار اختر، سردار جعفری، کیفی اعظمی انھوں نے غزلیں ضرور لکھیں لیکن ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ نظم ہے۔ تاباں نے ایک ایسے زمانے میں جو نظم کے فروغ کا زمانہ تھا غزل کی عمارت سازی کا کام کیا۔ اور اس طرح انھوں نے اردو غزل کو ایک نئی آواز اور نئے مزاج سے آشنا کیا۔

سروں نے دعوت آشفتگی کا قصد کیا
دلوں میں درد کی مہمانیوں کے دن آئے
ادھر چمن میں زر گل لٹا ادھر تاباں
ہماری بے سروسامانیوں کے دن آئے

ان چار مصرعوں میں بہار کی آمد کا کس خوبصورتی سے ذکر کیا ہے اردو شاعری میں موسم بہار سے عاشق کی دیوانگی کے رشتے اور صحرا نوردی کا بیان ہمیشہ ہی وابستہ رہا ہے اور شعرا طرح طرح سے اسے بیان کرتے رہے ہیں لیکن تاباں نے ایسے کسی روایتی لفظ کا سہارا نہیں لیا درد کی مہمانیوں اور بہار میں جو رشتہ پیدا کیا ہے اس میں زرگل کے استعارے نے ایک نیا لطف پیدا کردیا۔ زرگل کا ذکر اردو شاعری میں نیا نہیں ہے لیکن تاباں نے اس سے صرف بہار کی ہی تصویر نہیں پیش کی بلکہ کسی کی دولت (زر) کا لٹ جانا قدرتی طور پر بے سروسامانی کی علامت

ہے اور بہار عاشق کی دیوانگی کا پیش خیمہ ہے اس لیے بہار آتے ہی ادھر زر گل لٹا یعنی پھول کھلے ادھر اس کی بے سروسامانی یعنی صحرا نوردی شروع ہوگئی۔

تاباں سے پہلے غزل فراق کی نرگسیت اور دلکش عشقیہ شاعری سے تو واقف تھی لیکن اس لب و لہجے سے آشنا نہیں تھی۔ ان اشعار میں غزل کا پورا کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور ایک نئی فکری فضا بھی۔ ان کے یہاں نہ رومانیت کی شدت ہے اور نہ انقلاب کا نعرہ، وہ سرگوشی کے شاعر ہیں اور غزل کی کلاسیکی لفظیات کو تبدیل کیے بغیر اس طرح اپنی بات کہتے ہیں کہ اس کی تازگی اور خوشبو ذہن کو سرشار کر جاتی ہے۔

میری آشفتہ سری وجہ شناسائی ہوئی
مجھ سے ملنے روز کوئی حادثہ آجائے ہے
گلوں کی رت ہو کہ برق و شرر کا موسم ہو
کہیں سے تیر چلے دل شکار ہوتا ہے
رائگاں مشغلۂ کوچہ نوردی نہ گیا
دامن شوق کو کچھ گرد ملامت تو ملی

صبا کے ذریعے نامہ و پیام والی غزل نے جب تاباں کے یہاں آنکھ کھولی تو در و دیوار پر لکھی ہوئی نہ جانے کتنی کہانیاں شوق نظارہ کے لیے بے چین ہوگئیں۔ تاباں نے غزل کی لفظیات اور تراکیب کی اس طرح تشکیل کی کہ ان کی معنوی سطح تبدیل ہوگئی۔ اور یہی معنویت اور تہہ داری تاباں کی غزلوں کی خصوصیت اور ان کی انفرادیت بن گئی۔ یعنی اگر آپ ان تراکیب اور الفاظ کو اشعار سے

تاباں سے پہلے غزل فراق کی نرگسیت اور دلکش عشقیہ شاعری سے تو واقف تھی لیکن اس لب و لہجے سے آشنا نہیں تھی۔ ان اشعار میں غزل کا پورا کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور ایک نئی فکری فضا بھی۔ ان کے یہاں نہ رومانیت کی شدت ہے اور نہ انقلاب کا نعرہ۔ وہ سرگوشی کے شاعر ہیں اور غزل کی کلاسیکی لفظیات کو تبدیل کیے بغیر اس طرح اپنی بات کہتے ہیں کہ اس کی تازگی اور خوشبو ذہن کو سرشار کر جاتی ہے۔

علیحدہ کر کے دیکھیں تو وہ عام غزل کے روایتی الفاظ نظر آئیں گے مثلاً دامن شوق، کوچہ نوردی، گرد ملامت، آشفتہ سری، برق و شرر لیکن یہی تمام الفاظ مصرعوں کی پوری ساخت میں ایک نئی معنوی فضا پیدا کرتے ہیں دامن شوق کا گرد ملامت سے آلودہ ہونا اور مشغلہ کوچہ نوردی کو رائیگاں نہ سمجھنا صرف عشق کی کوچہ نوردی نہیں ہے جہاں کی ملی گرد ندامت کو بھی عاشق غنیمت جانے بلکہ یہ زندگی کی جد و جہد بھی ہے جو بہت کامیاب نہ ہوئی ہو لیکن رائیگاں نہیں گئی۔ تاباں کے اشعار میں ایک اداسی کا پہلو کہیں کہیں پر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لیکن وہ اداسی مایوس کن نہیں ہے رجائیت کا ایک پہلو اس میں ضرور رہتا ہے۔ ان کا ایک شعر دیکھیے اس میں افسردگی کا ایک اور پہلو ہے۔

دیوار و در پہ لکھی ہیں کیا کیا کہانیاں
صدیوں کا درد شہر کی پہچان بن گیا

یہ شعر تہذیبی اور سیاسی عروج و زوال کی تاریخ ہے اور اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی ایک شہر، یا کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہے اس میں نہ جانے کتنے ملکوں کی تصویریں نظر آتی ہیں جسے صدیوں کا درد کہہ کر تاباں نے بیان کر دیا ہے۔ قدیم کھنڈر اور در و دیوار زبان حال سے کبھی کبھی کہانیاں سناتے ہیں ان کے لیے تماش بین نگاہوں کے بجائے ایک حساس دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل ستم زدہ کے قصوں سے غزل کا دامن بھرا ہوا ہے اور یہی غزل کے نشتر بھی ہیں اور اس کی کمزوری بھی لیکن تاباں کے یہاں یہ یاس کبھی حرماں نصیبی نہیں بننے پاتی۔ وہ اس کی اثر انگیزی سے فائدہ ضرور اٹھاتے ہیں لیکن ایک نئے انداز اور نئے حوصلے کے ساتھ۔

کھلیں کھلیں نہ کھلیں پھول دل کے صحرا میں
بڑی کشش ہے مگر انتظار فردا میں
خرد کے دور میں دیوانگی غنیمت ہے
بڑا سکون ملا شورشوں کی دنیا میں
مدتوں کے بعد گہری نیند کا ٹوٹا طلسم
شورشوں کو دہر کی انگڑائیاں کہہ لیجیے

تاباں کی غزل کی ایک بڑی خوبی اس کی سادگی ہے۔ یعنی وہ کسی جذبے کے اظہار کے لیے کوئی اہتمام نہیں کرتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بغیر کسی کوشش اور پیش بندی کے اپنی بات کہہ دیتے ہیں لیکن سادگی میں بھی ان کے یہاں بہت سے پہلو پوشیدہ ہیں اور ان کی تہیں اس وقت کھلتی ہیں جب زندگی کے ہر موڑ پر ان کے کسی نہ کسی شعر سے ملاقات ہو جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ تاباں غزل نہیں کہتے بلکہ زندگی کی تصویر، اس کے نشیب و فراز، اس کی رنگینی و رعنائی اس کی ناکامی اور درد بلکہ اپنے عہد کے احساس کی تصویر الفاظ کے ذریعے بناتے ہیں۔:

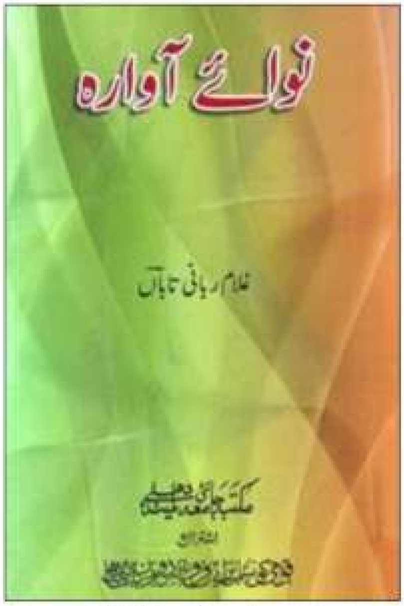

وہی جبیں پہ غرور شکست آج بھی ہے
یہ نقش وہ ہے زمانہ جسے مٹا نہ سکا
شیشہ نازک تھا ذرا چوٹ لگی ٹوٹ گیا
حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں گلا کیا کرنا
شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی آخر کیا بساط
جس طرف چاہے گی جنگل کی ہوا لے جائیگی
دیوار کا سایہ نہ کسی پیڑ کا سایہ
صحرا کی کڑی دھوپ میں کچھ اور مزا ہے

یہ اشعار جتنی بار پڑھیے ایک نیا لطف آتا ہے بالکل اسی طرح جیسے روشنی میں نہ جانے کتنے رنگ پوشیدہ ہیں لیکن ایک نگاہ میں ان تمام رنگوں کو الگ الگ نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہی روشنی کبھی دھوپ کی تپش بن جاتی ہے اور ذرا ترچھی ہونے لگے تو قوس قزح میں تبدیل ہو جاتی ہے یا چاندنی بن کر جلتی ہوئی نگاہوں کے لیے تراوٹ کا کام کرتی ہے۔ تاباں کی غزل بھی اسی طرح اپنے عہد کی سچائیوں کی تصویر بن کر سامنے آتی ہے۔

تاباں کا نام نئی اردو غزل کا وہ نام ہے جس نے غزل کو اظہار کے نئے انداز اور الفاظ کی توانائیوں کا احساس دلایا۔ ترقی پسند دور غزل کی مخالفت کے لئے کتنا ہی مشہور کیوں نہ رہا ہو لیکن اسی عہد نے غزل کو نئے موضوعات، اظہار کے نئے طریقے اور زبان کے نئے تجربوں سے آشنا کیا اور اس میں غلام ربانی تاباں کے contribution کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

■

Dr. Sharib Rudaulvi
C-95, Sector E, Aliganj
Lucknow- 226024 (UP)

عبید اللہ ہارون

مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کے معاصرین

مولانا عبدالسلام ندوی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ بیک وقت وہ معلم، ادیب، انشاپرداز، مؤرخ، تنقید نگار، شاعر، فلسفی اور مترجم تھے۔ گوکہ مولانا کی شناخت ایک تنقید نگار اور مؤرخ کی ہے۔ لیکن انہوں نے تراجم کے باب میں بھی بیش بہا کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کی تحریر کا امتیازی وصف یہ ہے کہ خالص علمی و مذہبی نقوش میں بھی آپ نے اپنے جواہر بکھیرے ہیں۔ اگر ان کے بارے میں یوں کہا جائے کہ جن خالص علمی موضوعات میں حسن و خوبی پیدا کرنے کی ابتدا علامہ شبلی نعمانی نے کی تھی ان کی باقیات کی تکمیل مولانا کے ہاتھوں ہوئی تو بے جا نہ ہوگا۔

مولانا نے اپنی عمر عزیز کے بیشتر اوقات اردو زبان و ادب کی آبیاری میں صرف کیے جس کی زندہ مثال ان کی شہرۂ آفاق اور معرکتہ الآرا تصنیف 'شعرالہند' ہے جو مولانا کے ادبی، تاریخی و تنقیدی شعور میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یقیناً یہ کتاب اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک وقیع اضافہ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شعرالہند جو نظم اردو کی ایک مبسوط تاریخ ہے ان کے اثرات و حالات جو مختلف اوقات میں نظم اردو پر مرتب ہوئے مفصل اور نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے، اپنی نوعیت سے یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کو تصنیف کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے، یہ کتاب کارآمد اور مفید ضرور ہے اور اس میں خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں''

(تاریخ ادب اردو، ص: 75,76)

مولانا بیسویں صدی کے اوائل میں تصنیفی و تالیفی میدان میں قدم جما چکے تھے، آپ نے تقریباً نصف صدی چمنستان علم و ادب کی آبیاری کی، آپ کے کارنامے کی نسبت کئی جگہوں سے جڑی تھی: دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ میں تعلیم و تربیت اور 'الندوہ' کی سب ایڈیٹری، دارالمصنفین کے رکن رکین و مصنف اور 'معارف' کے کالم نگار کی حیثیت سے رہی اس وجہ سے آپ کے تعلقات کا دائرہ کافی وسیع تھا اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس شخص کا علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی میدان اتنا وسیع ہو تو ان کے معاصرین و احباب کی ایک طویل فہرست تو ہوگی ہی، ان سب کا ذکر دشوار ہے اور غیر ضروری بھی، ہم انہی معاصرین کا ذکر کریں گے جو آپ کے ہم مشرب زیادہ تھے۔ جیسے کہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا اقبال احمد خاں سہیل، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔

مولانا سید سلیمان ندوی مولانا عبدالسلام ندوی کے ان معاصرین میں سے ہیں جن کی کئی جہتوں سے علمی شراکت داری رہی، دونوں کی نسبت دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے رہی دونوں نے 'الندوہ' کے سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے۔

مولانا سید سلیمان ندوی زمانہ طالب علمی میں علامہ شبلی کے ہونہار طلبہ میں شامل ہو چکے تھے، اور علامہ نے آپ کی خصوصی تربیت بھی کی تھی تاکہ آپ ان کے باقیات کی تکمیل کریں، چنانچہ اسی غرض سے جب علامہ کا اخیر وقت ہوا تو انھوں نے آپ کو دارالمصنفین بلا لیا اور سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کی وصیت کی، یہیں آپ کو مولانا عبدالسلام ندوی کے ساتھ باقاعدہ کام کرنے کا موقع ملا، مولانا عبدالسلام ندوی نے سیرت کی تکمیل میں آپ کا خاصا تعاون بھی کیا جس کا اظہار سید صاحب نے کتاب کے شروع میں فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے اور بقول مولانا سعید انصاری ''تیسری جلد تمام کی تمام مولانا عبدالسلام ندوی کی لکھی ہوئی ہے۔''

مولانا عبدالسلام ندوی آپ کو وہی عزت دیتے تھے جو علامہ شبلی کو دیتے تھے، مولانا عبدالسلام ندوی عمر اور علم میں بڑے ہونے کے باوجود سید سلیمان ندوی کے ساتھ نہایت درجہ تواضع و انکساری کے ساتھ پیش آتے تھے جو ان کی اعلیٰ ظرفی پر بھی دال ہے۔ مولانا نے علامہ شبلی کے انتقال پر جو مکتوب بنام سید سلیمان ندوی لکھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''برادرم! میں نے بلا اختلاف آپ کو مولانا مرحوم کا خلیفہ تسلیم کر لیا، اس لیے جس طرح میں حضرت مرحوم کا وفادار تھا، آپ بھی مجھے اپنا وفادار خادم تصور فرمائیے، میں آپ کے زیر ہدایت و زیر نگرانی ہر ممکن خدمت کے لیے تیار ہوں''۔ (دارالمصنفین کے مخطوطہ مکتوب سے ماخوذ)

مولانا اقبال احمد خاں سہیل، مولانا ندوی کے ان معاصر میں سے ہیں جو ان کے ہم وطن ہونے کے ساتھ دبستان شبلی کے ہم مشرب وہم خیال بھی تھے۔ آپ اعلیٰ درجہ کی عبقری شخصیت کے حامل تھے، اردو، انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے، آپ ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے، لیکن شاعری کا بیشتر سرمایہ ضائع ہوگیا۔

مولانا نے اپنی یادگار میں کوئی تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن ان میں وہ صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک اچھے مصنف میں پائی جاتی ہیں۔ آپ علامہ شبلی کے خاص شاگرد تھے، ان کے انداز فکر اور اسلوب بیان کی جھلکیاں آپ کے کلام میں جابجا نظر آتی ہیں۔

مولانا اقبال احمد خاں سہیل کو اپنے استاد مکرم سے قلبی لگاؤ تھا اس وجہ سے آپ دارالمصنفین برابر آیا کرتے تھے، یہاں مولانا کی ملاقات مولانا عبدالسلام ندوی سے بھی ہوا کرتی تھی چونکہ دونوں مزاجاً شعری وادبی ذوق کے ساتھ فکر شبلی کے حامل بھی تھے، آپ کے کلام میں ظریفانہ پہلو زیادہ تھا اس وجہ سے اہل ذوق آپ کے گرد حلقہ بنا لیتے، جہاں جاتے محفل سج جاتی۔ اس بات کی تصدیق مولانا شاہ معین الدین ندوی کے اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

''اکثر بیشتر آنے والوں میں مولانا اقبال احمد خاں سہیل..... تھے اقبال سہیل اور ان کے کلام سے صاحب ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے وہ بڑے لائق، ذہین، طباع اور خوش گفتار تھے ان کی گفتگو علم وادب، لطائف وظرافت کا زعفران زار ہوتی تھی، جب بھی آجاتے تھے تو لطف ولطائف کا ایک گلستاں کھل جاتا تھا''

(حیات سلیماں،ص:633)

جیسا کہ ماقبل سطور میں یہ بات آچکی ہے کہ آپ شاعر بھی تھے، ان کا نمونہ کلام جو انھوں نے اپنے استاد علامہ شبلی کے انتقال پر ان کے شایانِ شان کہا ملاحظہ فرمائیں، اس سے مولانا کے شعری ذوق کا پتا چلتا ہے۔

کیجیے نہ غم شکست یا مولانا
اس میں بھی حکمت خدا ہے دانا
تھی اہل عدم کو آرزوئے پابوش
ایک پاؤں وہاں بھی چاہیے تھاجانا

اس موقعے پر مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی رباعی لکھ کر پیش کی جن کی سخن سنجی مسلم تھی رباعی کا آخیر مصرعہ ملاحظہ ہو: ہمت کا قدم زمیں میں اب گاڑ چکے۔

(حیات شبلی،ص:469)

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالسلام ندوی کے ان اہل بصیرت اور دانشور معاصرین میں سے ہیں جن سے اکثر محققانہ اور فلسفیانہ باتیں ہی ہوا کرتی تھیں، جن کا اندازہ ان کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو انھوں نے جنوری 1956 کو دارالمصنفین اعظم گڑھ سے بنام مولانا ابوالکلام آزاد ارسال کیا۔ اس میں انھوں نے جن پیچیدہ مسائل کو اٹھایا ہے اس سے دونوں کی علمی جہتوں اور معاصرانہ مباحثوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''...میرا دماغ فلسفیانہ واقع ہوا ہے، تاریخ اخلاق اسلامی جلد دوم میں فلسفیانہ مباحث سامنے آئے ہیں کہ مسلمانوں کے اخلاق پر مختلف علوم وفنون مثلاً فلسفہ، حدیث، فقہ علم کلام وغیرہ کا اثر پڑا، مختلف فرقوں کے نظریات نے ان کے اخلاق پر کیا اثر ڈالا؟ معتزلہ، خوارج، اشاعرہ، شیعہ وغیرہ کے اخلاق نے کس قسم کا نظام اخلاق قائم کیا؟ مقام مقدسہ کی زیارت وعقیدت نے مسلمانوں کے اخلاق کو کس قدر متاثر کیا؟ یہ فلسفیانہ سوالات ہیں اور مسلمانوں کی تاریخیں، ان کے تذکرے اس کا تشفی بخش، بلکہ غیر تشفی بخش جواب بھی نہیں ہیں''

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں،ص:115)

13/جولائی 1912 کو مولانا آزاد نے، عوام میں سیاسی، سماجی، علمی، مذہبی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے 'الہلال' شائع کیا مولانا عبدالسلام ندوی نے اس پرچہ کی آبیاری ہی نہیں کی بلکہ چار چاند لگادیے۔ آپ کی آمد سے اس میں ایک کالم 'فلسفہ' کا اضافہ کیا گیا، اس میں مولانا کے سلیس وشگفتہ نقوش ہوتے تھے گو'الہلال' کی پالیسی کی وجہ سے آپ کا نام نہیں ہوتا لیکن جوہر شناس آپ کے مربی علامہ شبلی نعمانی اس تحریر کو پڑھ کر بھانپ جاتے اس کا اظہار علامہ شبلی نے خود کیا ہے:

''تمہارے (عبدالسلام ندوی) مضامین دیکھتا ہوں، مولوی ابوالکلام آزاد صاحب اجازت دیں تو نام لکھا کرو، ایسے مضامین گمنام ٹھیک نہیں اس لیے کیا فائدہ کہ ایک شخص کی زندگی گم ہوجائے''

(سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی جلد دوم،ص:153)

مولانا نے قیام رانچی کے دوران 'البلاغ' کے مضامین کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی اور خاص طور پر مولانا عبدالسلام ندوی کو سید صاحب کے حوالے سے ایک مکتوب ارسال کیا جس میں انھوں نے دونوں حضرات کو مضامین لکھنے پر زور دیا اور عبدالسلام ندوی کو بطور خاص کہ اگر وہ اس پر معاوضہ بھی لیں تو میں راضی ہوں اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں سردست رانچی آگیا ہوں 'البلاغ' جاری رہے گا آپ.... کم سے کم اتنا کیجیے کہ ہر دو ہفتہ میں ایک مضمون بقدر آٹھ کالم کے بھیج دیا کیجیے اور مولوی عبدالسلام صاحب سے کہیے کہ یا تو علمی ذوق سے لکھیں یا معاوضہ لیں، میں ہر طرح تیار ہوں....''

(سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی، جلدی دوم، ص:152)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو مولانا عبدالسلام ندوی کی تحریر پر حد درجہ اعتماد و وثوق تھا۔

اردو ادب میں جن چند سرمایہ ناز ہستیوں کا نام لیا جاتا ہے ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذات بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کے علمی وقلمی رفقا میں مولانا شبلی، عبدالحلیم شرر، مولانا آزاد، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا عبدالسلام ندوی کے ان رفقاء کار میں سے ہیں جو مختلف مباحث میں ایک دوسرے کے معاون نظر آتے ہیں۔ جب مولانا عبدالسلام ندوی نے طلبہ ندوہ کی موافقت اور اسٹرائک کے جواز پر قرآن، احادیث اور اقوال صحابہ پر ایک مدلل مباحث تیار کیے، وہیں اس مباحث کو عصری تقاضے سے ہم آہنگ اور مربوط کرنے کی غرض سے انگریزی مآخذ کے لیے جو مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادی لکھا اور مولانا کے سوالات اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے جوابات سے دونوں کی علمی گہرائی وگیرائی کا پتا چلتا ہے جس کی تائید مولانا کے اس اقتباس سے ہوتی ہے:

''جواز اسٹرائک پر ایک فتویٰ لکھ رہا ہوں، 40 صفحے کامیابی کے ساتھ ہو گئے ہیں آپ سے انگریزی ماٰخذ کے متعلق حسب ذیل امداد توقع ہے:

- یورپ میں تعلیمی اسٹرائک کی تعداد کیا تھی؟
- تحقیقات کے ذریعے رفع شکایت کا طریقہ، اخراج اساتذہ
- ماہرین تعلیم یورپ کی جواز و عدم اسٹرائک پر رائے، نام کتاب، نام مصنف حوالہ صفحہ بھی ضروری ہے''

اسی طرح کے اور پیچیدہ سوالات جو دوسرے خط میں بھی ملتے ہیں:

''آپ انسائیکلوپیڈیا سے مہر، طلاق وغیرہ کے متعلق دوسرے مذاہب اور قوموں میں جو رسم و رواج ہوں اس سے مجھے مطلع فرمایئے، صرف ضروری خلاصہ درکار ہے'' (10 جولائی 1913ء)

''مہر کی ابتدا کب ہوئی؟ کن اسباب سے ہوئی؟ کن قوموں میں مہر مرد کو دینا ہوتا ہے اور کن قوموں میں عورت کو؟ عورت کو مہر دینے سے تمدن پر اور اس کے ذات پات پر کیا اثر پڑتا ہے؟'' (28 جولائی 1913)

''اگر مال غنیمت کے اصول، حقیقت، تاریخ، مقاصد سے مطلع کر سکیں تو مہربانی ہوگی، یہ کس حق کی بنا پر لیا جاتا ہے؟ اور مذہبی پیشوا جو زخارف دنیوی کے لیے نہیں لڑتے ہیں اس کو ہاتھ کیوں لگاتے ہیں''

(دفتر الہلال، 16 اکتوبر 1916)

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا جب کسی موضوع پر لکھنا چاہتے تو اس کے لیے ہر ممکن دلائل کی تیاری کر لیتے، اگر دلائل تک رسائی گرفت سے باہر ہوتی تو اس میں اپنے دوستوں سے بھی تعاون لیتے تاکہ قارئین و سامعین کو ہر طرف سے مطمئن کر دیں، اگر فریق مخالف ہے تو اس کو لاجواب اور سکتہ میں ڈال دیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ندوی گرچہ دونوں عمر میں چھوٹے بڑے تھے؛ لیکن بے تکلفانہ پہلو کہیں زیادہ ہی غالب تھا، جس کی تصدیق مولانا ہی کی ایک تحریر سے ہوتی ہے:

''میں اب معاملہ عبدالکریم کے متعلق بہت کچھ لکھوں گا، اور چونکہ گفتگو مجادلانہ ہوگی اس لیے انشاء پردازی کا خیال کم رہے''۔ مزید برآں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''میں نے ظل السلطانی میں جو بھوپال سے نکلتا ہے بیگم بھوپال کی ایک کتاب پر ریویو لکھا ہے، صرف لفاظی ہے اور کچھ نہیں، انشاء پردازی کی حیثیت سے اس کو ملاحظہ فرمائیں'' (مکاتیب شبلی جلد دوم)

مذکورہ تحریر سے پتا چلتا ہے کہ دونوں کی قلبی رفاقت نہایت صاف شفاف اور تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مولانا عبدالسلام ندوی کے ان رفیق کاروں میں سے ہیں جنہوں نے مولانا کے ساتھ انیس سال تک ایک ہی علمی تحقیقی ادارہ میں شب و روز گزارے، شاید ہی یہ شرف آپ کے کسی اور رفیق کو حاصل ہو۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ان مایہ ناز مورخین ہندستان میں سے ہیں جنہیں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندستانی تاریخ کے ماہر 'ہندستانیات' تھے جس کا اعتراف مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی تھا جیسا کہ ان کے مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے:

''...... ہاں بھائی اب پورے عزائم کے ساتھ تاریخ ہند کے سلسلہ کو جاری رکھو۔'' ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''میں تو چراغ سحر ہوں، شاہ معین الدین احمد صاحب دارالمصنفین کے دوسرے کاموں میں لگیں گے، اب تم ہی کو تاریخ ہند کے سلسلہ کو مکمل کر کے ان کے چھپوانے کا انتظام کرنا ہے۔''

(حیات سلیمان، مکتوب بنام سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص: 427-425)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا عبدالسلام ندوی دونوں فکر شبلی کو اوڑھے ہوئے تھے، جس کا ثبوت دونوں نے اس طور پر دیا کہ زندگی کی آخری سانس بھی اسی چہار دیواری میں یعنی دارالمصنفین ہی کے احاطے میں لی۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا عبدالسلام ندوی کا خاص موضوع تاریخ ہی تھا، مولانا کا تاریخی شعور ادبی تاریخ میں 'شعر الہند' کے حوالے سے منظر عام پر آتا ہے تو وہیں سید صاحب کی متعدد کتابیں تاریخ ہند کے بیش بہا خزانہ میں اضافہ کرتی ہیں آپ کی کتاب 'ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں' 1966 میں منصۂ شہود پر آئی جس میں ہندستان میں بسنے اور پیدا ہونے والے غیر ملکی نسل کے مسلمانوں کی ہندستان کی سرزمین سے وابستگی اور اس سے محبت کا ذکر کیا گیا ہے اور امیر خسرو کے ان مضامین کا بھی ذکر آ گیا ہے جن سے ہندستان کی خصوصیات اور یہاں کے سماج و معاشرہ پر روشنی پڑتی ہے، اور اس طرح کی بہت سی جزئیات نگاری ملتی ہے جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔

الغرض سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ہندستانی تاریخ کے ابواب اور گوشوں کی بازیافت کی ہے جہاں تک ان کے پیش رو نہیں پہنچ سکے۔ سید صاحب کی تاریخی و علمی تصانیف صرف تعداد ہی نہیں بلکہ کیت و کیفیت دونوں میں یکساں ہیں، بقول مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ:

''ان کی تصنیفات کی تعداد پچاس کے قریب ہوتی ہے جن کے مجموعی صفحات دس ہزار (10000) سے کم نہیں، یہ تو ان کی تصنیفات و صفحات کی کمیت (Quantity) کا معاملہ ہے؛ لیکن جہاں تک ان تصنیفات کے موضوعات عصر حاضر کے تقاضے کی تکمیل کی اہمیت ان کے مواد و مضامین کی قدر و قیمت اور ان کتابوں کی افادیت اور ان کے ذریعے سے وقت اور ملک و ملت کی ضرورت اور مسائل کی اہمیت (Quality) کا تعلق ہے، وہ کمیت سے بھی فزوں تر ہے، اور تعداد تصنیفات و صفحات سے بھی اہم تر ہے''

(پرانے چراغ، جلد دوم، ص: 198)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مولانا عبدالسلام ندوی کے ان معاصرین میں سے تھے جنہوں نے مولانا سے بہت کچھ حاصل کیا جیسا کہ سید صاحب خود رقم طراز ہیں:

''یقیناً ان کے (عبدالسلام ندوی) علمی سائے میں پلا اور بڑھا اور ان کی علمی دیدہ وری، ادبی نقطہ پروری اور قلمی گرہ کشائی سے بہت کچھ سیکھا اور فیض پایا۔''

(بزم رفتگاں، جلد اول، ص: 255)

سید صاحب مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی تفوق، وسعت مطالعہ عبارت فہمی کی گیرائی و گہرائی کو دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سید سلیمان مرحوم بھی جب کسی عربی یا فارسی عبارت کے سلسلہ میں الجھتے تو اس کی وضاحت بلا تکلف مولانا (عبدالسلام ندوی) سے کراتے۔''

(مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں، ص: 43)

من حیث المجموع متذکرہ بالا معاصرین کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی گوشۂ گمان کی ایک ایسی عظیم عبقری شخصیت ہیں جو علامہ شبلی نعمانی کے سچے جانشیں کے ساتھ ساتھ شخصیت ساز بھی ہیں، انھوں نے اپنے علمی، ادبی، تاریخی، فلسفیانہ اور انتقادی تخلیقات کے ذریعے اردو زبان و ادب کے سرمایے میں ایک وقیع اضافہ کیا ہے، اس بڑے کارنامے کی وجہ سے مولانا کل بھی زندہ تھے آج بھی زندہ ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہیں گے۔

■

Obaidullah Haroon
Research Scholar, Department of Urdu, School of Humanities, Men's Hostel "K"Room no:119.
P.O:Central University, University of Hyderabad, Gachibowli, Hyderabad-46
e-mail:obaidullah31@gmail.com-mob:8790839099

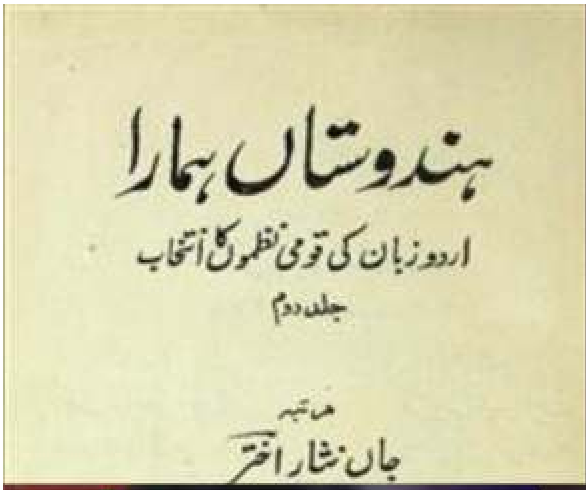

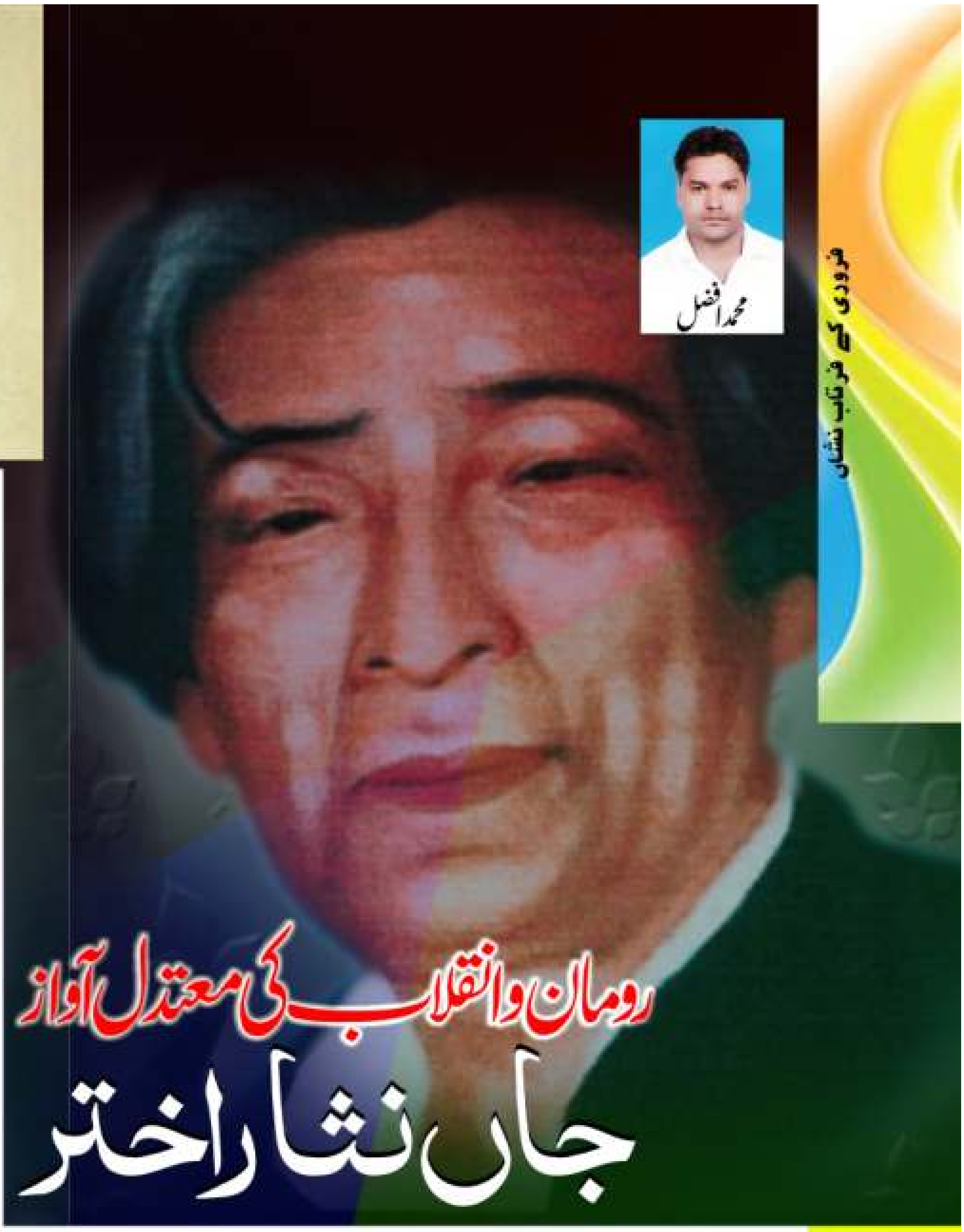

محمد افضل

رومان وانقلاب کی معتدل آواز

جاں نثار اختر

ہندوستان کے ادبی منظرنامے پر جتنی بھی ادبی تحریکات منظر عام پر آئیں ان میں ترقی پسند تحریک سب سے مختلف تھی۔ مختلف ان معنوں میں کہ اس سے پہلے جو تحریکات وجود میں آئیں ان کا کوئی منظم لائحہ اور اصول وضوابط نہ تھے۔ لیکن ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک باقاعدہ لائحہ عمل تھا جس پر کاربند ہونا اس تحریک سے وابستہ فن کاروں کے لیے لازمی تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ذریعے ادب میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ فکر وفن کی سطح پر ادب میں اظہار کے لیے اصول وضوابط متعین کیے گئے اور فن کاروں کو انھیں اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنی فن کارانہ صلاحیتوں اور جذبات و احساسات کا اظہار کرنے کی تاکید کی گئی۔ گذشتہ ادب کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ ''اصلیت اور حقیقت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔[1] اور ''نیا ادب وہ ہے جو زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک ،افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔''[2]

ترقی پسند ادبی تحریک کے زیر اثر جو موضوعات شاعری میں آئے وہ نسبتاً نئے تھے لیکن اس دور کے مخصوص حالات نے ان کو اور اچھوتا بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی شاعری میں ہمیں یہ موضوعات غالب نظر آتے ہیں۔

ترقی پسند ادبی تحریک نے ادب میں ادب برائے زندگی کے تصور کو فروغ دیا اور یہ کہا گیا کہ ادب کو عوام اور اجتماعی زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے۔ ترقی پسند تحریک نے زندگی کی طبقاتی کشمکش اور انسان دوستی کا ایک نیا اور صحت مند تصور عطا کیا ساتھ ہی ملک کی آزادی کا ایک نیا عزم بھی دیا۔ اس تحریک کے ان اصول وضوابط کا اثر ادب پر یہ ہوا کہ شاعر وادیب موضوع اور مواد کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگے۔ چنانچہ اس کے آغاز کے ساتھ جہاں شعر و ادب کے بنیادی تصورات میں واضح تبدیلیاں نظر آتی ہیں وہیں اس تحریک سے منسوب زیادہ تر ادبی سرمایہ یک رنگی اور پروپیگنڈہ کا شکار بھی نظر آتا ہے۔ فکر کو فن پر ترجیح دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ایسے فن کار جو ابتدا میں ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے سامنے تو آئے لیکن بعد میں ان کی حیثیت قابل ذکر نہ رہی اور وہ گمنام ہو گئے۔ ترقی پسند شعری سرمائے کا جائزہ لیتے ہوئے خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک نے اپنے پچاس سالہ دور میں اردو زبان کے شعری سرمائے میں جو کچھ اضافہ کیا ہے اسے اگر تخلیق ادب کے اعلیٰ فنی اور جمالیاتی معیار پر جانچا جائے تو اس کا بہت کچھ حصہ نارسیدہ اور ناتراشیدہ ہونے کے سبب سے ناقابل اعتنا قرار پائے گا اور چند مخصوص شعرا کا کلام ہی باقی رہے گا جن کی مستقل ادبی حیثیت ہے اور جن کی تخلیقات اپنے گرد فکر وفن کا ایسا روشن ہالہ رکھتی ہیں جنھیں بدلتے ہوئے زمانے کی رو بھی بے نور نہیں کر سکتی۔''[3]

ترقی پسند تحریک سے وابستہ نمائندہ شعرا میں جنھوں نے اپنی شاعری کو نظریاتی انتہا پسندی سے محفوظ رکھا جس کے باعث وہ اس دور میں بھی ترقی پسند شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے بھی نمائندہ شاعر تھے اور آج بھی ہیں، ان میں ایک نام جاں نثار اختر کا بھی ہے۔

شاعری انسانی جذبات واحساسات کے اظہار کا نام ہے جو الفاظ کی مخصوص ترتیب اور انتخاب کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ یہی جذبات واحساسات کبھی رومان تو کبھی انقلاب کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس کا تعین زندگی اور زمانے کے حالات کرتے ہیں جو مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ جاں نثار اختر کی شاعری بھی رومان اور انقلاب کا ایک حسین امتزاج ہے جو لطافت اور حرارت ایک ساتھ فراہم کرتی ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری کے معتدل رویے کا پتہ ان کی شاعری میں برتے گئے

موضوعات سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ عام طور پر شعرا کے یہاں زیادہ سے زیادہ ایک رجحان غالب نظر آتا ہے اور باقی موضوعات ضمنی حیثیت رکھتے ہیں جو کلام میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ جاں نثار اختر کی شاعری میں دو غالب رجحان ایک ساتھ نظر آتے ہیں جنھیں رومان اور انقلاب کا نام دیا جا سکتا ہے۔

کوئی بھی فن پارہ اپنے محرک کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ ہر فن پارے کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے جس کے زیر اثر اس کے وجود کی تشکیل ہوتی ہے۔ میری نظر میں جاں نثار اختر کی شاعری کے دو نمایاں محرک ہیں ،ایک وطن اور اس کی آزادی اور دوسرا ان کی روزمرہ اور ازدواجی زندگی جنھیں بالترتیب خارجی اور داخلی زندگی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جاں نثار کی شاعری انھیں دو محرکات کے درمیان پہلو بدلتی نظر آتی ہے۔ جب ان کا ذہن وطن کی طرف مائل ہوتا ہے تو شمع سخن غلامی، انقلاب، اشتراکیت، جمہوریت، عدم مساوات، نظام کی فرسودگی وغیرہ کی جانب ہوجاتی ہے۔ 'روس کو سلام'، 'استالن'، 'مورخ سے'، 'ستاروں کی صدا'، 'ریاست' اور 'دانائے راز' جیسی نظمیں اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند بند ملاحظہ ہوں:

جویائے راز

کیا یہی ہے دہر کا نظم وقبول اجتماعی زندگانی کا اصول؟

دانائے راز

فطرتی آئین عالم گیر ہے
کل مظاہر کی یہی تقدیر ہے
ہے وہی فطرت کا قانونی تضاد اجتماعی
مختلف طبقات کا باہم اجتہاد
زندگی کا ہر نظام
آشنا تغییر سے ہے صبح وشام
کیف وکم کا تبدل دفعتاً
بن گیا انقلابوں کا چلن
موت کے پنجے میں ہے ایسا نظام
جن کو ہو فکر سکوں فکر قیام
جن کے آگے کوئی مستقبل نہیں
اس کو حق زندگی حاصل نہیں
ارتقا کی زندگی ممنون ہے
ہاں یہی تاریخ کا قانون ہے
سازِ نو میں نغمہ جمہور ہے
زندگی آزاد ہے مسرور ہے

دانائے راز (ایک مکالمہ)

شاعری انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے جو الفاظ کی مخصوص ترتیب اور انتخاب کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔یہی جذبات و احسات سا کبھی رومان تو کبھی انقلاب کی شکل اختیار کر تے ہیں۔اس کا تعین زندگی اور زمانے کے حالات کرتے ہیں جو مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ جاں نثار اختر کی شاعری بھی رومان اور انقلاب کا ایک حسین امتزاج ہے جو لطافت اور حرارت ایک ساتھ فراہم کرتی ہے۔جاں نثار اختر کی شاعری کے معتدل رویے کاپتہ ان کی شاعری میں برتے گئے موضوعات سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

جاں نثار اختر کی سیاسی وانقلابی شاعری ترقی پسند شعری نظریے کی ترجمانی ضرور کرتی ہے لیکن اس میں وہ ترقی پسند تحریک کے مبلغ کم اور انسان دوستی کے علمبردار کی حیثیت سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم 'آخری لمحہ' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کل تم جو بڑی ہو جاؤ گی جب تم کو شعور آجائے گا
کتنے ہی سوالوں کا دھارا احساس سے ٹکرا جائے گا
سوچو گی کہ دنیا طبقوں میں تقسیم ہے کیوں یہ پھیر ہے کیا؟
انسان کا انساں بیری ہے یہ ظلم ہے کیا اندھیر ہے کیا
یہ نسل ہے کیا یہ ذات ہے کیا یہ نفرت کی تعلیم ہے کیوں
دولت تو بہت ہے ملکوں میں دولت کی غلط تقسیم ہے کیوں
تاریخ بتائے گی تم کو انساں سے کہاں پر بھول ہوئی
سرمائے کے ہاتھوں لوگوں کی کس طرح سے محنت دھول ہوئی
صدیوں سے برابر محنت کش حالات سے لڑتے آئے ہیں
چھائی ہے جو اب تک دھرتی پر اس رات سے لڑتے آئے ہیں
لیکن یہ لڑائی ختم نہیں یہ جنگ نہ ہوگی بند کبھی
سو زخم بھی کھا کر میداں سے ہٹتے نہیں جرأت مند کبھی
وہ وقت کبھی تو آئے گا جب دل کے چمن لہرائیں گے
مرجاؤں تو کیا مرنے سے مرے، یہ خواب نہیں مرجائیں گے
یہ خواب ہی میری دولت ہیں یہ خواب تمھیں دے جاؤں گا
اس دور میں جینے مرنے کے آداب تمھیں دے جاؤں گا
(آخری لمحہ)

محولہ نظم کے مندرجہ بالا اشعار اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ جاں نثار اختر ملک میں امن وامان، مساوات اور انسان دوستی کے متمنی تھے۔ ان کے نزدیک ہر وہ شے احسن ہے جو زندگی میں حسن ،لطافت اور توانائی پیدا کرتی ہے اور وہ تمام چیزیں جو اس تصور کی مخالف ہیں ان کی وہ مخالفت کرتے ہیں لیکن اس احتجاج اور مزاحمت میں بھی ان کا لہجہ غیر معتدل نہیں ہوتا۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''اختر انسان دوستی کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں وہ ان قدروں کو عزیز رکھتے ہیں جن سے زندگی میں حسن، لطافت اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ تمام چیزیں جو ان قدروں کی مخالف ہیں انھیں اظہار نفرت پر مجبور کرتی ہیں مذہبی منافرت فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وغارت کے مہیب واقعات نے ان سے کئی نظمیں لکھوائی ہیں۔ آزادی کے فریب نے ان کے تخیل کو مہمیز کیا ہے لیکن ان کا لہجہ غیر معتدل اور انداز بیان غیر سنجیدہ نہیں ہونے پایا۔''4

جاں نثار اختر کی شاعری کا دوسرا غالب رجحان رومان سے عبارت ہے۔ یہ ان کی داخلی یا ازدواجی زندگی اور روزمرہ کے مسائل کا اظہار ہے۔ گھر آنگن کی رباعیاں اس کی بین دلیل ہیں۔ مثال کے طور پر چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

یہ تیرا سجاؤ، یہ سلیقہ یہ سروپ
لہجے کی یہ چھاؤں ،گرم جذبوں کی یہ دھوپ
سیتا بھی شکنتلا بھی ،رادھا بھی تو ہی
یگ یگ سے بدلتی چلی آئی ہے روپ

میں ان کا سکھی ہاتھ بٹا سکتی ہوں
حالات کو ہموار بنا سکتی ہوں
وہ بوجھ اٹھائیں گے اکیلے کب تک
میں خود بھی تو کچھ بوجھ اٹھا سکتی ہوں

نا مرادی کے بعد بے طلبی
اب ہے ایسا سکون جینے میں
جیسے دریا میں ہاتھ لٹکائے
سو گیا ہو کوئی سفینے میں

جاں نثار اختر کی داخلی شاعری میں نئے دور کے انسان کا درد وکرب ،خوف وہراس ،شادمانی ومسرت، مصیبتیں اور آزمائشیں، تمنائیں وخواہشیں،عشرتیں وآسائشیں اپنے تمام تر مظاہر کے ساتھ نظر آتی ہیں:

کسے پتہ ہے کہ دنیا کا حشر کیا ہوگا
کبھی کبھی تو مجھے آدمی سے ڈر سا لگے

میں جب بھی اس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو برا لگے ہے مجھے

جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے لچک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

زندگی یوں تو نہ بانہوں میں چلی آئے گی
غم دوراں کے ذرا ناز اٹھا ؤ یارو

میں زندگی میں بڑی دور تک چلا آیا
کسی کے غم نے بڑا آسرا دیا ہے مجھے

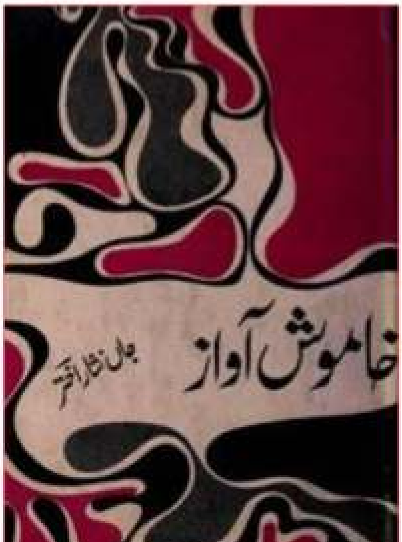

ان اشعار سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ جاں نثار اختر رومان میں اسی حد تک گم ہوتے ہیں کہ عصری حسیت کا ہوش باقی رہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں اعتدال نظر آتا ہے۔ یہ اعتدال کچھ بے سبب نہیں بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی ذاتی زندگی کے تجربات ہیں جن کو انھوں نے روداد جہاں بنا دیا۔ جاں نثار اختر کو اپنی بیوی صفیہ سے بے حد محبت تھی، جس کی وجہ سے 'گھر آنگن' کی رباعیاں، 'خاک دل' اور 'خاموش آواز' جیسی بے مثال نظمیں وجود میں آئیں جو ان کی شاعری کا نقطہ تبدل وعروج ثابت ہوئیں۔ شخصی مراثی اور رثائی نظموں کی مثالیں اردو شاعری میں بہت ملتی ہیں لیکن ایسا کم ہی ہوا ہے کہ انفرادی غم کو اس طرح پیش کیا گیا ہو کہ وہ اجتماعی بن گیا ہو۔ 'خاک دل' اس کا بہترین نمونہ ہے:

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن!
تیرے گہوارہ آغوش میں اے جان بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کیے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کیے جاتا ہوں

دفن ہے دیکھ مرا عہد بہاراں تجھ میں
دفن ہے دیکھ مری روح گلستاں تجھ میں
میرے گل پوش جواں سال امنگوں کا سہاگ
میری شاداب تمنا کے مہکتے ہوئے خواب
میری بیدار جوانی کے فروزاں مہ و سال
میری شاموں کی ملاحت، مری صبحوں کا جمال
میری محفل کا فسانہ، مری خلوت کا فسوں
میری دیوانگی شوق، مرا ناز جنوں
میرے مرنے کا سلیقہ، مرے جینے کا شعور
میرا ناموس وفا، میری محبت کا غرور
میری نبضوں کا ترنم، مرے نغموں کی پکار
میرے شعروں کی سجاوٹ، مرے گیتوں کا سنگھار
لکھنؤ اپنا جہاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا ہر خواب جواں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا سرمایہ جاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
لکھنؤ! میرے وطن، میرے چمن زار وطن!

(خاک دل)

محولہ نظم کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صرف ایک شخص کا غم نہیں ہے بلکہ اس میں ہر اس شخص کا غم شامل ہے جو اس مرحلہ سے گزرا ہے۔ شاعر کی ذاتی آواز اپنی تمام تر کیفیات کے ساتھ اجتماعیت کے پیکر میں جلوہ گر ہے۔ لہجے کا رچاؤ اور سوز و گداز دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک نظم 'خاموش آواز' ہے جو صفیہ کے انتقال کے ایک سال بعد کہی گئی۔ 'خاموش آواز' اپنے تاثر کے لحاظ سے 'خاک دل' سے بھی زیادہ دلفریب ہے۔ اس کا طرز اظہار قاری یا سامع کو پوری شدت کے ساتھ اپنی جانب متوجہ کرتا ہے:

کتنے دن میں آئے ہو ساتھی
میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اس ایک برس میں
کیا کیا بیتی تم پہ نہ جانے

دیکھو کتنے تھک سے گئے ہو
کتنی تھکن آنکھوں میں گھلی ہے
آؤ تمہارے واسطے ساتھی
اب بھی مری آغوش کھلی ہے

اتنے دن کے بعد کہیں تم
آئے ہو ساجن میرے دوارے

آج اندھیرے انگنا مورے
ناچ اٹھے ہیں چاند ستارے

آؤ میں تم سے روٹھ سی جاؤں
آؤ مجھے تم ہنس کے منا لو
مجھ میں سچ مچ جان نہیں ہے
آؤ مجھے ہاتھوں پہ اٹھا لو

آؤ میں الجھے بال سنواروں
مجھ سے کوئی کام تو لے لو
پھر سے گلے اک بار لگا کے
پیار سے میرا نام تو لے لو

اچھا ساتھی! جاؤ سدھارو
اب کے اتنے دن نہ لگانا
پیاسی آنکھیں راہ تکیں گی!
ساجن جلدی لوٹ کے آنا

(خاموش آواز)

مندرجہ بالا بند جذبے کی صداقت اور شاعر کی فنکارانہ صلاحیتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ نظم کی فضا جذبوں کی لطافت اور حلاوت سے مملو ہے۔ غم کا اظہار موج تہ نشیں کی طرح موجود ضرور ہے لیکن حاوی نہیں ہے۔ لہجے میں شائستگی بھی ہے اور متانت بھی۔ لفظوں کے برجستہ و برمحل استعمال نے نظم کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

مختصر یہ کہ جاں نثار اختر کی شاعری اپنے فکر وفن کے اعتبار سے ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف انقلاب اور آزادی کے نعرے اور نغمے سنائی دیتے ہیں وہیں دوسری طرف گھر آنگن کے گیت اور محبت و امن کا پیغام بھی سنائی دیتا ہے۔

حوالے:

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی، ص 47، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 2008
2۔ ایضاً ص 48
3۔ ایضاً ص 125
4۔ تلاش فردا کا شاعر از احتشام حسین، بحوالہ رسالہ فن اور شخصیت نمبر، جاں نثار اختر نمبر، ص 40، جلد 1، شمارہ نمبر 3-2، مارچ 1976

■

Mohd Afzal
Research Scholar, Dept of Urdu
Allahabad University
Allahabad - 211002
Mob.: 0969662678

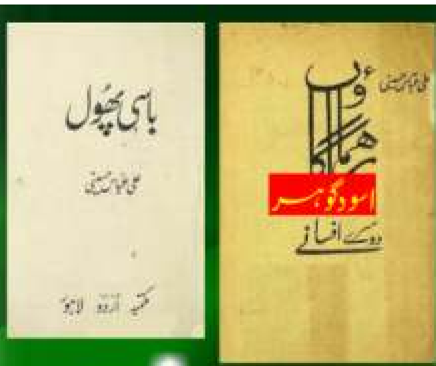

علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری

علی عباس حسینی (3 فروری 1897۔ 27 ستمبر 1969) بحیثیت افسانہ نگار اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے رفیق تنہائی، باسی پھول، میلہ گھومنی، آئی سی ایس، ایک حمام میں، ہمارا گاؤں، کچھ نہیں ہے، سیلاب کی راتیں اور 'ندیا کنارے' اپنے موضوع اور اسلوب کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ 1918 میں علی عباس حسینی نے پہلا افسانہ 'پژمردہ کلیاں' کے عنوان سے لکھا تھا جو بہت بعد میں ماہنامہ 'زمانہ' میں دسمبر 1925 میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ فنی اعتبار سے کمزور نظر آتا ہے کیونکہ اس میں جذباتیت کا عنصر غالب ہے۔ اصلاحی مقصد کے تحت لکھے گئے اس افسانے کا موضوع بیوہ عورت کی دوسری شادی ہے۔ افسانے کا پلاٹ اس طرح ہے کہ مرکزی کردار رشید، ہیروئین صابرہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے مگر صابرہ کی شادی کسی اور سے ہو جاتی ہے۔ دل ٹوٹنے کے بعد رشید شادی نہیں کرتا اسی طرح سات سال گزر جاتے ہیں کہ اچانک صابرہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ اب رشید، صابرہ سے شادی کی درخواست کرتا ہے مگر صابرہ اس کو چاہنے کے باوجود دوبارہ شادی کرنا غلط سمجھتی ہے۔

ترقی پسند تحریک سے قبل لکھے گئے ان کے اہم افسانوں میں رفیق تنہائی، مقابلہ، مغالطہ کی قیمت، بوڑھا اور بالا، پاگل، بندوں کی جوڑی، شہید معاشرت، انتقام، نئی ہمسائی، کنجی، زود پشیماں، ہار جیت، بہو کی ہنسی، جذبات لطیف، سکھی اور 'باغی کی بیوی' وغیرہ شامل ہیں۔ ان افسانوں میں دیہی زندگی کی عکاسی مقابلہ، پاگل، انتقام، کنجی اور 'ہار جیت' میں ملتی ہے۔ افسانہ 'پاگل' انسانی نفسیات پر مبنی ایک ایسا افسانہ ہے جس میں علی عباس حسینی نے معاشرے کے ظلم و جبر، اس کے ظاہری و بناوٹی اصولوں کی بہت عمدہ طریقے سے قلعی کھولی ہے۔ اسی طرح افسانہ 'انتقام' میں انھوں نے دیہاتی معاشرت کی اُس کڑوی سچائی پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے جہاں زمیندار نہ صرف اپنے آپ کو حاکم سمجھتا ہے بلکہ غریبوں اور اچھوتوں کی زندگیوں اور عصمتوں سے دل بہلانا اپنا حق سمجھتا ہے۔ انھوں نے دیہی عوام کی توہم پرستی کو بھی اس افسانے میں بڑے تیکھے انداز میں پیش کیا ہے اور زمینداروں کی بوالہوسی و نچلے طبقے کی عورتوں کی بے بسی کو دکھایا ہے۔ ساتھ ہی حسینی نے نرپتیا کے ذریعے وہم پرستی کے جذبات کو دکھایا ہے کہ کس طرح وہ اپنی بیوی سکھیا کی موت کا انتقام لیتا ہے۔ درج ذیل منظر کو ملاحظہ فرمائیے جب نرپتیا زمیندار کے گھر کا حصار کھینچ کر سفلی عمل کرتا ہے:

''ہر پانچ منٹ کے بعد کنستر پیٹتا اور یہی چیختا تھا۔ دہائی بچوں کی! دہائی سارے بھائیوں کی! دہائی ہندو مسلمان کی جمیندار ہمارا ستری کی اجت بگاڑس ہے۔ جمیندار ہماری مہریا کی جان لی ہس ہے! ہم جمیندار پر بھوت بلائب۔ ہم اُو پر مسان ہُکائب! کوئی ہم کو نہ روکے۔''[1]

دوسروں کی طرف ٹھاکر صاحب بھی توہم پرست تھے۔ نرپتیا کی آوازیں جیسے ہی ان کے کانوں میں پڑتی ہیں وہ ڈر جاتے ہیں انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ کیونکہ وہ اپنے بڑے بوڑھوں سے چماروں کے بھوتوں کو بلانے کے عمل کے بارے میں سن چکے تھے۔ لہٰذا اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب وہ بالکل محفوظ نہیں ہے۔

گاؤں کی سادہ و معصوم زندگی اور کھیت کھلیانوں کے دلفریب مناظر کے ساتھ عام شہریوں کے مسائل علی عباس حسینی کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی بدحالی سے چشم پوشی کے بجائے انھوں نے اسے موضوع بنا کر اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ علی عباس حسینی نے شہری اور دیہی دونوں ہی زندگیوں کی تصویریں یکساں خوبی کے ساتھ کھینچی ہیں۔ اپنے افسانوں میں انھوں نے دیہی طبقے کی خانگی زندگی کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے زمینداروں، سیٹھ، ساہوکاروں اور سماج کے ٹھیکیداروں کے جبر و ظلم کی بدولت کسانوں اور مزدوروں کی مفلسی اور ضعیف الاعتقادی کو افسانہ 'مقابلہ' میں پیش کیا ہے۔ زمینداروں کی جبراً لگان کی وصولی کے متعلق لکھتے ہیں:

''سوکھا پڑے، ٹڈیاں زراعت کھا جائیں۔ گائے بیل بک جائیں۔ تھالی کٹورا گروی رکھنا پڑے لیکن لگان وقت پر پہنچنا ضروری۔ سب کام رک سکتے تھے لیکن یہ قرض اُدھار لے کر کسی نہ کسی طرح سب سے پہلے ہو جانا لابدی تھا۔''[2]

مغالطہ کی قیمت، بندوں کی جوڑی، نئی ہمسائی، زود پشیماں، شہید معاشرت، جذبات لطیف، اور 'باغی کی بیوی' کے شہری زندگی سے متعلق افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں 'مغالطہ کی قیمت' اور 'بندوں کی جوڑی' صاف ستھرے اور سبق آموز افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں شامل مرکزی کردار بظاہر نیک، خوبصورت اور بھولے نظر آتے ہیں لیکن وہ آوارہ اور بدچلن ہوتے ہیں۔ انھیں عمدہ پوشاک اور قیمتی جواہرات سے عشق ہوتا ہے۔ 'مغالطہ کی قیمت' کا مرکزی کردار قمر بانو اپنے شوہر پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسے اصلی زیورات نصیب نہیں ہیں اس لیے وہ نقلی زیورات سے اپنا دل بہلا رہی ہے جبکہ اس کی موت کے بعد راز کھلتا ہے کہ یہ زیورات اصلی ہیں جن کی مالیت ایک لاکھ ساڑھے سات ہزار روپے ہیں۔ اسی طرح 'بندوں کی جوڑی' کا کردار مارگریٹ بھی جواہرات کے لالچ میں اپنے شوہر کا مال و اسباب لے کر چلی جاتی ہے اور جاتے وقت اپنے شوہر کے نام ایک خط چھوڑتی ہے کہ میں لکھنؤ جا رہی ہوں اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں لیکن تم سے زیادہ میں جواہرات کو پسند کرتی ہوں۔

شہری زندگی سے متعلق ایک اور افسانہ 'نئی ہمسائی' میں علی عباس حسینی نے ایک ایسی طوائف کا کردار پیش کیا ہے جس میں خودداری ہے، شرافت ہے اور محبت کے علاوہ نیک کام کرنے کا جذبہ بھی موجود ہے۔ افسانے کا پلاٹ اس طرح ہے کہ ایک طوائف، مشہود صاحب کی بے لوث خدمت کرتی ہے اور ان کے بچے کو بھی بہت پیار دیتی ہے۔ لیکن اس کے صلے میں مشہود صاحب اسے عزت نہیں دے پاتے۔ غفلت کی حالت میں کہتے ہیں:

''میرا بچہ اور بیسوا کی گود! بھیا اور ناپاک آغوش میں! میرا پھول اور نریئے پر! یہ اشرف سے ذلیل شخص سے ملنے کا نتیجہ ہے! ہائے ابا جان زندہ ہوتے تو کیا کہتے! کہتے گانے

بجانے والی رنڈی اور میرا گھر۔ مولویوں کا خاندان، مفتیوں کا گھرانا۔"[3]

اس افسانے کی رو سے علی عباس حسینی اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ایسے لوگ جنھیں سماج دائرہ انسانیت سے باہر سمجھتا ہے ان میں بھی ایثار و قربانی کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں شرافت بھی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا سماج ایک محدود سوچ رکھتا ہے اور ان کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے انھیں ذلیل قرار دیتا ہے۔ اس افسانے میں یہی بتایا گیا ہے کہ مشہود کی لعنت و ملامت طوائف کا دل توڑ دیتی ہے اور وہ اشرف سے بے پناہ محبت کرنے کے باوجود اس سے دوری بنالیتی ہے اور دوبارہ اپنے پرانے ماحول میں لوٹ جاتی ہے۔ جب اشرف اس سے نکاح کی بات کرتا ہے تو وہ انکار کردیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں بیسوا کے گھر میں پیدا ہوئی۔ بیسوا ہی بن کر رہ سکتی ہوں۔ شریف نہیں بن سکتی! خدا تو یہ قبول کرسکتا ہے مگر انسان نہیں بخش سکتا ہے، وہ اور اس کے قانون خدائی قانون سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

کردار نگاری کے لحاظ سے علی عباس حسینی کے افسانے بہت کامیاب ہیں۔ کردار نگاری کے فن سے وہ بخوبی واقف تھے جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں درد و کرب کی حزیں لہروں کا بھی احساس ملتا ہے۔ ان کے یہاں کرداروں کا بہت تنوع ملتا ہے۔ جو تہذیب اور معاشرت سے وابستہ ہیں۔ اس کی واضح مثالیں ان کے افسانے زود و پشیماں، شہید معاشرت، بنّی، بدلہ، حسن رہ گزر، سیلاب کی راتیں، رفیق تنہائی اور 'پہرے دار' ہیں۔ علی عباس حسینی کی کردار نگاری کا احاطہ کرتے ہوئے محمد طاہر فاروقی لکھتے ہیں:

"ان کے بیان میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی سیرت نگاری ہے۔ ان کے کردار بعض خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور وہی قصہ کی ارتقائی منزلوں میں قصہ کی تکمیل میں اور ہر جگہ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کردار کے سمجھنے اور سمجھانے میں نفسیات کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ علی عباس صاحب اس خیال کو پیش نظر رکھ کر افسانہ کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں جگہ جگہ پر نفسیاتی صداقت کی کمی تھی وہاں صرف اثر پیدا کرنا مد نظر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے افسانوں میں یہ کمی دور ہوگئی اور تجربے کے ساتھ ہی ساتھ کردار نگاری میں پختگی آگئی۔"[4]

افسانہ 'زود پشیماں' میں موجود کردار محمود خان کی شخصیت کو علی عباس حسینی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"محمود خان کا دل پتھر کا تھا اور جسم لوہے کا۔ وہ نہ کبھی درد و دکھ سے متاثر ہوتے اور نہ محنت و مشقت سے تھکتے۔ وہ ایک پتھر کی سِل تھے۔ جو نہ کبھی پستی اور نہ اس میں جونک لگ سکتی وہ ایک فولاد کی سلاخ تھے کہ جس میں نہ لچک تھی اور نہ لوچ۔"[5]

قارئین سے اپنے کرداروں کو متعارف کرانے کے لیے علی عباس حسینی عام فہم تشبیہات اور استعارات کا استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے قبل ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی پر بھی افسانے لکھے ہیں جو عوام میں کافی مقبول ہوئے اور رغبت کے ساتھ پڑھے گئے۔ ان افسانوں میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یکجہتی پر زور دیا اور انھیں باہمی تعلقات بہتر کرنے اور میل جول بڑھانے پر اکساتے ہوئے فرقہ وارانہ منافرت کے خلاف کھل کر لکھا تھا۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ صاحب اقتدار لوگوں کی سازشوں کا شکار ہوکر عوام میں نفرت پھیلائی جارہی ہے اور انھیں گمراہ کیا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے دھرتی ماں کے دونوں سپوت ہندو اور مسلمان میں باہمی نفاق پیدا ہوگیا ہے۔ قومی یکجہتی کے موضوع پر ان کا کامیاب افسانہ 'ماں کے دو بچے' ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے کلکتہ سے متعلق فسادات کی تباہی کو غیر متعصبانہ طور پر نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے کہ افسانہ میں موجود وحدت تاثر آخر تک برقرار رہتی ہے۔ بغض و حسد کے جذبہ کے خلاف لکھا ہوا یہ افسانہ اپنے اختتام پر انسانیت، محبت اور حب الوطنی کے جذبہ کا درس دیتا ہے۔ اس افسانے سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"دیکھو یہ بھارت ماتا کی گود میں دو بچے ہیں۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان...... یہ میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں۔ جب ان میں سے ایک پھوٹی تو کانی ٹھہری اور جب دونوں تو بالکل اندھی۔"[6]

علی عباس حسینی کے بیشتر افسانے ان کے عمیق مشاہدے، زندگی کے کڑوے کسیلے تجربوں اور احساس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں وہ اپنی ذاتی محرومیوں اور ناخوشگواری کے واقعات بھی بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آس پاس کے ماحول میں پھیلی ہوئی سماجی پیچیدگیوں کو محسوس کیا اور انھیں افسانوں میں اس ندرت سے بیان کیا کہ ان کے افسانے بے مثل فنکاری کا نمونہ بن گئے۔

ابتدا میں ان کے افسانے دیہاتی معاشرت تک محدود تھے لیکن بعد میں انھوں نے 'آم کا پھل'، 'کیا کیا جائے' اور 'بھوک' جیسے انقلابی حقیقت پسند افسانے بھی لکھے۔ ان کا فن ارتقائی ہے۔ وقت اور ماحول کے مطابق انہوں نے ترقی پسندوں اور جدت پسندوں کا ساتھ دیا اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہوئے اپنے افسانوں کی بنیاد رکھی۔ حسینی کے کرداروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ کردار ہندوستانی معاشرے کی فضا میں چل رہے ناسور کی پوری طرح عکاسی کرتے ہیں۔ علی عباس حسینی اپنے منفرد لب ولہجہ میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت جملوں سے اپنا مقصد قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ انھوں نے عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ سے اجتناب کرتے ہوئے ہندی کے سبک اور خوبصورت الفاظ کو اپنے افسانوں کے لیے پسند کیا۔ زبان و بیان اور اسلوب کی خوبیوں کی وجہ سے وہ اردو افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر حسینی کی گرفت زبان و بیان پر مضبوط نہ ہوتی تو وہ معاشرے میں پل رہے ان ناسور کو اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر نہ بکھیرتے۔ ان کے زیادہ تر افسانے نظریاتی اعتبار سے غریبوں، مزدوروں، بے کسوں اور پسماندہ طبقے کی حمایت میں لکھے گئے ہیں۔ جن میں سماجی مسائل، سیاسی لوٹ کھسوٹ، روزمرہ کی زندگی کی صعوبتوں سے جھوجھتے عوام، ذلتوں و پریشانیوں کو سہتے نچلے طبقے کے افراد اور زمینداروں کی مکاریوں اور بے رحمیوں تلے دبے کچلے انسان کے مسائل ہیں۔ ان کی زبان تصنع و بناوٹ سے پاک ہے۔ انداز بیان کی بے ساختگی و دلکشی قاری کو اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے۔ ہر پیشہ و ہر طبقے کی گفتگو کو حسینی نے بڑے فطری انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں محاورات اور تشبیہات کا استعمال بھی برمحل نظر آتا ہے۔ علی عباس حسینی کا اسلوب منفرد ہے۔ ان کا طرز بیان سادہ و عام فہم ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کی تکنیک بیانیہ ہے۔ اپنے پرکشش انداز بیان و سادہ اسلوب کی وجہ سے حسینی اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

حواشی:

(1) افسانہ 'انتقام' مجموعہ 'کچھ ہنسی نہیں ہے' از علی عباس حسینی ص 57
(2) علی عباس حسینی افسانہ 'مقابلہ' رسالہ 'نیرنگ خیال' عید نمبر (سالنامہ) فروری-مارچ 1929 ص 133
(3) علی عباس حسینی افسانہ 'نئی ہمسائی' رسالہ 'یادگار' جنوری-فروری 1934 ص 30
(4) نمائندہ مختصر افسانے از محمد طاہر فاروقی ص 26
(5) علی عباس حسینی افسانہ 'زود و پشیماں' رسالہ 'نیرنگ خیال' عید نمبر 1928 ص 182
(6) علی عباس حسینی افسانہ 'ماں کے دو بچے' رسالہ 'زمانہ' مارچ-1928 ص 309

■

Aswad Gowher
Plot No.: 66 Near Hashmi Masjid
Bismillah Colony
Aurangabad - 431001 (MS)

ڈاکٹر ذاکر حسین
صاحب طرز ادیب و خطیب

خیال انصاری

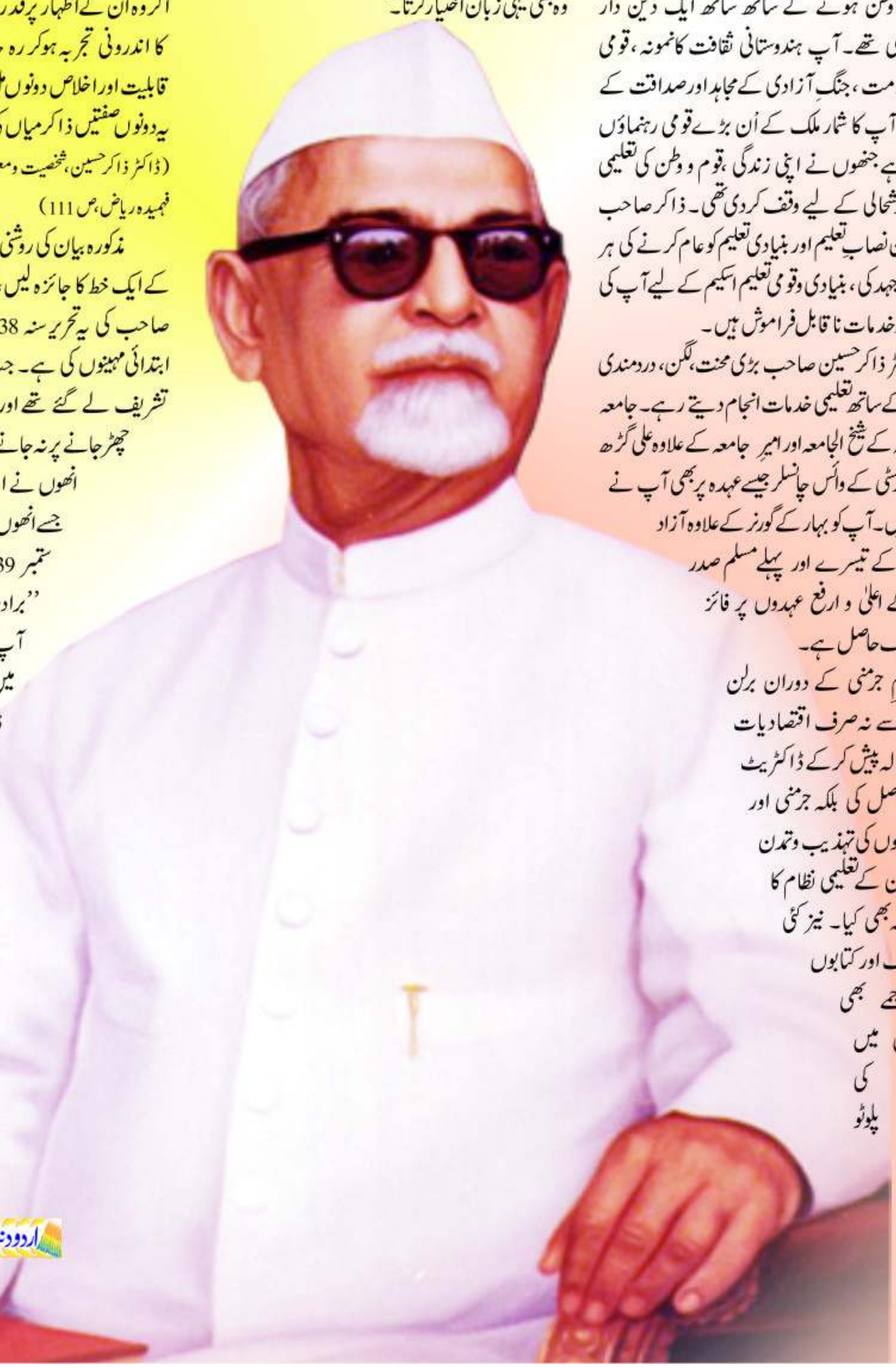

ڈاکٹر ذاکر حسین (پیدائش: 8 فروری 1897، وفات: 3 مئی 1969) نہ صرف ایک عظیم دانشور بلکہ شریف النفس انسان بھی تھے۔ آپ کی ساری زندگی تجربات سے پر تھی۔ آپ متین ماہر تعلیم، صالح رہبر اور سچے محبّ وطن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دین دار مسلمان بھی تھے۔ آپ ہندوستانی ثقافت کا نمونہ، قومی اتحاد کی علامت، جنگِ آزادی کے مجاہد اور صداقت کے پیکر تھے۔ آپ کا شمار ملک کے اُن بڑے قومی رہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی، قوم و وطن کی تعلیمی ترقی اور خوشحالی کے لیے وقف کردی تھی۔ ذاکر صاحب نے بہترین نصابِ تعلیم اور بنیادی تعلیم کو عام کرنے کی ہر ممکن جدو جہد کی، بنیادی و قومی تعلیم اسکیم کے لیے آپ کی رہنمائی اور خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بڑی محنت، لگن، دردمندی اور خلوص کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ اور امیرِ جامعہ کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جیسے عہدہ پر بھی آپ نے خدمات دیں۔ آپ کو بہار کے گورنر کے علاوہ آزاد ہندوستان کے تیسرے اور پہلے مسلم صدر جمہوریہ کے اعلیٰ و ارفع عہدوں پر فائز رہنے کا شرف حاصل ہے۔

قیامِ جرمنی کے دوران برلن یونیورسٹی سے نہ صرف اقتصادیات پر تحقیقی مقالہ پیش کرکے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی بلکہ جرمنی اور دوسرے ملکوں کی تہذیب و تمدن بالخصوص ان کے تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ بھی کیا۔ نیز کئی اہم تصانیف اور کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان میں افلاطون کی کتاب پلوٹو ریپبلک (Platos Republic) کا اردو ترجمہ اس مہارت سے کیا کہ 'مولانا سہیل' جوکہ کالج میں اپنی ذہانت، شاعری، تقریر اور قابلیت میں سب سے بلند سمجھے جاتے تھے بے اختیار کہہ اٹھے ''افلاطون کو اُردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔''

''ذاکر صاحب کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع اور اندازِ اظہار منفرد تھا۔ آپ نے کثرت سے سفر بھی کیے۔ آپ کی انشاء پردازی کے تعلق سے ''یوسف حسین خان'' اس طرح رقم طراز ہیں کہ ''ایک اعلیٰ انسان اور ماہرِ تعلیم ہونے کے علاوہ ذاکر میاں کا شمار اردو زبان کے چوٹی کے انشاء پردازوں میں ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ادب میں ادبیت کہاں سے آتی ہے۔ لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ادبیت خلوص کے بغیر جلوہ گر نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہر مخلص شخص اعلیٰ درجے کا ادیب نہیں ہوجاتا۔ ادیب کے لیے ازبس لازمی ہے کہ اس میں اظہارِ خیال کی قابلیت بھی ہو، ورنہ کسی کے خیالات کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں اگر وہ ان کے اظہار پر قدرت نہیں رکھتا تو ان کی خوبی اس کا اندرونی تجربہ ہوکر رہ جاتی ہے۔ اظہارِ خیال کی اعلیٰ قابلیت اور اخلاص دونوں مل کر ادب کا جادو جگاتے ہیں، یہ دونوں صفتیں ذاکر میاں کی تحریروں میں موجود ہیں۔''

(ڈاکٹر ذاکر حسین، شخصیت و معمار: یوسف حسین خان، مرتبہ: ڈاکٹر فہمیدہ ریاض، ص 111)

مذکورہ بیان کی روشنی میں آیئے ہم 'ڈاکٹر ذاکر حسین' کے ایک خط کا جائزہ لیں، لیکن یہ ضرور یاد رہے کہ ذاکر صاحب کی یہ تحریر سنہ 1938 کے اخیر یا نئے سال کے ابتدائی مہینوں کی ہے۔ جب آپ علاج کے لیے یورپ تشریف لے گئے تھے اور اسی دوران دوسری جنگِ عظیم چھڑ جانے پر نہ جانے کہاں کہاں پھنس گئے۔ یہ کہانی انھوں نے اپنے ایک خط میں بیان کی ہے جسے انھوں نے ڈاکٹر سید عابد حسین کو 11 ستمبر 1939 کو جینوا سے لکھا تھا۔

''برادرم، عابد صاحب۔ تسلیم

آپ کا خط مجھے اس دن ملا جب میں جرمنی بھاگ رہا تھا۔ اسی ڈاک سے ایک شفیق صاحب کا اور ایک خط میم صاحبہ کا ملا۔ خطوط سے اُدھر کا حال اتنا تو معلوم ہوگیا کہ چند ہفتے صبر سے گزار سکتا ہوں، اس سے پہلے کسی بندۂ خدا نے خبر نہ لی......،

میری کہانی سنئے، 3 جولائی کو 'وینس' پہنچا شہر پسند آیا، وہیں رہ پڑا اور دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا، بہانہ یہ تراشا کہ

اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں، واقعی سیکھنا بھی تھا لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی بھلانے میں اس سے بہت کم لگے گی۔

18 جولائی کو 'وینا' پہنچا، وہاں امتیاز آگئے اور مجھے ڈاکٹروں کے سپرد کر گئے۔ ڈاکٹروں نے وہ وہ معائنے کیے کہ معاذ اللہ! 'در گفتن نمی آید' قرار یہ پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ بھی ہیں ٹھیک ہیں، احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا، آنتیں البتہ بہت خراب ہیں، پرانی پیچش ہے اور خوب ہے، اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں۔ زیادہ ڈھیل کی گنجائش نہیں، قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہیے تھی لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا، اس لیے ابھی موقع ہے علاج ہوسکتا ہے، خون کی جو حالت ہونی چاہیے تھی اس سے بہت بہتر ہے، اس لیے علاج میں سہولت ہے، قلب بھی (ستم ظریفی ملاحظہ ہو) پر، چاہے دماغ کا معائنہ نہیں ہوا، ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا، علاج سے زیادہ پرہیز کی تاکید کی گئی، سات انجکشن تجویز کیے گئے اور حکم ملا کہ کسنجن (Kissingen) چلے جاؤ۔ وہاں تین ہفتے رہو۔

چنانچہ میں 15 اگست کو کسنجن پہنچا۔ چھوٹی سی جگہ ہے، باشندے سب پردیسی اور بیمار۔ چاروں طرف پھولوں کی بھرمار، یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ 'وینا' سے ڈاکٹر نے ایک مفصل نصیحت نامہ ساتھ دیا تھا اور ایک ڈاکٹر کے نام تعارفی خط، انھوں نے اسی دن علاج شروع کردیا، ایک مکان میں رکھ دیا، جہاں بھٹیارن خود ڈاکٹر بھی، اور ایک ڈاکٹر کی بیوہ اور بڈھی یعنی تجربہ کار۔ اس نے پرہیز کا پورا پورا انتظام کیا۔ چند ہی روز میں فائدہ محسوس ہونے لگا، لیکن فلک کج رفتار کو کیا کہیے۔ لڑائی کی خبریں آنے لگیں۔ آدمی، گھوڑے، گاڑیاں موٹریں سب ضبط ہونے لگیں۔ 25 اگست کو سب تیاری ہوچکی تھی۔ ہمارے نوکر سب فوج میں جاچکے تھے۔ بیمار ساتھی سب بھاگ نکلے تھے مگر ہم تھے کہ ڈٹے رہے اور کرتے بھی کیا۔ انجکشن پورے نہیں ہوئے تھے۔ طبیعت برابر صحت کی طرف مائل تھی، ہم نے طے کیا کہ فی الحال جنگ نہ ہوگی۔ اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ 26 اگست کو خاکسار کے بطن سے ایک زندہ وجود تولد ہوا، یعنی ایک عدد عظیم الشان کیڑا۔ طول جس کا کوئی 9 انچ تھا برآمد ہوا۔ پیچش کے علاوہ یہ بزرگ بھی سالہا سال سے (اندرون خانہ مقیم) موجود تھے۔ انھیں گرفتار کیا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ انھوں نے اس کا لاطینی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا اور کہا، ''بہت اچھا ہوا یہ نکل گئے بہت پرانا ہے۔'' خیر یہ بھی ہوا ہم خوش ہوئے کہ علاج کامیاب ہورہا ہے اور جے رہے۔ پہلی ستمبر کو انجکشن ختم ہوئے، غسل جو تجویز کیے تھے وہ بھی پورے ہوگئے۔

(حیاتِ ذاکر حسین، تالیف خورشید مصطفیٰ رضوی، ص نمبر 122,123,124)

یہ تھی ایک نوجوان ادیب کی پختہ تحریر ''ان کے طرزِ تحریر میں کہیں کہیں خطیبانہ شان آگئی ہے لیکن اس میں آورد اور تصنع کا نام نہیں، بلکہ سچی جذباتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔''

(ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت و معمار، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم)

ڈاکٹر ذاکر حسین کے نزدیک ملک و قوم سے زیادہ لائق توجہ اور لائق قدر وہ 'بچے' ہیں جو طالب علمی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے، نیز مستقبل کا پاسبان وطن بنانے، ان میں قوم و وطن کی بے لوث محبت اور خدمت کے جذبوں کو ابھارنے اور سماج میں ایک باہنر، بااثر، بے داغ حصہ دار بنانے کے لیے بے شمار مضامین تحریر کیے۔ اپنے خطبات کے ذریعے ان کی ذہن سازی کی، جذبۂ آزادی، وطن دوستی، اتحاد، اتفاق، انصاف اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی، حوصلہ مندی، خدمت و ایثار اور صحت و صفائی کی عظمت و خصوصیات سے آپ کے خطبات اور مضامین کا دامن مالا مال ہے۔ آپ کی تحریریں آپ کی دلی دردمندی کی حقیقی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ آپ کی ساری زندگی ذوق و جستجو سے عبارت تھی۔

قبلِ آزادی، کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا:

''عزیزو تم دھن دولت کی فکر ہی میں کیوں نہ لگ جاؤ، مگر کبھی اپنی قوم کی راہوں میں رکاوٹ نہ بننا۔ اپنی کامیابی کے لیے بہت سے لوگ قوم کا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ جو شخص اپنی غرض کے لیے اپنے دیش اور قوم کو نقصان پہنچانے سے گریز نہ کرے وہ آدمی نہیں جانور ہے۔''

تم جس ملک میں جارہے ہو وہ بڑا بدنصیب ملک ہے۔ وہ غلاموں بے انصافیوں کا ملک ہے۔ وہ جاہلوں کا ملک ہے، سستی موت کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے لیکن کیا کیجیے یہ تمہارا اور ہمارا ملک ہے۔ اسی میں جینا اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لیے یہ ملک ہماری ہمتوں کے امتحان، قوتوں کے استعمال اور محبت کی آزمائش کی جگہ ہے۔

عزیزو! ہمارے دیش کو ہماری گردنوں سے ابلتے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینے کا بارہ ماہی بہنے والا دریا درکار ہے۔ بڑی زبردست اخلاقی قوتوں کی ضرورت ہے۔ جیسے معمار ہوں گے ویسی عمارت ہوگی۔ عزیزو! کان کھول کر سن لو۔ ہندوستان کی بڑائی ہماری خوبیوں پر منحصر ہے۔ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی۔''

(خطبہ قومی تعلیم، تعلیمی خطبات، از: ڈاکٹر ذاکر حسین، صفحہ نمبر 28,29)

دیکھا آپ نے، خیالات کی پختگی، گہری معنویت، عبارت کی روانی، زبان کی سلاست، بیان کی متانت، طرزِ اظہار کی ندرت اور جذبات کا جوش، بیباکانہ اظہار۔ یہ ہیں ذاکر صاحب کے ادبی محاسن، اُن کا قومی درد اس درجے کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اس کا اظہار آہ و بکا سے نہیں بلکہ فکر و عمل کی ساری صلاحیتوں سے قوم کے علاج کی لگاتار جستجو میں مصروف و غرق ہو جانے کی تاکید و ترغیب دیتے ہیں۔ ان کی طرزِ تحریر میں خلوص کے ساتھ جوش اور ولولہ، تازگی اور قوت ہے جو اُن کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ انھیں جو کچھ کہنا ہوتا، اسے بالکل فطری انداز میں کہہ دیتے، عبارت میں کہیں ڈھیلا پن اور جھول نہیں ہوتا تھا۔

آپ جب یورپ سے واپس آئے تو وہاں کی بہترین متاع یعنی ترقی یافتہ تعلیمی افکار اور نظریات اپنے ساتھ لائے اور آتے ہی اپنے وعدے اور منصوبے کے مطابق 'جامعہ' کے کاموں کو سنبھال لیا۔ آپ نے تعلیمی کاموں کو ابتداء ہی سے اپنا مقصدِ حیات بنایا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک معلم کا عنصر ہمیشہ پایا جاتا تھا۔ ایک مردِ مومن کی شخصیت میں جتنی ذاتی صفات کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ کم و بیش تمام ان کی شخصیت میں موجود تھیں۔ انسان دوستی، بلند نظری، دردمندی، وسعت القلبی کی مثالیں اُن کی سیرت میں پائی جاتی ہیں۔ وہ ملک کے قد آور ماہر تعلیم اور سچائی پرست، سچ گو تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ قومیت اور اسلامیت کے تعلق سے آپ کا نظریہ تھا کہ ''یہ ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ انھیں ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہماری قومی زندگی کا یہ تقاضا ہے کہ ان مواقع کو دور کیا جائے جو اس مقصد کے حصول میں سنگ گراں بنے ہوئے ہیں؟''

جامعہ ملیہ کے مقاصد کے متعلق بھی ذاکر صاحب نے اپنے خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ ''اسلامیت اور قومیت ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں۔ جامعہ کا تعلیمی مشن یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے اندر سموئے۔''

ان کے نزدیک دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان کی آئندہ زندگی کا نقشہ یعنی ان کے مذہب (اسلام) اور ہندوستانی تہذیب میں ان کے مقام کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دے۔''

(ذاکر میاں: یوسف حسین خان، صفحہ نمبر 106)

دوسری طرف وہ قوم و ملت کی رہنمائی کرتے ہوئے مخلصانہ اپیل کرتے ہیں:

''عزیزو! اس نئے ہندوستان کے بنانے کا کام میں تم سے جہاں تک بن پڑے ہاتھ بٹانا، مگر یاد رہے کہ

اگر مزاج میں بے صبری ہے تو تم اس کام کو اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ یہ بڑا دیر طلب کام ہے۔ اگر طبیعت میں جلد بازی ہے تو بھی تم کام بگاڑ دو گے کہ یہ بڑا اپتا مارنے کا کام ہے۔ اگر جوش میں بہت سا کام کرنے کی عادت ہے اور اس کے بعد ڈھیلے پڑ جاتے ہو تو بھی شاید یہ کٹھن کام تم سے نہ بن پڑے گا۔ اس لیے کہ اس میں عرصے تک ایک سی محنت اور توجہ درکار ہے اگر ناکامی سے مایوس ہو جاتے ہو تو اس کام کو نہ چھونا کہ اس میں ناکامیاں ضروری ہیں۔ بہت ناکامیاں اور بار بار ناکامیاں، یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے ہر ناکامی اور زیادہ محنت کرنے پر ابھارتی ہو۔"

(حیات ذاکر حسین، تالیف: خورشید مصطفیٰ رضوی، صفحہ نمبر 6)

ڈاکٹر ذاکر حسین خان، اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے، قیادتی ذمے داریاں انجام دیں۔ مخلص احباب کے لطف وکرم سے محظوظ ہوئے تو مخالفین کے ہر حربے کا متانت سے سامنا بھی کیا۔ ان حالات، تجربات اور مشاہدات نے ان میں ایسا وصف پیدا کر دیا کہ انھیں تحریر اور تقریر پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہوئی۔ ان کے خطبات اور مضامین دوسروں کے علم وادب میں قیمتی اضافے کا سبب بنے۔ خطوط میں ان کا منفرد اسلوب، شگفتہ اور شائستہ رویہ، شریفانہ اور نازک احساس لیے ہوتا تھا۔

آزادی وطن کے ایک سال قبل 14 اگست کو ڈاکٹر ذاکر صاحب نے حیدر آباد کے نظام کالج بزم ادب میں 'سیرت اور تربیت' پر ایک خطبہ پڑھا۔ اس سے اپنے زمانۂ طالب علمی میں جناب رشید الدین خان نے متاثر ہو کر ذاکر صاحب پر ایک مضمون بعنوان 'شخصیت' تحریر کیا جو کہ 'نظام ادب' میں شائع ہوا۔ کوئی پندرہ سال بعد جب ڈاکٹر صاحب بہار کے گورنر ہوئے۔ اس وقت رشید الدین خان بھی آرٹ کالج جامعہ عثمانیہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ نے اپنے پرانے مضمون کی ایک کاپی ذاکر صاحب کو روانہ کی اور بڑی بے چینی سے اُن کے تاثرات جاننے کے متمنی اور منتظر ہوئے۔ کئی مہینوں بعد 'راج بھون' رانچی سے ذاکر صاحب کا خط موصول ہوا۔ ذاکر صاحب یوں رقمطراز ہیں:

"عزیزم رشید میاں، خدا آپ کو خوش اور تندرست رکھے۔

آپ بھی کہتے ہوں گے کہ عجیب شخص ہیں یہ بھائی ہمارا کہ نہ خط کا جواب دیا نہ مضمون کی رسید بھیجی۔ مضمون جس وقت ملا، اس وقت پڑھ لیا تھا۔ اس میں اور خط میں آپ نے میری ایسی توصیف کی تھی کہ مارے خجالت کے اس وقت جواب نہ بن پڑا۔ آپ کی نیک خیالی سے اپنی بدحالی کو کیسے ملاتا؟ بہر حال، جواب رہ گیا اور جب ایک دفعہ رہ گیا تو پھر ٹلتا ہی رہا۔ لیکن آپ کا خط غیر تعمیل شدہ کاغذات میں وقتاً فوقتاً سامنے آتا رہا اور شرمندہ کرتا رہا تب سوچا کہ اسے فائل سے نکالنا ہی چاہیے۔

آپ نے محبت میں میرے متعلق بہت حسن ظن سے کام لیا ہے۔ مگر یہ کچھ برا نہیں، میں تو جیسا ہوں ویسا ہی ہوں۔ مگر آپ کو اگر کوئی خوبی مجھ میں یا کسی اور میں نظر آتی ہے تو وہ آپ کی پسند کی غماز ہے۔ آدمی رفتہ رفتہ وہی ہو جاتا ہے جو وہ پسند کرتا ہے، وہی صفتیں اس میں مجسم ہوتی ہیں جنھیں وہ پسند کرتا ہے۔ خدا کرے آپ سب بخیر ہوں۔

آپ کا بھائی، ذاکر

(ذاکر حسین خاں صاحب کی زندگی کا ایک جائزہ، از: رشید الدین خان)

انکساری، شوخی، علم اور تجربات ومشاہدات کی قوسِ قزح کا یہ رنگ بھی ملاحظہ کریں۔ گورنمنٹ طبیہ اسکول کے تقسیم اسناد کے موقع پر اپنے خطبے کی تمہید میں اپنی شوخیِ تحریر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرح مخاطب ہیں۔

"صاحبو! آپ کا حکم تھا، حاضر ہوں اور خدا کا شکر گزار کہ آپ نے یاد فرمایا اور اس معزز مجلس میں خطبہ پڑھنے کی عزت مجھے بخشی۔

مگر سچ عرض کرتا ہوں کہ ابھی تک میں ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا کہ اس موقع پر اس کام کے لیے کیوں بلایا گیا ہوں؟ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تو خیال آیا کہ کہیں میرے نام کے ساتھ جو کچھ دنوں سے 'ڈاکٹر' کا لفظ لگ گیا ہے۔ اس سے کوئی دھوکا تو نہیں ہوا؟ کبھی کبھی دیہاتوں اور قصبوں میں لوگوں نے مجھ سے نبض دیکھنے اور نسخہ لکھنے کی فرمائش اسی دھوکے میں کی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں تو یونانی طبیبوں اور ایلوپیتھی کے ڈاکٹروں میں کچھ ایسی بہت بنتی بھی نہیں ہے کہ شبے میں مجھے یہاں بلایا جاتا!"

ادبی اور طبی ڈاکٹروں کی خیر خیریت کے بعد آپ درسگاہوں کے حالات کا بھی مزے مزے سے اس طرح جائزہ لیتے ہیں۔

"پھر۔ خیال ہوا کہ شاید یہ وجہ ہو کہ ایک تعلیمی ادارے کا جلسہ ہے، میں بھی ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہوں، استاد اور شاگرد کا تعلق، تعلیم وتدریس کا کام اور اس کی ذمہ داریاں کم وبیش ایک ہی سی ہوتی ہیں۔ چاہے تعلیم گاہ میں معیشت وسیاست اور فلسفہ وادب کا درس ہوتا ہو یا تشریح وظائفِ اعضاء اور طبِ جراحت کا۔ لیکن آج کل ہر فن مولا اپنی اپنی کملی میں کچھ ایسا مست رہتا ہے اور تعلیم گاہوں میں بھی کچھ ایسی رقابتیں سی دکھائی دیتی ہیں کہ اس کا بھی پوری طرح یقین نہ آیا۔"

اس کے بعد ذاکر صاحب نے کچھ حقیقی اور کچھ امکانی بیماریوں پر اپنی تمہید کا خاتمہ کیا۔

"پھر گمان ہوا کہ شاید مجھے امکانی بیماریوں کے اس گروہ کا نمائندہ سمجھ کر آپ نے دعوت دی ہو۔ جو آپ کے شریف فن سے استفادہ کرتا ہے اور آپ کے نئے سند پانے والوں کے لیے کم از کم چند سال اور آپ کے بعض وضع دار ساتھیوں کے لیے عمر بھر تختۂ مشق کا کام دیتا ہے۔ لیکن ہمارے دیش میں واقعی اور امکانی بیماریوں کی کچھ ایسی کمی نہیں ہے کہ نظرِ انتخاب مجھ تک پہنچتی۔"

اس کے بعد آپ نے جدید مغربی طب اور طب یونانی پر اپنی علمیت، ذہانت، لیاقت اور تجربات کے عطر سے ساری مجلس کو معطر کر دیا۔ طبی تعلیم، امراض، علاج، مریض، طبیب اور حکمت کے بہروپیے، ٹھگوں پر اپنے علم کے روشن باب کو وا کر دیا۔ اور اخیر میں آپ نے ان لفظوں میں دعائے خیر فرمائی۔

"میری دعا ہے کہ آپ مدرسے سے سند لینے والے اس گروپ میں شامل ہوں (جنھوں نے غریبوں کی خدمت کی ہے) اور سچے سپاہیوں کی طرح دیش کو جہالت اور بیماریوں کے دشمنوں سے نجات دلائیں"

(ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت ومعمار، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، صفحہ نمبر 135،208،209)

جامعہ میں شروع ہی سے علمی اور ادبی ماحول رہا اور ذاکر صاحب کی سرپرستی میں تصنیف، تالیف اور ترجمے کے اہم کام ہوتے رہے۔ علمی وادبی مجالس میں مضامین پڑھے جاتے۔

بچوں کے لیے 'پیامِ تعلیم' اور 'بچوں کا اخبار' بھی نکالا گیا۔ ذاکر صاحب کی سرپرستی میں ہی 'مکتبۂ جامعہ' قائم ہوا۔ بچوں کی تعلیمی اور ادبی کتابیں سب سے پہلے یہیں سے چھپنا شروع ہوئیں اور ادب اطفال پر اچھا لٹریچر مہیا کیا گیا۔ خود ذاکر صاحب نے بھی بچوں کے لیے کہانیاں، ڈرامے اور کتابیں لکھیں۔ ذاکر صاحب کا یہ قول کہ "کھٹ کھٹ کیے جاؤ تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے" سیدھے سادے الفاظ میں جامعہ والوں کو سرگرم عمل رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ بچوں سے آپ نے اس طرح بھی خطاب کیا ہے۔

"تم سچے ہو گے، اچھے ہو گے، تندرست ہو گے، بروں کے لیے لوہار ہو گے، اچھوں کے لیے موم، غریبوں کا سہارا ہو گے، بیکسوں کا آسرا، سوتوں کو جگاؤ گے، ڈوبتوں کو تراؤ گے، غریب ہو گے تو بھی سیر چشم، دوسروں کی دولت کو منہ پھیر کر نہ دیکھو گے، امیر ہو گے تو اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھو گے اور اُس کے بندوں کی سیوا میں صَرف کرو گے۔ تم جہاں بھی ہو گے، اپنے ساتھیوں کے لیے پڑوسیوں کے لیے رحمت ہو گے۔ تم اُس کے نام لیوا ہو جو سارے جہانوں کے لیے 'رحمت' ہے۔

(ایک معلم کی زندگی، حصہ دوم: عبدالغفار، مدھولی، صفحہ نمبر 30)

■

Khayal Ansari
772, Khushamadpura,
Malegaon - 423203
Distt.: Nasik (MS)
Mob.: 09270910011

دبستانِ لکھنؤ اور اردو ڈراما

شاہد حسین

اردو ڈرامے کی ابتدا و ارتقا کی تمام نسبتیں شہر نگاراں لکھنؤ سے منسوب ہیں۔ اودھ کے علاقے کا یہ وہی شہر ہے جس کے ذمے تہمتیں بھی بہت سی دھری گئیں اور اس کے نام سے منسوب امتیازات و اعزازات بھی بہت ہیں۔

دنیا کی ہر قوم کے فنون لطیفہ، زبان و ادب اور تفریحی مشاغل میں ڈرامائی عناصر پائے جاتے ہیں۔ لیکن جن ممالک نے سب سے پہلے ان عناصر کو ترتیب دے کر ڈرامے کی تخلیق کی ہندستان ان میں سے ایک ہے۔ بلکہ بعض حوالوں کی رو سے اسے اولیت حاصل ہے۔ صفدر آہ لکھتے ہیں:

''قدیم یونانی ڈرامے کی پہلی جھلک ہمیں چھٹی صدی ق م میں غیر ترقی یافتہ فوک ڈرامے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ لیکن ہندستانی ڈراما اس عہد سے بہت پہلے اس سطح پر تھا جس کے پیچھے ایک منظم قانون 'بھرت ناٹیہ شاستر' موجود تھا۔''[1]

مغربی مفکرین بھی ہندستان میں ڈرامے کی باقاعدہ ابتدا چوتھی صدی ق م سے بتاتے ہیں۔[2]

محمد اسلم قریشی کے مطابق سنسکرت ڈراموں کی ابتدا سے پہلے ہندستان میں پراکرت ڈراموں کا اس قدر رواج ہو گیا تھا کہ اسے عوامی و نیشنل ڈرامے کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔[3] لیکن ان ڈراموں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان پر گفتگو مشکل ہے۔ بہرحال ان پراکرت ڈراموں کے شانہ بہ شانہ سنسکرت ڈرامے بھی معرض وجود میں آنے شروع ہو گئے تھے۔

ادبی تحقیق کے تمام تر ارتقا کے باوجود یہ پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سنسکرت ڈرامے کی ابتدا کب ہوئی۔ لیکن اس میں شبہے کی گنجائش نہیں کہ یہاں سنسکرت ڈرامے کی روشن تاریخ اور مستحکم روایت رہی ہے۔ 'بھرت ناٹیہ شاستر' جیسی فنی کتاب اور مرچھ کٹکم و شکنتلم جیسے ڈراموں سے اس کے ماضی کی تابناکی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مگر دسویں صدی عیسوی آتے آتے اس عظیم روایت کو گہن لگ گیا اور یہ کتابوں کی زینت بن کر صرف درس و تدریس کا حصہ ہو گئے۔

سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد خواہ اس کی وجوہات کچھ بھی رہی ہوں لگ بھگ آٹھ سو سال تک ہندستان میں کلاسیکی تھیٹر کی روایات کہیں نظر نہیں آتیں۔ لیکن عوامی ڈرامے کی روایات رواں دواں تھیں جو ہمارے تہذیبی ورثے کا بیش قیمت حصہ ہے۔ نئے ہندستانی ڈرامے اور اردو ڈرامے نے انھیں عوامی روایات سے جنم لیا۔

سنسکرت ڈرامے کے عروج کے زمانے میں راجہ مہاراجہ اور امراء و روساء نہ صرف اس کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ عملی طور پر اس میں حصہ بھی لیتے تھے۔ لیکن سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد ڈراما خاصی مدت تک کسمپرسی کی حالت میں گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ البتہ شاہان اودھ کے عروج نے اس کے دن پلٹے۔ خصوصاً نصیرالدین حیدر کے عہد میں (1827-1837) کچھ ایسے آثار نظر آتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈراما پھر سے شاہی محل کی طرف جا رہا ہے۔ نصیرالدین حیدر کے درباری کھیل تماشوں میں دو ایسی چیزیں تھیں جن میں ڈرامائی کیفیت پائی جاتی تھی، ایک تو راگ راگنیوں کا جلسہ دوسری کٹھ پتلیوں کا تماشا۔ نصیرالدین حیدر کے بعد فنون لطیفہ کے عظیم سرپرست واجد علی شاہ نے باقاعدہ ڈرامے کو شاہی محل میں جگہ دے کر عزت کے سنگھاسن پر بٹھایا۔ انھوں نے ڈرامے پر جو احسان عظیم کیا وہ اس بات کا

> **واجد علی شاہ کی ڈرامائی سرگرمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جن میں صرف ڈرامائی عناصر پائے جاتے ہیں جیسے 'چھتیس ایجادی رہس'، 'رادھا کنھیا کا قصہ' (اول) اور 'جوگیا میلے' ان میں ڈرامائی حرکت و عمل تو ہے لیکن مکمل واقعہ یا پلاٹ نہیں ہے اس لیے ہم انھیں ڈراما نہیں کہہ سکتے۔**

متقاضی ہے کہ ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لیا جائے۔

16 / جولائی 1842 کو واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ بنے اور وہ خود ولی عہد مقرر ہوئے۔ اب ان کی آمدنی اور اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ اس وقت واجد علی شاہ کی عمر بیس سال تھی اور ناچ گانے کا شوق شباب پر تھا۔ چنانچہ حسین اور خوش گلو عورتیں جمع کی گئیں انھیں ناچ گانے کی تعلیم دینے کے لیے استاد مقرر ہوئے۔ یہ عورتیں 'پریاں' کہلاتی تھیں۔ ان کی تعلیم کے لیے ایک مکان آراستہ کیا گیا جو 'پری خانہ' کہلاتا تھا۔ یہ ایک طرح سے رقص و موسیقی کی تربیت گاہ تھی۔ شاہی محل میں جتنے بھی جشن ہوتے تھے یہاں کی تربیت یافتہ پریاں سب میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ یہی نہیں واجد علی شاہ کی جتنی ڈرامائی یا نیم ڈرامائی سرگرمیاں تھیں سب کی رونقیں اسی پری خانے کی تربیت یافتہ پریوں کی مرہون منت تھیں۔

واجد علی شاہ کی ڈرامائی سرگرمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جن میں صرف ڈرامائی عناصر پائے جاتے ہیں جیسے 'چھتیس ایجادی رہس'، 'رادھا کنھیا کا قصہ' (اول) اور 'جوگیا میلے' ان میں ڈرامائی حرکت و عمل تو ہے لیکن مکمل واقعہ یا پلاٹ نہیں ہے اس لیے ہم انھیں ڈراما نہیں کہہ سکتے۔

دوسرے وہ جن میں مکمل ڈراما موجود ہے جیسے 'تین اسٹیج مثنویاں' اور 'رادھا کنھیا کا قصہ' (دوم) ان میں مکمل قصہ یا مکمل پلاٹ ہے۔ جس میں ابتدا، وسط اور اختتام موجود ہے۔ ان میں ڈرامے کے تمام اجزائے ترکیبی یعنی پلاٹ، کردار، مکالمہ اور زبان کی ترتیب واضح ہے اور ان کی اسٹیج پیش کش کے تمام امکانات روشن ہیں۔

واجد علی شاہ ولی عہد ہونے کے بعد پری خانہ ترتیب دے چکے اور پریوں کی رقص و موسیقی کی کچھ تربیت ہوگئی تو وہ رقص و سرود کی عام محفلوں کے ساتھ ساتھ رہس کے جلسے بھی کرواتے۔ واجد علی شاہ کے دور میں اودھ اور اس کے نواح میں راس لیلا کا جو زور تھا اس سے واجد علی شاہ کافی متاثر تھے۔ راس لیلا یا رہس کے دو شعبے ہیں۔ ایک کرشن اور گوپیوں کے حلقے کا ناچ اور دوسرا کرشن کے واقعات زندگی کی تمثیل۔ واجد علی شاہ نے اپنی کتاب 'بنی' میں رہس کے ان دونوں شعبوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ پہلے شعبے کے زیر اثر رہس ناچ کی 36 طرزیں خود بنائیں اور انھیں پیش کروایا۔ ان رہسوں کے شروع میں ایک مسخرہ آتا ہے۔ اور رہسوں کے ناموں کی مضحکہ خیز نقل اتار کر واپس چلا جاتا ہے۔ باقی پورے رہس میں ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ ان رہسوں کا تفصیلی ذکر واجد علی شاہ کی تصنیف 'صوت المبارک' میں ہے۔ یہی 'چھتیس ایجادی رہس' کے نام سے موسوم ہیں۔

دوسرے شعبے کے تحت انھوں نے دو ڈرامے 'رادھا کنھیا کا قصہ' کے نام سے لکھے۔ اس سلسلے کا پہلا ڈراما انھوں نے 1843 میں لکھا جب وہ ولی عہد تھے۔ اس میں رادھا اور کنھیا کے درمیان کچھ مکالمے ہیں اور پرستش کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ کوئی مکمل واقعہ یا پلاٹ نہیں ہے۔ دوسرا معزولی کے بعد مٹیا برج کلکتہ میں لکھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

پھر واجد علی شاہ بادشاہ اودھ ہوگئے۔ انھیں ہر طرح کی آسانیاں اور ساز و سامان فراہم ہوگئے تو ان کا ڈرامائی احساس بھی ترقی پذیر ہوا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنی تین مثنویوں کی ڈرامائی پیش کش سے کیا۔

واجد علی شاہ نے اٹھارہ سال کی عمر میں تین عشقیہ مثنویاں 'افسانۂ عشق'، 'دریائے عشق' اور 'بحر الفت' کہی تھیں۔ ان مثنویوں کو ڈرامے کی ہیئت میں تبدیل کر کے ان کی پیش کش کروائی۔ ان میں ایک مکمل قصہ یا پلاٹ پایا جاتا ہے۔ ان کے قصے چونکہ طویل ہیں اس لیے انھیں قسطوں میں پیش کیا جاتا تھا۔ ان جلسوں میں صرف شاہی خاندان کے لوگ ہی شریک ہوتے تھے۔ اقتدار الدولہ واجد علی شاہ کے پھوپھا تھے اور برابر ان جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ انھوں نے پہلی مثنوی 'افسانۂ عشق' کی پیش کش کا آنکھوں دیکھا حال اپنی تصنیف 'تاریخ اقتداریہ' میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ نمونے کے طور پر اس کا کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''اب وزیر بادشاہ کا حکم پا کر کسی صاحب کمال درویش کی تلاش میں نکل سر بہ صحرا چلا۔ تو اس رہس میں ایک صحرا بھی بنا ہوا تھا اور اس میں ایک چبوترہ بھی سنگ مرمر کا تھا۔ اس پر ایک بہروپیے کو درویش بنوا کر بٹھایا تھا۔ اس چبوترے کا زینہ باڑھ دار تلوار کا تھا۔ وہ درویش اس پر پاؤں رکھ کر چڑھتا اترتا تھا۔

دوسرے دن پھر اسی طرح واجد علی شاہ شہ نشیں پر اور سب عزیز و شہزادے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ اسی طرح رہس مبارک آیا اور پہلے عورتیں ناچیں۔

لال پری کا مکان ابرق کا بنا ہوا تھا۔ آدمیوں کے منہ پر مقوے کے چہرے چڑھا کر دیو بنائے گئے۔

قلعہ کاغذ کا ایسا بنایا تھا کہ بالکل اصلی معلوم ہوتا تھا۔ فصیلوں پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ گولہ انداز مستعد کھڑے تھے اور تیر انداز تیر و کمان سے لیس تھے۔ کچھ ایسی تدبیر کی گئی تھی کہ لڑائی میں جب کسی پر تلوار پڑتی تھی تو خون نکلتا تھا۔ قلعے کی جنگ سچ مچ کی لڑائی معلوم ہوتی تھی۔''[4]

ان مثنویوں کی پیش کش میں ناظرین کے بیٹھنے کی جگہ محدود ہوتی تھی اور پیش کش کی جگہ لامحدود۔

'واجد علی شاہ کے جوگیا میلے' میں بھی ڈرامائی عناصر کی فراوانی ہے۔ اس ضمن میں مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

''واجد علی شاہ کی پیدائش کے وقت جوتشیوں نے زائچہ دیکھ کر بتایا تھا کہ اس بچے کی قسمت میں جوگی ہونا لکھا ہے اور طالع کی یہ نحوست اس طرح دور ہوسکتی ہے کہ یہ بچہ ہر سال گرہ کے موقعے پر جوگی بنا دیا جایا کرے۔ جوتشیوں کی اس ہدایت کے مطابق بچے کی والدہ ہر سال اس کی پیدائش کے زمانے یعنی ساون کے مہینے میں جوگی بنایا کرتی تھیں۔''[5]

مسعود حسن رضوی ادیب کے اس قول کی تصدیق مصنف 'آفتاب اودھ' اور منشی نولکشور کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔

واجد علی شاہ کی والدہ یہ رسم محل کے اندر سادہ طریقے سے ادا کرتی تھیں۔ واجد علی شاہ ولی عہد ہوئے تو اس رسم کو حضور باغ میں جشن کے طور پر منانا شروع کیا۔ عہد شاہی کے دوسرے اور تیسرے سال بھی یہ جشن دھوم دھام سے منایا گیا۔ ابھی تک یہ جشن ایک ذاتی جلسے کی شکل میں منایا جاتا تھا۔ جس میں قریبی عزیزوں اور خاص خاص مصاحبوں کو شرکت کی اجازت تھی۔ 1265ھ سے 1268ھ تک یہ جشن مختلف وجوہات کی بنا پر موقوف رہا۔ 1269ھ میں اس کا احیا ہوا تو اس کی آب و تاب بڑھا کر اسے میلے کی شکل دے دی گئی۔ اب اس میں ہر خاص و عام کو اس شرط کے ساتھ شرکت کی اجازت ہوتی تھی کہ وہ گیروے رنگ کے کپڑے پہن کر آئیں۔ یہ میلہ قیصر باغ میں منایا جاتا تھا۔

جوگیا میلوں میں رہس ناچ تو پیش ہی کیا جاتا تھا اس کے علاوہ واجد علی شاہ جوگی بنتے تھے، بیگمیں اور پریاں جوگنیں۔ واجد علی شاہ پر کنھیا کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی وہ جوگنوں کے درمیان سے غائب ہوجاتے۔ جوگنیں انھیں ڈھونڈھتی پھرتیں۔ وہ یکایک پھر کہیں نمودار ہوجاتے اور جوگنیں اپنا غم بھول کر ناچنے گانے لگتیں۔

یہ سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں کہ واجد علی شاہ 1856 میں معزول کر دیے گئے، اور وہ کلکتہ میں 1856 سے 1887 تک رہے۔ معزولی کے بعد ان کی آمدنی کے ذرائع محدود ہوگئے۔ وہاں ان کے پاس اتنا ساز و سامان مہیا نہ ہوسکتا تھا جتنا مثنویوں کی ڈرامائی پیش کش کے لیے درکار تھا۔ چنانچہ انھوں نے اب پوری توجہ رہس ناچ اور رہس ناٹک کی طرف مبذول کردی۔ ولی عہدی والے 'رادھا کنھیا کا قصہ' میں گیارہ نئے کردار شامل کر کے ایک مکمل قصہ ترتیب دے کر اسے بھرپور ڈراما بنا دیا۔

واجد علی شاہ کی ان تمثیلی کاوشوں میں سنسکرت ڈرامے یا ہندستانی ڈرامے کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں۔

''اس مذاق نے ڈرامے اور تھیٹر کی مضبوط بنیاد ڈال دی اور اگر چند روز اور شاہی کا دور رہتا تو اچھے اصولوں پر خالص ہندستانی ناٹک ایک خاص صورت پیدا کر لیتا جو بالکل اچھوتی اور ہندستانی مذاق میں ڈوبی ہوتی۔''[6]

واجد علی شاہ کا امتیاز صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اردو ڈرامے کی ابتدا کی بلکہ ان کی وجہ سے عوام میں ڈراما لکھنے، دیکھنے اور پیش کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ کیوں کہ شخصی حکومتوں میں 'الناس علی دین ملوکھم' کے مصداق رعایا اپنے آقا کا دین اختیار کرتی ہے۔

یہ درست ہے کہ دربار شاہی کی تمام تمثیلی سرگرمیوں میں عوام کو شرکت کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن جوگیا میلوں میں تو صلائے عام تھی، اور اس میں رہس ناچ وغیرہ بھی پیش کیے جاتے تھے۔ پھر عوام کی رسائی دربار شاہی تک نہ ہو تو بھی دربار میں جو کچھ ہوتا آن کی آن میں سارے لکھنؤ میں مشتہر ہوجاتا اور جیسا کہ پہلے کہا گیا عوام کا اس سے متاثر ہوجانا ایک فطری امر تھا۔

چنانچہ واجد علی شاہ کی وجہ سے عوام میں جو جوش پیدا ہوگیا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ اردو میں ڈرامے لکھے جانے لگے۔ انھیں کھیلنے کی تیاریاں ہونے لگیں اور ایک طرح کا عوامی اسٹیج وجود میں آگیا۔ اس عوامی اسٹیج کے لیے جو ڈرامے لکھے گئے ان میں سب سے پہلا 'اندر سبھا' ہے جس کے مصنف سید آغا حسن امانت لکھنوی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو عوامی اسٹیج کے بانی سید آغا حسن امانت کا تعلق دور دور تک بھی ڈرامے سے نہ تھا۔ اس سے پہلے نہ انھوں نے کوئی ڈراما لکھا تھا اور نہ بعد میں لکھا وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور صرف شاعر۔ غور طلب ہے کہ جب امانت کو ڈرامے سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی تو انھوں نے ہندستانی ڈرامے کے باب میں ایک ایسا نقش کیوں کر ثبت کردیا جس کی ماہیت دوامی ہے۔

> **"اودھ میں حسن و جمال کی فراوانی، رقص و موسیقی کی عمومیت اور واجد علی شاہ کی غنائی و تمثیلی کاوشوں سے متاثر ہو کر عوام کے دلوں میں بھی ایسے جلسے پیش کرنے کی خواہش نے بال و پر نکالے۔ واجد علی شاہ کی تین اسٹیج مثنویوں کی پیش کش نے فوق فطری قصوں کی پیش کش کے امکانات کو وسیع تر کر دیا تھا۔ لہٰذا چند دوستوں نے بالعموم اور مرزا عابد علی عبادت نے بالخصوص امانت سے فرمائش کی کہ وہ رہس کے طور پر ایک جلسہ تحریر کردیں جسے عوام کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ امانت اس فرمائش کو پورا کرنے کے لیے راضی ہوگئے۔"**

اودھ میں حسن و جمال کی فراوانی، رقص و موسیقی کی عمومیت اور واجد علی شاہ کی غنائی و تمثیلی کاوشوں سے متاثر ہو کر عوام کے دلوں میں بھی ایسے جلسے پیش کرنے کی خواہش نے بال و پر نکالے۔ واجد علی شاہ کی تین اسٹیج مثنویوں کی پیش کش نے فوق فطری قصوں کی پیش کش کے امکانات کو وسیع تر کر دیا تھا۔ لہٰذا چند دوستوں نے بالعموم اور مرزا عابد علی عبادت نے بالخصوص امانت سے فرمائش کی کہ وہ رہس کے طور پر ایک جلسہ تحریر کردیں جسے عوام کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ امانت اس فرمائش کو پورا کرنے کے لیے راضی ہوگئے۔ اس لیے کہ عام حسن پرستی، مروجہ موسیقی اور عشقیہ شاعری سے انھیں گہری وابستگی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس سے ملتا جلتا ایک نادر جلسہ اپنی واسوخت خوانی کا منعقد کروا چکے تھے۔ جس کی مقبولیت نے زیادہ وسیع پیمانے پر ایک نیا جلسہ منعقد کروانے کا ان میں حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا امانت بنیادی طور پر شاعر تھے اور اندر سبھا بھی منظوم ہے یہاں تک کہ اس کے مکالمے بھی منظوم ہیں، پورے ڈرامے میں چند جملے ہی منثور ملتے ہیں۔

چنانچہ واجد علی شاہ کے جلسوں کی شہرت، ماحول کی سازگاری، خود شاعر کی طبیعت کی مناسبت اور فرمائش کرنے والوں کی پاسداری کے خیال نے امانت کو اس دلکش تخلیق کی طرف راغب کیا اور انھوں نے اندر سبھا تصنیف کر کے اردو ڈرامے کی اس اساس کو مستحکم کر دیا جس کی ابتدا واجد علی شاہ کر چکے تھے۔

اندر سبھا کی تصنیف اگست 1852 میں مکمل ہوئی۔ ڈیڑھ سال اس کے جلسے کی تیاری میں لگے۔ تیاری مکمل ہوگئی تو اسے پیش کیا گیا۔ پیش کش کے بعد اس کی مقبولیت کا جو عالم تھا، اس کے بارے میں امانت ''شرح اندر سبھا'' میں لکھتے ہیں:

''ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا... الحمد للہ جگت کا کوئی نام نہیں لیتا۔ زمانہ اندر سبھا پر جان دیتا ہے۔ شہر میں یہ جلسہ چاروں طرف ہوتا ہے۔ مشاقوں کے ہوش کھوتا ہے۔''[7]

اس سلسلے میں عبدالحلیم شرر کا بیان بھی دیکھیں:

''میاں امانت نے اپنی اندر سبھا تصنیف کی یہ اندر سبھا جیسے ہی شہر میں دکھائی گئی۔ ہر شخص والا و شیدا ہوگیا۔ یکایک بیسیوں سبھائیں شہر میں قائم ہوگئیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا اس قدر رواج ہوا کہ گویوں اور ناچنے والی رنڈیوں کا بازار چند دنوں کے لیے سرد پڑ گیا۔ اب امانت کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے نئی سبھائیں بنانا شروع کیں۔ اس مذاق نے ڈرامے اور تھیٹر کی مضبوط بنیاد ڈال دی تھی۔''[8]

مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

''جہاں کہیں یہ کھیل ہوتا تھا، تماشائی ٹوٹ پڑتے تھے۔ بہت سی پیشہ ور منڈلیاں پہلے لکھنؤ میں پھر دوسرے مقامات پر قائم ہوگئیں جو گھر گھر اور شہر شہر بلکہ قصبات اور دیہات میں اجرت پر اندر سبھا کا کھیل دکھاتی پھرتی تھیں۔''[9]

پیش کش کے بعد اس کی شہرت دور دور پہنچی اور ہر طرف سے مانگ ہونے لگی تو 1271ھ میں امانت نے اسے شائع کر دیا۔ کتابی شکل میں بھی اس کی اتنی مانگ ہوئی کہ اسی سال کئی مرتبہ چھاپی گئی۔ اور اس کے بعد سیکڑوں بار چھپتی رہی۔ ہندستان بھر میں جہاں جہاں اردو

بولی اور سمجھی جاتی تھی، اس میں شاید ہی کوئی شہر ہو جہاں یہ نہ چھپی ہو۔

جرمن مستشرق فریڈرچ روزن نے اس کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا اور اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا۔ یہ ترجمہ مع مقدمہ جرمنی کے شہر لائپسنگ (Leipzing) سے 1892 میں شائع ہوا۔ اس میں روزن نے مختلف شہروں میں چھپے ہوئے سولہ نسخوں کی فہرست دی ہے۔ انڈیا آفس لائبریری لندن میں اندر سبھا کے اڑتالیس ایڈیشن موجود ہیں۔

اندر سبھا کے زیر اثر اس کے طرز و اسلوب پر نہ جانے کتنی سبھائیں لکھی گئیں، ان میں سے بطور نمونہ چند نام یہ ہیں۔ اندر سبھا مداری لال، ناگر سبھا، بزم سلیمان، جشن پرستان، فرخ سبھا، راحت سبھا، ہوائی مجلس جدید، ناٹک جہانگیر، عاشق سبھا اور مثنوی اندر سبھا۔

بمبئی میں پارسی تھیٹر قائم ہوا اور 1873 میں الفسٹن ناٹک کمپنی نے اندر سبھا پیش کی تو اسے وہاں بھی اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر تھیٹریکل کمپنی نے کوئی نہ کوئی سبھا اپنے اسٹیج کے لیے ضرور تیار کی۔ کہا جاتا ہے کہ پارسی کمپنیاں جب فیل ہونے لگتی تھیں تو اندر سبھا دکھا کر اپنا خسارہ پورا کر لیتی تھیں۔ یہاں تک کہ ملک کے باہر بھی اس کی پیش کش کافی مقبول ہوئی۔ ماڈلے کے شاہی محل میں وکٹوریہ ناٹک منڈلی نے جب اسے پیش کیا تو اس کی مزید پیش کش کے لیے برابر فرمائشیں ہوتی رہیں اور اس کے ذریعے سے ہزار ہا روپے اداکاروں اور کمپنی کے منتظمین کو انعام میں ملے۔ [10]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اندر سبھا کی اس قدر مقبولیت کا سبب کیا تھا۔ امانت کے عہد میں آج کی طرح گوناگوں وسائل تفریح میسر نہ تھے۔ ناچ گانا اور موسیقی تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ شاعری تخلیقی اظہار کی سب سے مروج ہیئت۔ موسیقی زندگی کا جز اور شعر و شاعری سے رغبت اس عہد کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی اور اندر سبھا انھیں چیزوں سے عبارت ہے۔ عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

''واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں موسیقی کو اس قدر عروج ملا کہ لے داری یہاں کے بچے بچے کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔''[11]

پھر شاعری میں غزل اور مثنوی کے ساتھ ٹھمری، بسنت، دوہے، چوبولے اور ہوری کو شامل کر کے تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ، اعلیٰ ادنیٰ، امیر غریب، چھوٹے بڑے سب کی دل بستگی کا سامان فراہم کر دیا۔

کہانی کا فوق فطری اور تمثیلی ماحول۔ فوق فطری کرداروں کا زمین پر ورود اور حرکت و عمل، پری کا انسان پر عاشق ہونا، جس سے انسان کی انا اور برتری کی تسلی و تشفی ہوتی تھی۔ جوگن اور اس کے فن کی قوت اور نسوانی ذہانت و فطانت کا مظاہرہ فوق فطری عناصر پر انسان کی فوقیت۔

فوق فطری عناصر کی ہمدردیاں انسانوں کے ساتھ۔

عشق کی قوت اور محیر العقول قوت کا استعمال۔

ادبی شان اور عوامی عناصر کی جلوہ سامانی۔

اندر سبھا کے یہ وہ عناصر ہیں جن میں ہر ایک کی دل بستگی کا سامان موجود ہے۔ چنانچہ یہ ہر ایک کو اپنی طرف راغب کر لیتے تھے۔

مختصر یہ کہ 'اندر سبھا' صرف ڈراما ہی نہیں بلکہ ایک اسلوب ہے ایک ہیئت ہے ایک خیال ہے جس نے روایت بن کر اپنے عہد کے عوام کو مسحور کیا۔ پارسی اسٹیج پر اس کا سکہ رائج الوقت بن کر چلتا رہا۔ دوسری ہندستانی زبانوں نے اس کے اسلوب اور ہیئت کو اپنا کر فخر محسوس کیا۔

اس سب کے باوجود اس صنف کو اردو میں وہ مقام و مرتبہ نہیں ملا جس کی یہ مستحق تھی۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں اسے ہمیشہ بہ نظر کم دیکھا گیا، نہ تو اس کا معروضی تجزیہ و تبصرہ ہوا اور نہ مناسب تحقیق و تنقید۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسے ابتدا سے ہی انگریزی ڈرامے کے اصول نقد پر پرکھا جانے لگا۔ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں کے سامنے مجبوری بھی تھی سنسکرت ڈرامے کے اصول و ضوابط سے وہ بڑی حد تک ناواقف تھے۔ عربی فارسی میں ڈرامائی فن کے نہ تو اصول و ضوابط تھے اور نہ کوئی ایسا نمونہ جسے معیار بنایا جا سکے۔ اگر ہمارے دانشوروں کو کسی حد تک واقفیت تھی تو مغربی ڈرامے کے اصول و ضوابط سے چنانچہ لفظ 'ڈراما' دیکھتے ہی وہ اسے مغربی ڈرامے کے فنی معیار پر پرکھنے لگے اور اس لحاظ سے اس میں کوئی کمی پائی گئی تو اسے اردو ڈرامے کے نقائص پر محمول کیا گیا۔ اگر اس صنف کے لیے لفظ ناٹک اختیار کیا گیا ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کسی دور، کسی علاقے، اور کسی ادب کے مخصوص مزاج کو سمجھے بغیر کوئی فیصلہ کسی صنف پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔

اردو ڈرامے کے مزاج کو سمجھا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کی جڑیں اس متاع گم شدہ سے جا ملتی ہیں جو سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد یہاں لوک ناٹک کی شکل میں بکھری ہوئی تھیں۔ یعنی یہ ہندستان میں پیدا ہوا اور اس کا مزاج ہندستانی ہے۔ چنانچہ ہندستانی فکر و فلسفے، تہذیبی عناصر اور فنی عوامل کا اس میں راہ پا جانا ایک فطری امر ہے۔

ہندستانی فکری، تہذیبی اور فنی عناصر اور مغربی فکری، تہذیبی اور فنی عناصر میں بعد المشرقین ہے۔ مغربی ڈراما ٹریجڈی یعنی المیہ عناصر کو ڈرامے کا جزو لاینفک مانتا ہے جبکہ ''بھرت نانیہ شاستر'' کی رو سے المیہ عناصر کو اسٹیج پر پیش کرنا اشلیل ہے۔ سبق آموزی کے لیے بھی اسے اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی ڈراما ٹریجڈی کے ذریعے کتھارسس کر کے ناظرین کے ذہن کی تطہیر چاہتا ہے، جبکہ ہندستانی ڈراما رس کے ذریعے جمالیاتی تلذذ سے ہمکنار کر کے ناظرین کے ذہن کو سکھ اور شانتی سے مملو کرتا ہے۔ اگر اس فرق کو سمجھ کر اردو ڈرامے کا تجزیہ، تحقیق و تنقید ہوتی اور اس کی تراش خراش ہوتی رہتی تو اس ہیرے کی تابنا کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہوتی۔ غرضیکہ اردو ادب میں ایک ایسی صنف کا اضافہ جو ادب عالیہ میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ کیا دبستان لکھنؤ کے امتیازات و اعزازات کو استحکام بخشنے کے لیے کافی نہیں؟

حواشی:

(1) صفدر آہ۔ ہندوستانی ڈراما۔ نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی۔ 1962۔ ص: 12-13

(2) امتیاز علی تاج۔ کاروان۔ لاہور۔ 1924۔ ص: 255

(3) محمد اسلم قریشی۔ ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ 1971۔ ص: 224

(4) اقتدار الدولہ۔ تاریخ اقتداریہ۔ بحوالہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ۔ 1968۔ ص: 140-146

(5) مسعود حسن رضوی ادیب۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔ 1968۔ ص: 78

(6) عبدالحلیم شرر۔ گذشتہ لکھنؤ۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔ 1971۔ ص: 185

(7) امانت لکھنوی۔ شرح اندر سبھا۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ مشمولہ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ۔ 1968۔ ص: 180

(8) عبدالحلیم شرر۔ گذشتہ لکھنؤ۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔ 1971۔ ص: 249

(9) مسعود حسن رضوی ادیب۔ مشمولہ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ۔ 1968۔ ص: 128

(10) عبدالحلیم نامی۔ اردو تھیٹر (جلد چہارم)۔ انجمن ترقی اردو، کراچی۔ ص: 133

(11) عبدالحلیم شرر۔ گذشتہ لکھنؤ۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔ 1971۔ ص: 217

■

Prof. Shahid Husain
Flat No.: 603/7, Plot No.:1
Sector - 11, Dwarka
New Delhi - 110075

سکندر علی وجد کی نظم نگاری

مقبول احمد مقبول

اردو شاعری کی تاریخ کے ہر دور میں اور ہر علاقے میں کچھ باکمال شاعر ایسے ضرور گزرے ہیں جن کی مخصوص شعری خدمات اور ان کے منفرد اسلوب نگارش نے اردو شاعری کے سرمائے کو وقیع بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سکندر علی وجد (پ: 22 جنوری 1914 م: 16 مئی 1983) کا شمار بھی ایسے ہی باکمال شاعروں میں ہوتا ہے جن کا تعلق ضلع اورنگ آباد (دکن) کے تعلقے ویجاپور سے تھا۔ جس زمانے میں وجد کو بہ حیثیتِ شاعر شہرت ملی وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ مگر وجد نے خود کو اس تحریک سے علاحدہ ہی رکھا۔ کیوں کہ ان کا ذہن ترقی پسند تحریک کے مطالبات اور ترجیحات کو قبول کرنے میں مانع تھا۔ اگر چہ وجد کی بعض نظمیں اپنے عہد کے سیاسی معاملات اور طبقاتی کشمکش کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں لیکن یہ ان کی ترقی پسندی سے وابستگی کی دلیل نہیں بلکہ اپنے عہد اور ماحول کے درک وشعور کا اظہاریہ ہیں۔ وجد نے تغزل سے معمور کامیاب غزلیں بھی کہی ہیں اور جلال وجمال کی عکاسی کرنے والی بہترین نظمیں بھی کہی ہیں۔ نظم اور غزل کے تناسب کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وجد کا شعری سرمایہ تھوڑے فرق کے ساتھ تقریباً مساوی ہے۔ اکثر شعرا کی طرح وجد کی شاعری کا آغاز بھی غزل گوئی سے ہوا لیکن ان کی طبیعت بہت جلد نظم نگاری کی طرف مائل ہوئی اور انھیں ابتدا ہی میں نظم نگار شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔

وجد کی نظم پر نہ ترقی پسندی کی چھاپ نظر آتی ہے اور نہ جدیدیت سے اثر پزیری کا شائبہ نظر آتا ہے۔ وجد نے اپنے شعری اظہار کے لیے اردو شاعری کا روایتی طرز واسلوب اپنایا۔ دو تین نظموں سے قطع نظر وجد کی تمام نظمیں پابند نظموں کی ہیئت میں ہیں۔ وجد نے نظم کے کلاسیکی طرز واسلوب کو شعوری طور پر اختیار کر کے اسے وقار واعتبار بخشا۔ جب کہ اس دور کے بیشتر شعرا آزاد نظم اور معریٰ نظم کے گرویدہ تھے۔ اس کے علاوہ نظم میں ہیئت کے مختلف تجربے بھی کر رہے تھے لیکن وجد اردو شاعری کی کلاسیکی روایت سے وابستہ رہ کر نظم نگاری کے اس باوقار اسلوب کی توسیع بھی کی اور اسے رفعت وبلندی بھی عطا کی۔ وجد اپنی شاعری کی بارے میں خود فرماتے ہیں:

میں نے اظہار خیال کے لیے کلاسیکی اسلوب منتخب کیا۔ اور فن شعر کے اصولوں کی پابندی کرنے کی بھی امکانی کوشش کی ہے... میرے لیے شاعری جذبۂ تخلیق واظہار کی تسکین کا سامان ہے۔ اس کا مقصد نہ کوئی سیاسی انقلاب ہے نہ سماجی اصلاح۔ میرا ادبی مسلک فن برائے فن بھی نہیں ہے۔ اگر ان اوراق کے پڑھنے والوں کو نشاطِ خاطر کے چند لمحے بھی میسر آجائیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔[1]

کلاسیکی رنگ وآہنگ اور نظموں کی پابند ہیئت کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وجد کی نظم نگاری کا سلسلہ نظیر اکبرآبادی، حالی، اقبال، جوش، حفیظ جالندھری، احسان دانش اور جمیل مظہری سے ملتا ہے۔

وجد کا پہلا مجموعہ 'لہو ترنگ' 1944 میں اور دوسرا مجموعہ 'آفتابِ تازہ' 1952 میں شائع ہوا۔ یہ دونوں مجموعے حیدرآباد سے اشاعت پذیر ہوئے۔ ان دونوں مجموعوں کی ترتیب واشاعت وجد کی نگرانی میں نہیں ہوئی تھی اس لیے بقول وجد ان مجموعوں میں غزلوں اور نظموں کے ناقص متن چھپ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وجد نے اپنے سارے کلام پر نظرِ ثانی کر کے دو شعری مجموعے 'اوراقِ مصوّر' اور 'بیاضِ مریم' کے نام سے اپنی خصوصی نگرانی میں مرتب کیے جو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی سے بالترتیب 1963 اور 1974 میں شائع ہوئے۔ ان مجموعوں کی اشاعت کے بعد وجد نے اپنے پہلے دونوں مجموعے منسوخ کر دیے۔ 'جمالِ اجنتا اور جلالِ ہمالہ' وجد کا کلیات ہے جسے خود وجد نے مرتب کیا لیکن یہ ان کی وفات کے بعد 1988 میں مہاراشٹرا ساہتیہ اردو اکادمی کی مالی اعانت سے شائع ہوا۔[2]

'اوراقِ مصوّر' میں 57 نظمیں ہیں جو ہندوستان کی مشہور ومعروف تاریخی، سیاسی، علمی، وادبی شخصیات، عظیم الشان تاریخی عمارتوں، آثارِ قدیمہ، فنونِ لطیفہ، مناظرِ فطرت اور حسن وجمال کے موضوعات پر قلمبند کی گئی ہیں۔ ان نظموں سے وجد کی متنوع موضوعات سے دلچسپی اور ان کی ترجیحات کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'اجنتا'، 'ایلورا'، 'تاج محل'، 'مزدوروں کا پیغام' (طلبائے جامعہ عثمانیہ کے نام) اور 'کاروانِ زندگی' جیسی مشہور اور شاہکار نظمیں اسی مجموعے میں شامل ہیں۔ 'بیاضِ مریم' میں جملہ ستائیس نظمیں ہیں۔ ان میں 'مارلن منرو' اور 'آج' معریٰ نظم ہیں جبکہ 'امن کا پھول' آزاد نظم ہے۔ ان تین نظموں سے قطع نظر وجد کی نظمیہ شاعری کا سارا اثاثہ پابند نظموں پر مشتمل ہے۔ وجد کی بیشتر نظمیں مسدس کی ہیئت میں ہیں۔ وجد نے مسدس کی ہیئت کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ یہ ہیئت انھیں زیادہ مرغوب ہے۔ اس ہیئت میں ان کا اشہبِ قلم اپنی جولانیاں خوب دکھاتا ہے وجد کے مجموعۂ کلام 'اوراقِ مصوّر' پر تبصرہ کرتے ہوئے عرش ملسیانی لکھتے ہیں:

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ وجد کی نظم بلند اور دل کامیاب ہے۔ نظم ہو یا غزل اس کی طبیعت ہر میدان میں جولانیاں دکھاتی ہے۔ مسدس میں وہ سب سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے کامیاب نظمیں مسدس ہی ہیں۔ دبیر کا جلال اور انیس کا جمال ان مسدسوں میں موجود ہے۔[3]

وجد کا مزاج جمالیت پسند تھا جس کا اظہار تخلیقی سطح پر نظم کے علاوہ ان کی غزل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وجد کی جمالیاتی حس بڑی تیز تھی۔ وجد کو مظاہر فطرت کے ساتھ ساتھ زندگی کے نشیب و فراز میں بھی حسن کی تلاش رہتی تھی ان کی جمال پرست طبیعت اور پُرتجسس نظر ہر جگہ اور ہر چیز میں حسن کی متلاشی رہتی تھی۔ مگر انھوں نے اپنی اس حسِ لطیف کو کبھی عریانیت یا جنسیت کی کثافت سے آلودہ ہونے نہیں دیا۔ وجد نے حسن کے مختلف مظاہر کو لطافت و نفاست اور نہایت فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وجد کی جمالیت پسندی روحانی واخلاقی پہلو رکھتی ہے۔

وجد کا تخلیقی شعور فنونِ لطیفہ سے طاقت و توانائی حاصل کرتے ہوئے بارآور ہوا ہے۔ وہ انسان کی عظمت اور ترقی سے بھی متاثر تھے اور اس کی محنت لگن اور قوتِ اختراع سے بھی۔ لہٰذا جہاں کہیں انسانی تخلیق کا حسن نظر آیا وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ چاہے وہ مجسمہ سازی ہو، فنِ تعمیر ہو یا رقص و موسیقی۔ غرض وجد نے انسانی ذہن و فکر اور قوتِ اختراع کے زائیدہ فنونِ لطیفہ پر خوبصورت اور مستقل نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں بعض نظمیں تو شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ جیسے 'اجنتا'، 'ایلورا'، 'تاج محل' اور 'کاروانِ زندگی' وغیرہ۔ وجد کی یہ نظمیں خاصی مشہور بھی ہیں۔

وجد کے اپنے بیان کے مطابق نظم 'ایلورا' دو برس میں 'اجنتا' انیس برس میں اور 'کاروانِ زندگی' تیس برسوں میں مکمل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نظموں کو دلکش، متاثر کن اور خوبصورت بنانے کے لیے کتنی محنت کرتے تھے۔ سچ بھی یہی ہے کہ شاعری مسلسل ریاض چاہتی ہے۔ بار بار غور و خوض کرنے اور نوک پلک درست کرنے کے بعد ہی کوئی تخلیق فنی و فکری اعتبار سے شاہکار تخلیق کا درجہ اختیار کرتی ہے۔

نظم 'اجنتا' وجد کی شاہکار اور مشہور نظموں میں سے ایک ہے جو کئی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہے۔ یہ نظم گیارہ بند پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں وجد نے صدیوں پہلے بدھ مت کے پیرو نامعلوم فن کاروں کی جانب سے اجنتا کے غاروں میں تراشے گئے جمال پرور مجسموں کے حسن و خوبصورتی کو سراہتے ہوئے سنگ تراشی کے ان نادرِ روزگار نمونوں کے تخلیق کاروں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں:

کرشمہ ہے یہ اربابِ ہمم کی سعیِ پیہم کا
جنھیں احساس بھی ہوتا نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا
قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا
چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

فن کاری کے ان حیرت انگیز و مسرت بخش نمونوں کے پیش نظر وجد نے انھیں 'حریمِ کعبۂ فن' اور 'معبدِ نازک خیالاں' سے تعبیر کیا ہے۔ ان لاثانی مجسموں سے متاثر ہو کر وجد نے کہا ہے:

تجلی زارِ عرفاں شاہکارِ ابنِ آدم ہے
سرِ فطرت عمل کے بارگاہِ حسن میں خم ہے
تمدن منعکس ہو اس میں ایسا ساغرِ جم ہے
جمالِ زندگی ابنِ جمالِ عزمِ گوتم ہے
امیدِ جانِ تازہ پھر دلِ بسمل میں آئی ہے
تلاشِ امن میں تہذیب اس منزل میں آئی ہے
ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے
کھلیں گے راز، اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

نظم 'ایلورا' میں بھی سنگ تراشی و بت گری کے سحر انگیز اور خوبصورت نمونوں کو دیکھتے ہوئے ان کے تخلیق کاروں کی جی کھول کے پوری شاعرانہ قوت کے ساتھ پذیرائی کی ہے۔ یہ وہ فن کار تھے جنھوں نے زمانے کے سرد و گرم حالات سے بے نیاز ہو کر اور نام و نمود کی پروا کیے بغیر اپنے فن کو عبادت سمجھ کر خونِ جگر سے اس کی آبیاری کی ہے۔ دو بند ملاحظہ کریں:

عظیم عزم تھے جاں باز نقش کاروں کے
خزاں کی فکر نہ ارمان تھے بہاروں کے
دلوں میں خواب تھے بیدار کہساروں کے
نظر عقاب کی، تیشے تھے برق پاروں کے
تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں
بنائی تیشہ وروں نے خیال کی دنیا
کھلی ہوئی ہے عروج و زوال کی دنیا
جنوں نواز جلال و جمال کی دنیا
رہینِ محبتِ ماضی ہے حال کی دنیا
نجوم ڈوب گئے جلوۂ سحر کے لیے
ہوا ہے خونِ دل اس جنتِ نظر کے لیے

عشق و محبت کے یادگار کے طور پر منصۂ شہود پر آنے والی دنیا کی حسین ترین عمارت اور فنِ تعمیر کے شاہکار 'تاج محل' پر بھی وجد نے یادگارِ زمانہ نظم بعنوان 'تاج محل' سپردِ قلم کی ہے۔ وجد کے احساسِ جمال کی آمیزش نے اس نظم کو 'تاج محل' ہی کی طرح حسین و جمیل بنا دیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں جس میں غروبِ آفتاب اور طلوعِ ماہِ تمام کے وقت تاج محل کی سحر انگیز خوبصورتی کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

یہ زرد و نرم دھوپ یہ پُر کیف وقتِ شام
کندن بنے ہوئے در و دیوار، سقف و بام
خورشید کر رہا ہے تجھے آخری سلام
وہ قلبِ شرق چیر کے نکلا مہِ تمام
جوں ہی رواں سفینۂ مہتاب ہو گیا
تو موج خیز قلزمِ سیماب ہو گیا

'گہوارۂ مسیح' سفید کیکٹس کے پھول پر لکھی ہوئی خوبصورت نظم ہے۔ اس پھول کی پنکھڑیوں کی اندرونی ترتیب میں بچوں کے جھولے کی شکل بنتی ہے اس لیے اس کو گہوارۂ مسیح بھی کہتے ہیں۔ یہ پھول جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینوں میں رات کے ابتدائی حصے میں کھلتا ہے اور صرف چار پانچ گھنٹے اپنے حسن کی بہار دکھا کر صبح سے پہلے مرجھا جاتا ہے۔ پھول کی اس مختصر زندگی کے پیش نظر شاعر کہتا ہے:

لیکن ترا لباسِ عروسی کفن بھی ہے
مثلِ حباب کم تجھے عمرِ رواں ملی

نظم 'گہوارۂ مسیح' اپنے اندر وہی فطری حسن و جمال رکھتی ہے جو فطرت نے اس پھول میں رکھی ہے۔ یہ نظم بھی وجد کی خوبصورت نظموں میں سے ایک ہے جس میں فطرت کی مصوری پیش کی گئی ہے۔

'کاروانِ زندگی' وجد کی ایک اہم اور طویل نظم ہے، یہ نظم کائنات کے وجود میں آنے اور ارتقائی منزلیں طے کرنے کے جدید سائنسی نظریات کا حسین اور دلکش منظوم بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کو مکمل طور پر سمجھنے اور اس سے اچھی طرح محظوظ ہونے کے لیے ارتقائے کائنات سے متعلق جدید سائنسی نظریات سے واقفیت ضروری ہے۔ اس نظم میں وجد نے ارتقائے کائنات کے ذکر کے بعد کرۂ ارض پر زندگی کے آغاز و ارتقا اور انسانی علم و تجربے کی بنیاد پر سائنسی ترقی اور دیگر کامرانیوں کو نظم کیا ہے۔ چھبیس

بند پر مشتمل اس نظم کا پہلا اور آخری بند ملاحظہ کریں:

فضائے بے فضا میں حکم کن کا انتظار ہے
نشانِ مہر و ماہ ہے،نہ نامِ نور و نار ہے
نہ سرد وگرم وخشک و ترنہ ابرِ برق بار ہے
سکون ہی سکون ہے قرار ہی قرار ہے
ابھی چھڑا نہیں ربابِ داستانِ زندگی
عدم کی گرد میں نہاں ہے کاروانِ زندگی

کرامتِ عمل سے عزم علم فتح یاب ہے
اور ایک ذرۂ حقیر رشکِ آفتاب ہے
حیات بحرِ موج خیز،موت ایک حباب ہے
جلو میں کامرانیاں ہیں امن ہم رکاب ہے
کھلے ہوے ہیں پرچمِ پیمبرانِ زندگی
عجیب شان سے رواں ہے کاروانِ زندگی

اس نظم کے بارے میں وجد لکھتے ہیں:

یہ نظم میں نے 1939 میں بابائے اردو مولوی عبد الحق کی فرمائش پر شروع کی اور ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کی علمی اعانت اور رہنمائی اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور دوسرے اربابِ فکرونظر کی حوصلہ افزائی، دلچسپی اور اصرار سے تیس برس 1969 میں مکمل کی۔ یہ نظم میری شاعری کا حاصل ہے۔[4]

چوں کہ یہ نظم ارتقائے کائنات کے موضوع پر ہے اس لیے ادق اور مشکل معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مظہر محی الدین نے اس نظم پر ایک تشریحی مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ:

نظم کی خوبی یہ ہے کہ بوجھل سائنسی اصطلاحات کے کم سے کم استعمال کے باوجود تمام سائنسی نظریات کا اظہار خالص ادبی اسلوب میں نہایت کامیابی سے کیا گیا ہے۔ اردو میں اس دلکش لیکن مشکل اور وسیع موضوع پر ایسی کامیاب نظم اب تک کسی اور شاعر نے نہیں لکھی۔[5]

نظم 'عبدالرزاق لاری' سلطنتِ قطب شاہی کے جاں باز سپاہی کی جان نثاری اور وفاداری پر لکھی گئی ہے۔ اس سپاہی نے قلعۂ گولکنڈہ کے دروازے پر اورنگ زیب کی فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے عبدالرزاق لاری کو خریدنے کے لیے کسی منصب یا انعام کا لالچ دیا تھا۔ اس پیشکش پر اس جواں مرد اور وفادار سپاہی کا جواب وجد کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

غیرت نے گوارا نہ کیا غیر کا احساں
رد کر دیا یہ کہہ کہ شہنشاہ کا فرماں
مفتوح بد اختر کی امانت ہے دل وجاں
میں ملک ہوں مالک کی، یہی ہے مرا ایماں

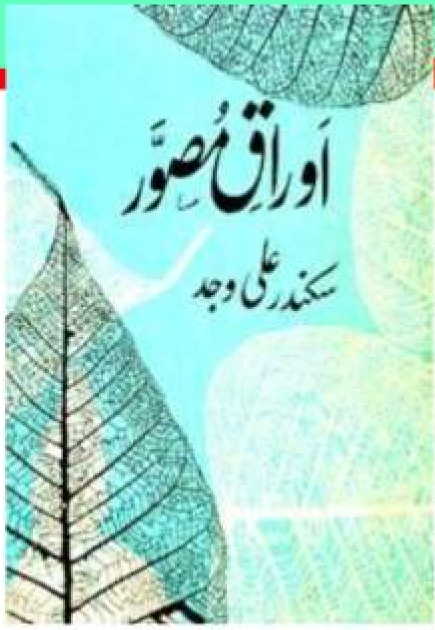

روکے سے مرا جوشِ وفا رک نہ سکے گا
گردن مری کٹ سکتی ہے سر جھک نہ سکے گا

اس نظم کے ذریعے وجد نے عبدالرزاق لاری کے کردار وشخصیت کو جاودانی عطا کی ہے۔ نظم میں بظاہر صرف لاری ہی کی جاں نثاری ،شجاعت اا ور وفا داری کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو شجاعت وجاں نثاری اور جذبۂ وفاداری جیسے قابلِ قدر انسانی اوصاف کو سراہا گیا ہے چاہے وہ کسی بھی شکل میں اور کہیں بھی ہوں۔ اسی شجاعت اور جاں نثاری کی قدر دانی وجد کی ایک اور نظم 'چاند بی بی' میں بھی نظر آتی ہے جس نے اپنے وطن کی خاطر مغل شہنشاہ اکبر کی افواج کے سامنے سینہ سپر ہوئی۔ مختلف تاریخی، سیاسی اور ادبی شخصیات پر لکھی گئی نظموں میں وجد نے ان شخصیات کے نمایاں اوصاف، کردار اور خدمات کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایسی نظموں میں اقبال، مہاراجہ کشن پرشاد، محمد علی، چکبست وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

'بیاضِ مریم' کی نظموں میں 'مارلن منرو'بارہ مصرعوں پر مشتمل معرّیٰ نظم ہے جو مشہور امیریکن ایکٹریس پر لکھی گئی ہے جس نے 1963 میں خود کشی کرلی تھی۔ 'امن کا پھول' ہندوستان کے پہلے ایٹمی تجربے کے پس منظر میں لکھی گئی آزاد نظم ہے۔ 'آج' تین بند پر مشتمل غیر مقفّیٰ نظم ہے۔ 'صبحِ شالیمار' رومان پرور نظم ہے جس میں قدرتی حسن اور انسانی حسن کی یکجائی پر شاعر کی رنگین بیانی نے نظم کو نہایت پُر کیف بنادیا ہے۔

وجد کی نظموں میں احساسِ جمال کے جلوے زیادہ ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے دور کے حادثات اور سانحات سے بے خبر تھے یا ان کی کوئی گونج ان کی شاعری میں سنائی نہیں دیتی۔ اپنے دور کے نشیب و فراز اور حادثات وسانحات پر بھی وجد کی نظر تھی۔ 'امن کا پھول'، 'ماحول' اور 'شہر آشوب' وجد کی ایسی نظمیں ہیں جو ان کی عصری آگہی کی غمازی کرتی ہیں۔ نظم 'ماحول' 1969 میں احمد آباد کے فساد پر لکھی گئی ہے۔ غزل کی ہیئت میں لکھی گئی پانچ اشعار پر مشتمل اس چھوٹی سی نظم کے دو اشعار ملاحظہ کریں جن سے فساد کی ہولناکی اور اس پر وجد کے ذہنی کرب کا اندازہ ہوتا ہے۔:

دن ہے یارات یہاں کس کوخبر ہوتی ہے
زندگی موت کے سائے میں بسر ہوتی ہے
روز ملتی ہے مہکتے ہوئے پھولوں کو سزا
روز گلشن کی زمیں خون سے تر ہوتی ہے

'شہر آشوب' بھیونڈی کے فساد 1970 سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہ بھی غزل کی ہیئت میں ہے۔ یہ نظم فساد سے تباہ شدہ شہر کا نوحہ اور متمدن انسان کی بربریت کا بہترین شعری اظہار ہے۔ دو شعر ملاحظہ کریں:

شہر میں ظلم کے آثار ملے
آدمی نقش بر دیوار ملے
راستے امن کے دشوار ملے
لوگ آمادۂ پیکار ملے

وجد کی نظموں میں غنائیت اور موسیقی کی لے انھیں خوش آہنگ اور مترنم بناتی ہے۔ وجد کے مزاج کی نفاست کا عکس ان کی نظموں میں جگہ جگہ جھلکتا ہے۔ وجد کی بیشتر نظمیں احساسِ جمال سے معمور اور حسن ودلکشی کی آئینہ دار ہیں۔ حسنِ فطرت کے اظہار میں ان کا اشہبِ قلم خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ اگر چہ وجد نے کوئی چونکانے والے تجربات نہیں کیے لیکن فطرت نگار اور جمال پرست شاعر کی حیثیت سے اردو نظم کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

حوالے :

(1) دیباچہ اورقِ مصوّر (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1963) ص6 تا7

(2) بحوالہ 'یادِ وجد'، مرتبہ عنایت علی (دارس ایجوکیشنل کلچرل چیریٹیبل اینڈ لٹریری سوسائٹی، اورنگ آباد، 2001) ص37

(3) ایضاً ص227

(4) ایضاً ص191

(5) ایضاً ص200

■

Dr, Maqbool Ahmed Maqbool
Associate Professor,Dept. of Urdu
Maharashtra Udayagiri College
UDGIR.413517 Dist Latur(M.S)
Mob:9028598414

اوم پرکاش سونی

19ویں صدی میں چھپنے والا

اخبارِ وکیل امرتسر

امرتسر کے مشہور وکیل غلام محمد شیخ نے 6 اپریل 1895 کو ہفت روزہ وکیل کا اجرا کیا۔ اس کا زرِ سالانہ چھ روپے اور ششماہی چار روپے تھا۔ 12 صفحات پر مشتمل وکیل کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد عوام کو قانون اور معلوماتِ عامہ سے آگاہ کرانا تھا۔

13 اپریل 1895 یوم شنبہ جلد 1، نمبر 2 کے پہلے صفحے پر دو کالم ہیں۔ پہلے کالم پر ہندو مسلمانوں کا باہمی اتحاد کے زیرِ عنوان طویل اداریہ ہے۔ 25 مئی 1895 (جلد 1، شمارہ نمبر 8) کے پہلے کالم پر مقاصدِ اخبار درج ہیں:

''یہ اخبار 6 اپریل 1895 کو جاری ہوا۔ اس کی اشاعت کے دو مقصد مدِ نظر رکھے گئے ہیں (1) جو اردو ملک اور قوم کی تمدن سوشل اور نارمل حالات کی اصلاح کے واسطے مفید ہوں ان کو اہلِ ملک کی خدمت میں پیش کرے، اور حاکم و محکوم کے ان تعلقات کو بیان کرے جو رعایا کی جان نثاری اور حکام کی رعایا پروری کے اصل الاصول ہوں... الخ۔

(2) جائز حقوق حاصل کرنے کا چونکہ اصلی ذریعہ گورنمنٹ کے قانون سے واقفیت حاصل کرنا ہے..... جو اصحاب انگریزی نہیں جانتے ان کو تازہ پاس شدہ ایکٹ اور فیصلہ جات بہم پہنچانا ہے... الخ۔

اخبارِ 'وکیل' کے عملۂ ادارت میں میر بشارت علی جالب دہلوی (جو پیسہ اخبار لاہور میں کام کرتے تھے) مرزا حیرت، فیروز الدین طغرائی، مولوی انشاء اللہ خاں اور مجید اللہ منہاس جیسی قابل ترین شخصیتیں شامل تھیں۔ اخبار 'وکیل' قوم پرست اور کانگریس کے سیاسی نظریات کا حامی تھا۔ اسی اشاعت میں امرتسر میونسپل انتخابات کے متعلق تفصیل درج ہے کہ 11 مئی کے اخبار وکیل میں بتایا گیا کہ میونسپل کمیٹی کے چندہ ممبر ہی منتخب ہوئے ہیں جن کی نسبت اخبارات میں غبن محصول کا الزام لگایا جا چکا ہے...... ہمیں معلوم ہوا کہ عذرداری کی درخواستوں میں صاف طور پر درج ہے کہ کچھ ممبروں پر غبن کا الزام لگ چکا ہے۔ یہ کسی وجہ سے اس لائق نہیں ہیں کہ آئندہ کے لیے ممبر تسلیم کیے جائیں۔

27 جولائی 1895 کے اخبار 'وکیل' کے صفحہ 3 پر نواب مرزا خاں دہلوی کے انتقال کی خبر چھپی ہے۔ ان کے شاگرد میر بشارت علی جالب دہلوی ایڈیٹر اخبار وکیل کا مرثیہ ڈیڑھ کالم پر چھپا ہے۔ آخر میں میر جالب کا مرقومہ قطعۂ تاریخ ہے۔ وھو ہذا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ شعر بے چراغ ہوا
میر جالب نے قطعۂ تاریخ لکھا
افسوس مرگِ حضرت استاد داغ ہوا

اور ساتھ ان کے کہنا وہ جالب کا بار بار
باغِ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا
کیوں ہوگی یہ پھوٹ کے روئے نہ شاعری
سرتاج اس کا کہنا تھا جس کو جہاں گیا
رو رو کے کہہ رہے ہیں یہ مضمون حسنِ عشق
ہم تھے غلام جس کے وہ آقا کہاں گیا... الخ

بعد ازاں انکشاف ہوا کہ مرزا داغ کے انتقال کی خبر محض افواہ تھی۔ 3 اگست 1895 کے اخبار 'وکیل' میں مرزا داغ کی رحلت کی غلط خبر چھپنے کی تردید شائع ہوئی۔

صاحبِ عالم شہزادہ مرزا خورشید عالم برادر عالی جناب حضرت استاد داغ کے نام سے ایک تار ہمارے پاس پہنچا۔ واللہ اعلم یہ کس نااہل کی بدمذاقی تھی اور اس کو ہمارے اس طرح رنج دینے اور صدمہ پہنچانے سے کیا مقصود تھا۔ استاد کی نسبت نصیب اعدا نے ایسی بدخبر اڑائی کہ ہمارے ہوش و حواس عالم بالا کی خبر لانے لگے۔ طبیعت بالکل بے قابو ہوگئی۔ اس عالم بدحواسی میں خدا جانے کیا کیا ہمارے قلم سے نکل گیا۔ گذشتہ اشاعت میں ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا۔ ہم نے لاکھ لاکھ چاہا کہ صبر دل پر جبر کریں مگر کسی صورت ممکن نہ ہوا...... بمبئی، دہلی اور عظیم آباد وغیرہ سے بھی ہمارے پاس ہمدردی اور نعوذ باللہ تعزیت کے خطوط آئے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس ناشنوا روح فرسا افواہ اڑ جانے کی اصلیت کیا تھی۔ کل صبح خاص استاد کا تار بدیں مضمون وصول ہوا کہ میں بالکل تندرست ہوں اور اچھی طرح ہوں۔ ہم وہ خوشی پورے

طور پر اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہیں پاتے جو تار پڑھ کر ہم کو حاصل ہوئی۔ پہلی تار برقی نے خرمن عقل و ہوش پر بجلی گرائی تھی اور یہ جان رفتہ پھر بدن میں آئی اور اظہار کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ناظرین خود اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں جس نے افواہ سن کر اس درجہ صدمہ اٹھایا ہو۔ اس کو گویا دوبارہ زندہ ہو جانے پر کس قدر فرحت ہوگی۔ غنچۂ خاطر جو پژمردہ و افسردہ ہو گیا تھا ازسرنو کھل گیا مگر دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ یہ خدشہ بھی آج کے مہری و دستخطی خط نے دور کر دیا۔

بدیں مژدہ گرجاں فشانم رو است
کہ ایں مژدۂ آسائش جاں ماست

24 جنوری 1896 کے وکیل میں چھپا اداریہ ملاحظہ ہو:

''ایک مٹھی بھر اہل یورپ ہمارے ملک میں بود و باش رکھتے ہیں لیکن ان کے اخبارات کی حالت ایسی ہے کہ جیسے یورپ کے اچھے اچھے اخبارات ہوں۔ ان کے ہم قوم ان سے بڑی رعایتیں کرتے ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب نے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کو تمام سرکاری کاغذات اور کتابوں کے چھاپنے کا ٹھیکہ پندرہ

ایک مٹھی بھر اہل یورپ ہمارے ملک میں بود و باش رکھتے ہیں لیکن ان کے اخبارات کی حالت ایسی ہے کہ جیسے یورپ کے اچھے اچھے اخبارات ہوں۔ ان کے ہم قوم ان سے بڑی رعایتیں کرتے ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب نے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کو تمام سرکاری کاغذات اور کتابوں کے چھاپنے کا ٹھیکہ پندرہ سال کے لیے دے رکھا ہے اور ہر سال لاکھوں روپے کا بل ہوتا ہے۔ جس نرخ پر یہ سرکاری ٹھیکہ دیا گیا ہے بہت لوگ اس سے نصف سے کم نرخ پر اس ٹھیکہ کو لینے کی آرزو رکھتے ہیں۔

سال کے لیے دے رکھا ہے اور ہر سال لاکھوں روپے کا بل ہوتا ہے۔ جس نرخ پر یہ سرکاری ٹھیکہ دیا گیا ہے بہت لوگ اس سے نصف سے کم نرخ پر اس ٹھیکہ کو لینے کی آرزو رکھتے ہیں... الخ۔

اخبار وکیل نے انگریزی سرکار کے اس غیر مساویانہ سلوک پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ پنجاب گورنمنٹ اور اس کے حکام نے ہندوستانیوں کو نظر انداز کیا ہے۔

25 مئی 1896 کے اخبار وکیل کے اداریہ کا اقتباس ہے کہ:

''ہمیں اس خبر سے نہایت خوشی ہوئی کہ ملک کے سچے خیر خواہ اور ہمارے معزز دوست لالہ کنہیا لال پلیڈر چیف کورٹ نے اپنے لڑکوں کو دیسی ساخت کے کپڑے کی دکان کھلوانے کا ارادہ کیا ہے۔ ہمارے دوست اس سے ہندوستانیوں کے لیے دو نظیریں قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

ایک تو یہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اپنے دیش کا بنا ہوا کپڑا پہننا چاہیے۔ دوسرے وہ خالی پند و نصائح اور سبھی لیڈری تقریروں سے گریز کریں اور عملی طور پر وہ ایسا کر کے دکھائیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ دیسی کپڑا پہننے اور دیسی ساخت کی چیزیں استعمال کرنے کا عہد کر لیں اور ہر شہر میں مقتدر اشخاص مل کر مشترکہ سرمایہ سے دیسی ساخت کی اشیا کے بہم پہنچانے اور ان کے عمدہ بنانے کا انتظام کریں تو ملک کی بہت سی دولت ملک میں ہی رہ سکتی ہے۔ اور ملک میں خوشحالی اور ترقی ہو سکتی ہے... الخ''

اس اداریے کے جزئیات سے ظاہر ہے کہ اخبار وکیل عملی طور پر قوم پرست نظریے کا حامی تھا اور وہ ملکی عوام کو ذہنی طور پر بیدار کرنے کے لیے پیش پیش تھا۔

31 جنوری 1898 کے وکیل کی اشاعت میں آزادی تحریر پر پابندی عائد کرنے کی مخالفت میں جو اداریہ چھپا وہ اس طرح تھا:

''سرکار چاہتی ہے کہ ڈاک خانہ کے ذریعے باغیانہ مضامین کی اشاعت نہ ہو اور اس وجہ سے ڈاک خانہ کے افسران کو اختیار دے گی کہ جس تحریر کو باغیانہ سمجھیں بذریعہ ڈاک خانہ جانے سے روک دیں۔ سوال یہ ہے کہ فیصلہ کون کرے گا؟ ڈاک خانہ میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے اہل ملک کے حقوق پامال کرنے کے خواہاں نہ ہوتے ہوں کہ سرکار ان کے ساتھ رعایت کرے۔ کیا ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی آزادی چھوڑ دی جائے گی۔ جدید قانون ڈاک خانہ میں جو اس وقت ملک میں کوئی عام شورش دیکھی جائے اس وقت افسران ڈاک خانہ کو اختیارات حاصل ہوں گے کہ وہ جس تحریر یا مطبوعہ کاغذ کو چاہیں روک دیں گے۔ اس امر کے فیصلے کے لیے کہ آیا اس کا وقت آ گیا ہے یا نہیں کہ

لالہ کنہیا لال وکیل امرت سر کے مشہور کانگریسی رہنما تھے جن کا کٹرہ شیر سنگھ میں منڈوا تھا۔ جہاں ڈرامے اور جلسے ہوا کرتے تھے۔ حاجب متکلم فلموں کا زمانہ آیا تو اس منڈوے کا نام لائل ٹاکیز رکھا گیا۔
مارچ 1947 کے فسادات میں یہ جلا دیا گیا۔ اب یہ سنیما ریجنٹ ٹاکیز کے نام سے موجود ہے۔

کاغذات کی اشاعت روکی جائے...''

14 اپریل 1898 کے وکیل میں سرسید احمد خاں کے انتقال کی خبر چھپی۔ اس کا اختصار یہ ہے:

''27 مارچ 1898 بوقت شب سرسید احمد خاں انتقال کر گئے وہ پیشاب رک جانے کی وجہ سے علیل تھے۔ نماز جنازہ میں نواب محسن الملک منشی ذکاء اللہ، خواجہ محمد یوسف رئیس شہر علی گڑھ، شمس العلما مولوی نذیر احمد اور مولوی سمیع اللہ جماعت سمیت حاضر ہے۔

30 مارچ کو سوم کی تقریب میں مسلم کالج کے طلبا بھی شریک ہوئے۔ فیصلہ ہوا کہ چندہ جمع کر کے سرسید احمد خاں کی شاندار قبر تعمیر کی جائے۔

اخبار وکیل 20ویں صدر کے آغاز میں ہفت روزہ کے بجائے سہ روزہ ہو گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے 13 اپریل 1904 میں اخبار ہذا میں بطور مدیر معاون ملازمت اختیار کی۔ آٹھ ماہ کے بعد ماہ نومبر میں وہ کلکتہ چلے گئے۔ بعد ازاں اگست 1907 میں 1908 تک وکیل کے عملہ ادارت میں شامل رہے۔ 1908 میں اپنے والد کی علالت کی وجہ سے وہ پھر کلکتہ چلے گئے۔ سہ روزہ اخبار وکیل امرتسر کی بیش بہا قومی خدمات کا اعتراف علمائے ہند نے کیا لیکن اب اس عظیم المرتبت اخبار کی اہمیت کو فراموش کر دیا گیا ہے۔

نوٹ: اخبار 'وکیل' کے پرانے فائل کم یاب ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شاید کچھ فائل ہیں۔ ملک کی کچھ یونیورسٹیوں میں بھی چند فائل ہو سکتے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس اخبار وکیل امرتسر کے کچھ شمارے ہیں جو دیمک کا رزق بن رہے ہیں۔

■

Mr. Om Parkash Soni (Journalist)
H.No-151-B-S63, Vijay Nagar Near Millan Palace Batala Road
Distt.: Amritsar (Punjab)

رؤف خیر

خداداد خاں مونس کی یاد میں

چوبیس دسمبر 2017 کی رات جے پور سے راز صاحب نے اور ٹونک کے سہیل خان صاحب نے یہ بری خبر سنائی کہ راجستھان کی بے مثال شخصیت جناب محمد خداداد خاں مونس سے دنیائے بے ثبات خالی ہوگئی۔ پورے ہندو پاک میں قطعہ، تاریخ اس تیزی اور بڑے ہنر سے نکالنے والے جناب مونس کے علاوہ شاید ہی کوئی ہو۔ لوگ اب ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے قطعۂ تاریخ نکالیں۔ تاریخ نکالنا تو خیر ایک تکنیکی کمال کا اظہار ہے ورنہ مونس تو بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ حمد، نعت منقبت، سلام، نظم وغزل ہر صنفِ سخن میں انھوں نے اپنی پہچان چھوڑی ہے۔ خاص طور پر تاریخ نکالنے کا فن تو اردو ادب سے ناپید ہوتا جارہا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل اس فن کو زندہ رکھے۔ شعر وادب کو زندہ رکھنے کے جتن کرنے والے پیدا ہوں مگر مونس صاحب کی آرزو کے یوں پوری ہونے کا امکان کم ہے کہ نئی نسل کی ادبی تربیت کرنے والے خود بے ادب ہیں۔ اتفاق سے مجھے ایک نیشنل یونیورسٹی میں ایم۔اے اردو کے پرچے جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ بعض کاپیاں تو ایسی ہوتی ہیں گویا کسی چوتھی یا پانچویں جماعت کے طلبہ نے لکھی ہوں۔ نہ املا صحیح نہ انشا صحیح۔ ایسے میں خداداد خان مونس جیسے بے پناہ قلم کار کی توقعات پر پورے اترنے والے بھلا کہاں ملیں گے۔

شاعر کی حیثیت سے مونس نے سب سے پہلے گرو گرنتھ صاحب میں شامل حضرت بابا فرید گنج شکر کے ایک سو بارہ اشلوک کا منظوم اردو ترجمہ کرکے چونکایا جو 'ترجمان الفرید' کے نام سے 1993 میں راجستھان اردو اکادمی جے پور سے شائع ہوا۔ مونس صاحب نے اپنی نعتوں کے ذریعے 'سعادت کبریٰ' حاصل کی جو 2011 میں منظر عام پر آیا۔ پھر سلام ومناقب پر مشتمل 'بخشش کی راہوں' سے وہ 2012 میں گزرے۔ اگلے برس 2013 میں غزلیات 'پُر فضا' سے ادبی دنیا کو مہکایا۔ پابند نظموں کو مونس نے 2014 میں 'طاقِ نسیاں' کے حوالے ہونے نہیں دیا۔ 2015 اور 2016 میں کہی ہوئی غزلیات جناب مونس کی باقیات ہیں ظاہر ہے انھوں نے تادم حیات اپنا قلم ہاتھ سے نہیں رکھا۔ باقیات الصالحات پتہ نہیں کب سورج کی روشنی دیکھے۔

قطعۂ تاریخ ہی منٹوں میں نکالنے والے کے لیے شعر کہنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے چنانچہ جناب مونس کی یادگار دستاویز کی صورت ترجمان الفرید سعادت کبریٰ، بخشش کی راہوں میں، پُرفضا شعری سفر کبھی کسی طاق نسیاں' کے حوالے ہونے والا نہیں۔ تصنیفات کے ساتھ ساتھ مونس نے تالیفات کے ذریعے بعض ایسے قلم کاروں کو گوشہ گم نامی سے نکالا جنھیں ان کے اپنے گھر والوں نے فراموش کررکھا تھا۔ جیسے شمیم جے پوری، مخمور سعیدی، احترام الدین شاغل، بلرام کھوسلہ واقف، لکشمی نارائن فارغ، منشی عبدالحمید کا (دیوان اخگر) مولوی اشفاق رسول کا' کلام جوہر' وغیرہ۔

جناب خداداد خان مونس کئی زبانیں جانتے تھے۔ آپ نے خواجہ معین الدین چشتی کے کلام کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

اردو ہندی ترجمہ بھی اپنے پیچھے چھوڑا۔ جناب مونس کے مضامین، مقالات اور مقدمات پر مشتمل ''بکھرے اوراق'' 2016 میں طبع ہوئے۔

سب سے حیرت ناک کارنامہ تو جناب مونس کی 'مشکوٰۃ التاریخ' ہے جس کے ہر صفحے پر چونکانے والے مادہ ہائے تاریخ ان کی ہنرمندی کے منہ بولتے شاہ کار ہیں۔ ایک حکیم حاذق کی طرح وہ اپنا فن نئی نسل کو سونپنا چاہتے تھے مگر ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں۔ جناب مونس نے تاریخ منقوطی وتاریخ غیر منقوطی نکال کر بھی حیران کرڈالا۔

ایسی نابغۂ روزگار ہر فن مولا ہستی کے گزر جانے کا جتنا ملال کیا جائے کم ہے۔ وہ حضرت خواجہ اجمیری کے غالی معتقد تھے۔ اللہ جناب مونس کو جوار خواجہ میں جگہ دے۔

ہر اہم کام' نام اور مقام کو تاریخی حیثیت دے کر یادگار بنادینے کے لیے فن تاریخ گوئی سے کام لیا جاتا ہے جس کے لیے ابجد ایک حیرت ناک ذریعہ اظہار ہے کچھ سودائی میر کو خدائے سخن کہتے ہیں اور کچھ اہل تدبیر انیس کو سخن کی خدائی حوالے کرتے ہیں ہمارے خیال میں خداداد خاں مونس خدائے ابجد ہیں۔

ان کے دماغ کے کمپیوٹر میں تاریخیں ڈھلتی رہتی ہیں۔ ابجد پر جناب مونس کو اتنی زبردست دسترس ہے کہ ہر شعر کے پہلے مصرعے سے ہجری تو مصرع ثانی سے عیسوی تاریخ برآمد کریں۔ عنوانات' ذیلی عنوانات' اپنے نام حتیٰ کہ اپنے پتے سے بھی مونس دلچسپ تاریخ نکال لیتے ہیں۔

فن تاریخ گوئی کے انوکھے موضوع پر خداداد خان مونس کی ایک لاجواب وبے مثال کتاب مشکوٰۃ التاریخ ہے۔ جس کے ہر ہر صفحے پر تاریخ گوئی کے حیران کن نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ کتاب کے ٹائیٹل سرنامے سے لے کر آخری صفحے تک ایسی دل کش تاریخیں پائی جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فن ابجد کو مونس گھول کر پی گئے ہیں۔

کتاب کا پہلا صفحہ ملاحظہ فرمایئے:

مشکوٰۃ التاریخ 2008
یعنی مادہ ہائے تاریخ کی فکر رسا 2008
از خداداد خان مونس 1429ھ
بودوباش... الفھا، جے پور روڈ، اجمیر، الہند 2008
از بس مطبوعہ راجستھان اردو اکیڈمی جے پور
دو ہزار بارہ عیسوی 2012

موصوف کا اسم گرامی محمد خداداد خان بجائے خود تاریخی نام ہے جس سے ہجری تاریخ 1357ء برآمد ہوتی ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ بعنوان 'ایک فن تاریخ گوئی کا' مونس نے لکھا اور اس عنوان ہی سے کتاب کی تاریخ

اشاعت 1429 برآمد ہوتی ہے۔ پچیس صفحات کو محیط اس پیش لفظ میں ابجد کے قاعدے اور نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ انکشاف بھی دلچسپ ہے کہ مونس کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے والد منشی محمد ایوب خاں فضا کو عالم خواب میں خواجہ اجمیری کی طرف سے مخملیں طغرے میں سنہرے حروف کے تاروں سے کشیدہ ایک قطعہ آویزاں دکھایا گیا

توکل پہ رہ چین سے کام رکھ
یہ فرزند فرخندہ فرجام رکھ
خدا نے محمد کا صدقہ دیا
'محمد خدا داد خاں' نام رکھ

چنانچہ فضا صاحب نے اپنے نومولود بیٹے کا نام محمد خداداد خاں رکھا جس سے ان کی تاریخ پیدائش 1357 برآمد ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ اجمیری نہ صرف اردو میں شعر کہنے پر بھی قدرت رکھتے تھے بلکہ تاریخ گوئی میں بھی ملکہ رکھتے تھے۔ محمد خداداد خاں ماشاء اللہ خداداد صلاحیتوں کے حامل ہوئے مونس تخلص اختیار کیا اور فن تاریخ گوئی میں ایک زندہ کرامت سمجھے جاسکتے ہیں۔ کہیں کہیں تو سیدھی سیدھی تاریخ نکل آتی ہے کبھی کبھی تعمیہ وتخرجہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ تعمیہ کی مثال دیکھیے:

مونس نے حسرت سے کہا
مرحوم مفتوں کوٹوی

دوسرے مصرعے کے اعداد (1312) میں حسرت کے اعداد (668) جمع کرلیے جائیں تو 1980 برآمد ہوتی ہے جو مفتوں کوٹوی کی تاریخ وفات ہے۔

تخرجہ کے لیے غالب کا قطعہ پیش ہے جو ان کے بھائی میرزا یوسف کی وفات پر لکھا گیا تھا:

زسال مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف
کہ زیستے بہ جہاں درزخویش بیگانہ
یکی درانجمن از مین ہمی ہ شرحش کرد
کشیدم آہے وگفتم 'دریغ دیوانہ'

(دریغ دیوانہ) کے اعداد میں سے (آہ) کا تخرجہ کریں تو میرزا یوسف کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ تخرجے کی بہترین مثال مومن خاں مومن کا وہ معرکتہ الآرا شعر ہے جس سے شاہ عبدالعزیزؒ کی تاریخ وفات (1239ھ) برآمد ہوتی ہے:

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے
فقر و دیں فضل وہنر لطف وکرم علم وعمل

جگر مرادآبادی کے انتقال پر مونس نے (اندوہ حضرت جگر مرادآبادی) سے 1960 تاریخ وفات نکالی اور ہجری تاریخ (1380) سولہ اشعار کے ایک قطعے کے آخری شعر سے تخرجہ کے قاعدے سے نکالی۔

سرکیا ادب کا کٹ گیا
بے روح ہے جسم غزل

ان کی کتاب مشکوۃ التاریخ دراصل مصباح خداداد ہے جس کی روشنی مونس ادب ہے۔

جس طرح فن تاریخ گوئی سے نئی نسل تقریباً نابلد ہے اسی طرح بعض اصناف سے بھی بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ خاص طور پر پابند نظمیہ شاعری سے شاعروں نے ہاتھ اٹھالیا ہے۔ مسدس ومخمس مرثیہ نگاری کی حد تک رہ گئے ہیں چار چار مصرعوں پر مشتمل بند STANZA اب نظموں میں کم کم ہی دکھائی دیتے ہیں آزاد نظموں کی بن آئی ہے۔ مگر جناب مونس نے 'طاق نسیاں' کی نذر ہوجانے والی اصناف کو حیات نو بخشی۔ ان کی ایک طنزیہ نظم 'جرم' کے دو شعر دیکھیے:

غلط ہمنوائی سے بیزار ہوں میں
مراجرم یہ ہے میں سچ بولتا ہوں
میں اقبال کرتا ہوں نادم نہیں ہوں
مراجرم یہ ہے میں مجرم نہیں ہوں

عید اور دیوالی پر کہی ہوئی نظمیں بھی ان کی سیکولر فکر کی ترجمان ہیں۔ انھوں نے رمضان کی آمد پر سحریاں لکھیں جن کو طاق نسیاں کی زینت بنادیا گیا ہے البتہ ان میں رمضان اور سحری کو غیر متحرک باندھا گیا۔

رمضان کی (میم) اور سحری کی (ح) متحرک ہونی چاہئے تھی۔ مونس کی ایک رباعی ہے۔

روزوں کی بھی کیا بات ہے اللہ غنی
دنیا نظر آنے لگی جنت جیسی
ہرصبح بصوم غدنویت کی پھوار
ہرشام ہے انی لک صمت سے دھلی

نویت بصوم غد یعنی کل کے روزے کی آج نیت باندھنا عجیب لگتا ہے جب کہ جس دن کے روزے کی سحری کی جاتی ہے وہ اسی دن کے روزے کے لیے ہی تو ہوتی ہے۔ ہندو پاک میں ننانوے فی صد تقسیم کیے جانے والے نظام الاوقات میں روزے کی یہی نیت درج ہوتی ہے۔

مونس نے عزیز واقارب کی شادیوں اور دیگر تقاریب کے موقعوں پر سہرے اور نظمیں کہی ہیں جنھیں 'طاق نسیاں' کی نذر ہوجانے سے بچالیا گیا ہے۔ بعض اہم شخصیات کے گزر جانے پر دردناک تعزیتی نظمیں بھی مونس نے کہی ہیں جیسے مولانا ابوالکلام آزاد پنڈت نہرو لال بہادر شاستری شاہ فیصل کی وفات پر نظمیں ان اکابرین سے مونس کی وابستگی کی غماز ہیں شاہ فیصل کی شہادت پر کہی ہوئی نظم میں ایک ضرب المثل مصرع کو بڑی خوبی سے اپنالیا گیا ہے:

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

خداداد خان مونس کی خداداد صلاحیتیں کسی ایک صنف میں محدود نہیں ہیں ان کا شعری مجموعہ 'پرفضا' ان کی غزلیات پر مشتمل ہے۔ غزلیات پر مشتمل پرفضاء کے لیے جناب مونس نے تاریخ گوئی کی اپنی روایت سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے غزلوں میں روایتی اقدار کی پاس داری کی۔ بیشتر اشعار متوجہ کرتے ہیں۔

مونس کبھی تھا پیشۂ آباسپہ گری
اب شاعری ذریعہ عزت کی بات ہے

عطروعطار کی روایت کو دہراتے ہوئے مونس فرماتے ہیں:

کیا لطف تعارف میں فن کار اگر بولے
معراج ہنر یہ ہے خود منہ سے ہنر بولے

عموماً عہدے کی وجہ سے شاعر کو داد سے نوازا جاتا ہے اس پر مونس کا طنز ملاحظہ فرمائیے:

میں اب سمجھا وہ رشتہ کرسی و دفتر کا رشتہ تھا
مجھے دھوکا ہوا تھا مجھ سے الفت ہے زمانے کو
نئی نسلو تمہارے ہی لیے ہے
ہمارے پاس جو تھوڑا بہت ہے
اگر چلنا ہے کوئی سر اٹھا کر
سمجھ لیجیے کہ قد چھوٹا بہت ہے

مونس نے کچھ ایسی غزلیں بھی کہی ہیں جو قوالی کی ضرورت پوری کرتی ہیں

زندگی مجھ کو لے آئی ہے اب وہاں دشمنی بھول جاتے ہیں دشمن جہاں
میرے جینے کی اب کوئی صورت نہیں اب تو صورت دکھانے چلے آئیے

اپنی روایت کے برخلاف مونس نے اپنی اس کتاب کی کوئی تاریخ نہیں نکالی۔

ہم ان کی خدمت میں چار مصرعے پیش کرتے ہیں آخری مصرعے سے 2016ء تاریخ برآمد ہوتی ہے جسے اس تبصرے کی تاریخ بھی سمجھا جاسکتا ہے:

غزلوں میں عجب رنگ ملا ہے مونس
تاریخ گوئی کا تو معجزہ ہے مونس
کیا خوب یہ تاریخ نکل آئی ہے
مجموعۂ شاعری بھی پرفضا ہے مونس

■

Dr. Rauf Khair
Moti Mahal, Golconda
Hyderabad - 500008 (Telangana)
Mob.:09440945645
Email.:raoofkhair@gmail.com

میں جارہا ہوں میرا انتظار مت کرنا

انور جلال پوری

محمد فرحان خان

لوگ ابھی سال نو کے جشن میں منہمک تھے۔ایک دوسرے کو مبارکباد دینے کا سلسلہ ابھی شروع ہی ہوا تھا اور سال نو کی خوش آمدید کے لیے شعرائے کرام سر جوڑ کے مصرعے پہ مصرع لگانے کی جہد کر رہے تھے کہ دفعتاً ایک اندوہ ناک خبر نے ادبی دنیا بالخصوص اردو شاعری کے ادبی وتہذیبی ارض وسما میں انور جلالپوری کے سانحہ ارتحال نے غم و ماتم کا طوفان برپا کردیا۔گزشتہ سال انتظار حسین، ندا فاضلی، سلمٰی صدیقی، مختار مسعود، اسلم پرویز، بانو قدسیہ وغیرہ علمی وادبی جلیل القدر شخصیات کی محرومی اردو ادب میں بے تحاشہ محسوس کی جارہی تھی کہ 2 جنوری 2018 کو انور جلالپوری بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔

انور جلالپوری 6 جولائی 1947 میں امبیڈکر نگر کے جلالپور میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔ امتیازی نمبروں کے ساتھ ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اودھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی دوسری ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حصول تعلیم کے بعد این ڈی اے کالج جلالپور میں بطور انگریزی لیکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے اور یہیں سے ریٹائر بھی ہوئے۔آپ کی علمی و ادبی بصیرت، لیاقت، ذہنیت اور صلاحیت کا یہ عالم تھا کہ آپ سابق چیرمین مدرسہ تعلیمی بورڈ (لکھنؤ،اتر پردیش) رہے۔ممبر اکز یکیوٹیو کمیٹی، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ کے رکن رہے۔ حج کمیٹی اتر پردیش کے سابق ممبر رہے۔ساتھ ہی ساتھ سابق ممبر اکز یکیوٹیو کمیٹی اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ رہے اس کے علاوہ آپ مرزا غالب انٹرمیڈیٹ کالج جلالپور کے فاؤنڈر صدر اور منیجر بھی تھے۔

انور جلالپوری کی مطبوعہ تصانیف میں، کھارے پانی کا سلسلہ (مجموعہ غزل)، خوشبو کی رشتہ داری (مجموعۂ غزل) جاگتی آنکھیں (مجموعہ غزل) روشنائی کے سفیر (مضامین کا مجموعہ) بعد از خدا (نعتیہ مجموعہ) ضرب لا الہ (نعتیہ مجموعہ) اپنی دھرتی اپنے لوگ (مضامین کا مجموعہ دیوناگری) راہ رو سے راہنما تک (منظوم سیرت خلفائے راشدین) اردو شاعری میں گیتا (نغمہ علم و عمل، گیتا کے مفہوم کا منظوم ترجمہ) اور اردو شاعری میں گیتانجلی (رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی کے مفہوم کا ترجمہ) وغیرہ متعدد معتبر کتابیں ہیں۔ لہٰذا ان مختلف تصانیف کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

انور جلالپوری کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے انھیں، اتر پردیش اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی ایوارڈ، میر اکادمی ایوارڈ، ہندی ساہتیہ سمیلن ایوارڈ، بزم اردو ادب اور ریش بھارتی وغیرہ انعام واکرام سے نوازا گیا۔ الغرض ان کی قدآور ادبی شخصیت میں اور اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستانی ٹیلی وژن پر سیریل اکبر مہان کے مکالمے اور گیت بھی قلم بند کیے ہیں اور ہندوستانی فلم ڈیڑھ عشقیہ میں ایک مشاعرے کے دوران آپ کو نظامت کرنے کا موقع بھی فراہم ہوا ہے،

انور جلالپوری کی شخصیت کا عکس کئی رنگ میں جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔وہ ایک ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خطیب ومقرر بھی تھے۔معروف شاعر، ادیب و مترجم بھی تھے اور ناظم مشاعرہ بھی۔انور جلالپوری کو یکساں طور پر چار زبانوں (اردو، انگریزی، ہندی اور فارسی) پر قدرت حاصل تھی۔

جہاں تک انور جلالپوری کی شاعری کا سوال ہے تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شاعرانہ اور خطیبانہ صلاحیت وبصیرت ان کی فطرت اور مزاج میں باہمی طور پر رچی بسی تھی۔وہ ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تو تھے ہی لیکن مشاعروں میں ان کی نظامت محض ثانوی درجہ رکھتی تھی۔ دور حاضر میں بلاشبہ کسی بھی مشاعرے کی کامیابی کی دلیل اور ادبی محفلوں کی آبرو انور جلالپوی ہی تھے۔ان کی غزلیہ شاعری عام طور پر روایتی حسن وعشق کا سنگم ہے۔حسن وعشق کی رومانوی پرکشش فضا اور دردِ دل، سوز وفراق کی آتش زدہ کیفیات، لفظی پیکر تراشی میں ڈھلی ہوئی ہے۔اس کے علاوہ معاشرتی نظام، مذہبی ہم آہنگی، انسانی احساس، سماجی اور تہذیبی رواداری، زوال پزیر معاشرہ، اخلاقی قدر و قیمت، سیاسی انتشار اور بے چینی و بے قراری ان کی شاعری کا خاص محور ہے۔موضوعات کا تنوع ان کی شاعرانہ صلاحیت کی ضمانت ہے۔غرض کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ہر طرح کے مضامین اور موضوعات کو بڑے فن کارانہ انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

چاہو تو میری آنکھوں کو آئینہ بنا لو
دیکھو تمھیں ایسا کوئی درپن نہ ملے گا
تم پیار کی سوغات لیے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمھیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا
نہ جانے کیوں ادھوری ہی مجھے تصویر جچتی ہے
میں کاغذ ہاتھ میں لے کر فقط چہرہ بناتا ہوں

انور جلالپوری نے کلاسیکی شعریت کو گاہے گاہے اپنی شاعری میں ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ کبھی وقت کی ستم ظریفی

کے آگے خود کو جھکنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ خودداری اور دانشمندی کے جذبے کا ہمیشہ پاس رکھا۔ زمانے کی گردش اور تقاضوں کے مطابق انھوں نے اپنی شاعری کو پھوہڑ پن سے آزاد رکھا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

تمھیں یہ ضد ہے کہ شاعری میں تم اپنے اسلاف سے بڑے ہو
اگر یہ سچ ہے تو پھر سنا دو بس ایک ہی شعر میر جیسا

موت سے کس کو رستگاری ہے، زندگی ہے تو موت آنا لازم ہی نہیں بلکہ زندگی کا اصل مفہوم ہے کہ موت برحق ہے۔ ہر شخص کو زندگی کا بوجھ ڈھونا ہے چاہے اس کی سمت و رفتار کچھ بھی ہو۔ انور جلالپوری کی شاعری میں مختلف ایسے اشعار جا بہ جا نظر آتے ہیں جو انسان کے سفر حیات کی داستان اور ماضی کے احساسات کا اعتراف ہیں۔ مثلاً

کوئی پوچھے گا جس دن واقعی یہ زندگی کیا ہے
زمیں سے ایک مٹھی خاک لے کر ہم اڑا دیں گے

قیام گاہ نہ کوئی نہ کوئی گھر میرا
ازل سے تا ابد صرف اک سفر میرا

اب گزری ہوئی عمر کو آواز نہ دینا
اب دھول میں لپٹا ہوا بچپن نہ ملے گا

انور جلالپوری کے شاعرانہ شعور، شعری ذوق وشوق، لفظی و معنوی پیکر تراشی، شعریت اور موزونیت، افہام و تفہیم، علامتی و استعاراتی انداز بیان اور تخیلاتی وجدان کی عمدہ پیش کش کے لحاظ سے وسیم بریلوی کا کہنا ہے کہ ''انھوں نے شاعری کے معیار اور وراثت کو زندہ رکھا ہے''۔

مشاعروں اور ادبی محفلوں کو اپنی پر کشش آواز اور منفرد لب و لہجے سے نئی نسل کی شاعری کو آباد رکھنے میں انور جلالپوری کی اہمیت ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے بھی نمودار ہوتی ہے۔ ناظم مشاعرہ دراصل مشاعروں میں اپنی مؤثر آواز، لہجہ اور حسن تخاطب سے سامعین پر ایسا جادو کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ سامعین میں بیزاری کی کیفیت پیدا نہ ہونے پائے۔ ان تمام حربوں کے بخوبی استعمال سے کہ، جن سے شرکا کے ذوق وشوق کو مزید دوبالا کیا جا سکے، انور جلالپوری خوب واقف تھے۔ جیسے جیسے مشاعروں کے معیار پر زوال آتا گیا، شعری نشستیں محض تفریح گاہ میں تبدیل ہوتی رہیں، گویوں نے شعراء کا مقام حاصل کر لیا، شاعرات ترنم، حسن آواز اور دلکشی کا سامان بن گئیں اور شرکا و سامعین کے شعری ذوق پر جذباتیت غالب آ گئی، ایسے نامناسب حالات میں بھی انور جلالپوری نے وقت سے سمجھوتا نہیں کیا بلکہ اپنی شائستہ نظامت کے فرائض کو قائم و دائم رکھا۔ اپنی نظامت کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ ''شاعری سے نابلد شعراء و شاعرات کو مشہور شاعر و شاعرہ کہہ کر بلانا پڑا''۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا

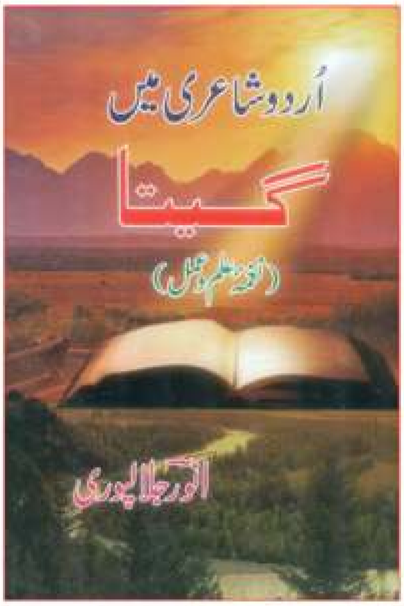

ہے کہ وہ مشاعرے کے زوال، ماحول اور طریقہ کار سے سخت رنجیدہ اور بیزار تھے۔

اردو شاعری میں منظوم ترجمے کی دلکش روایت کو انور جلالپوری نے مزید دوبالا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کاوشوں سے شریمد بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کر کے اردو شاعری کے دامن کو اور بھی وسعت عطا کر دی ہے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہندو مذہب کی عقیدت اور تاریخ کو متعارف کرانے کا عجیب و غریب کارنامہ انجام دیا ہے۔ اردو شاعری میں گیتا، نغمۂ علم و عمل کے نام سے ان کا یہ شاہکار منظوم ترجمہ ادبی اعتبار سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ گیتا کے اس منظوم ترجمے کا انتساب ''ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور امن عالم کی خواہش رکھنے والے تمام شریف انسانوں کے نام ہے''۔ اس انتساب سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انور جلالپوری کس قدر مشترکہ تہذیب کے نمائندے اور حامی تھے۔ بلا تفریق مذہب و ملت، نسلی امتیازات اور ذات پات سے پاک ذہنیت انور جلالپوری کی شخصیت کی خاص شناخت رہی ہے۔ وہ سیکولر نظریہ عمل کے نمائندے کی حیثیت سے ہمیشہ ایک قدم آگے رہے۔ مذہبی شدت پسندی ان کی فطرت سے کوسوں دور تھی۔ مثلاً

ہم کاشی و کعبہ کے راہی ہم کیا جانیں جھگڑا بابا
اپنے دل میں سب کی الفت اپنا سب سے رشتہ بابا
ہر انسان میں نور خدا ہے ساری کتابوں میں لکھا ہے
وید ہو یا انجیل مقدس ہو قرآن کہ گیتا بابا

ہندو مسلم یا دیگر مذاہب کی قدر و منزلت کا عالم یہ تھا کہ وہ کسی مذہبی نظریہ یا خوش عقیدگی کو کمتر یا برتری کے قائل نہیں تھے بلکہ انسانیت کے شیدائی اور درس انسانیت ان کا مذہب تھا۔ ان کے نزدیک اخلاق انسانیت ہی دراصل قرآن، گیتا، انجیل، اور وید مقدس کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ کسی ایک پاکیزہ اور روحانی اثر و رسوخ کے عقیدت مند نہ تھے بلکہ کاشی و کعبہ اور مندر و مسجد کو کثرت میں وحدت کی علامت تصور کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں جا بہ جا ایسے اشعار کافی حد تک نظم کیے گئے ہیں جو مذکورہ پس منظر کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

انیکتا میں جہاں ایکتا ملی انور
ہم اس دیار کو ہندوستان کہنے لگے

میں انساں ہوں مرا رشتہ براہیم اور آزر سے
کبھی مندر کلیسا اور کبھی کعبہ بناتا ہوں

رابندر ناتھ ٹیگور کی قابل قدر تصنیف گیتانجلی کا انور صاحب نے منظوم ترجمہ کیا ہے جو اپنی شعریت کے لحاظ سے کافی اہم ہے۔ چونکہ گیتانجلی مختصر گیتوں کے الہامی اور روحانی احساسات کا شاعرانہ اظہار ہے جس نے ٹیگور کو حیات جاویداں بخشی ہے۔ اس کا مطالعہ کریں تو بقول انور جلالپوری۔

''ایسا لگتا ہے کہ کوئی صوفی اپنے وجد کی آخری منزل میں پہنچ کر کچھ ایسے الفاظ منہ سے نکال رہا ہے جنھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے مگر سمجھا نہیں جا سکتا۔''

گیتانجلی کا پہلا اردو ترجمہ نیاز فتح پوری نے کیا۔ بعد میں فراق گورکھپوری نے اسے رومانیت اور دلکش انداز میں ترجمہ کیا۔ انور جلالپوری خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میں نے جس نثری ترجمے کے مفہوم کو شاعری بنایا ہے وہ فراق گورکھپوری کا نثری ترجمہ ہے۔ مختصر یہ کہ انور جلالپوری نے گیتانجلی کے منظوم ترجمے کے ذریعے ٹیگور کی ادبی شخصیت کو محض بنگالی ادب تک محدود نہ رکھا بلکہ ان کے گیتوں کو اردو شاعری کا معتبر حصہ بنا دیا۔

انور جلالپوری کی ادبی خدمات اپنی جگہ مسلم ہیں۔ شاعری میں مختلف نوعیت کے موضوعات اور محرکات کو بروئے کار لانا درحقیقت باصلاحیت شاعر کی اصل شناخت ہوتی ہے اور یہ صلاحیت انور صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ رومانوی انداز کی روایتی شاعری جہاں انور جلالپوری کی خاصی اہم ہے وہیں سب سے اہم اور قابل فہم ان کی مذہبی اور نعتیہ شاعری بھی ہے۔

مختصر یہ کہ انور جلالپوری تو اس داعی اجل کو لبیک کہہ کر رخصت ہو گئے، جاتے جاتے وہ یادوں کا ایک کارواں چھوڑ گئے۔

■

Mohd Farhan Khan
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

اردو شاعری میں پھولوں کا تذکرہ

محمد یاسین گنائی

شاعری چاہے کسی بھی زبان میں ہو یا کسی بھی خاص و عام شاعر کی ہو، اس میں شاعر کے تخیل و ادراک، لفظیات، جذبات، احساسات، خواہشات، موضوعات اور نفسیات کی عکاسی ایک لازمی چیز ہوتی ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی، کشمیری، اردو اور دیگر زبانوں میں ایسے لازوال شعرا گزرے ہیں، جنھوں نے اپنے تخیل اور ادراک کا استعمال کرکے عام وخواص لوگوں کو حیران کیا ہے۔ انگریزی کے شیکسپیئر، جان ملٹن، یا ورڈز ورتھ ہو یا فارسی کے مولانا رومی یا حافظ شیرازی، عربی کے امرو القیس، عمرو بن کلثوم، حسان بن ثابت ہوں یا کشمیری زبان کے نند ریشیؒ، حبہ خاتون، غنی کاشمیری، وہاب خار، مہجور یا ہماری اردو زبان کے میر، درد، غالب یا اقبال ہوں۔ ان شعراء کے کلام میں جہاں عشق حقیقی ومجازی، تصوف، سیاست، انسانی نفسیات، غم وخوشی، جانوروں اور پرندوں کا ذکر ملتا ہے وہاں انھوں نے پھولوں کے ذکر سے بھی اپنی شاعری کو منور کیا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی موضوع نہیں ہوگا جس کو اردو شعراء نے اپنی آفاقی شاعری میں نہ سمیٹا ہو، کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جس کو موضوع سخن نہ بنایا گیا ہو۔ اور یہ رسم الفت اردو شاعری میں پھولوں کے تذکرہ کے حوالے سے بھی سچ ثابت ہوئی ہے۔ حالانکہ پھولوں اور اس کی مختلف اقسام واجزاء کو اردو شعراء نے تراکیب، محاورات، ضرب المثل، کہاوتیں، تشبیہات، استعارات، مجاز مرسل، شعری مجموعوں کے نام اور دیگر کئی معاملات میں استعمال کیا ہے۔ جیسے گلاب کا پھول، پتھر کے پھول، برف کے پھول، پھولوں کی شہزادی، برگ گلاب، سرخ گلاب، سرخ پھول، نرگس بیمار جیسی تراکیب، استعارات وتشبیہات کا برجستہ استعمال کیا ہے۔

اردو میں خصوصاً غزل گوئی میں تمام شعرا نے پھولوں کا تذکرہ اپنی شاعری میں نہایت مہارت کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں پر ہم غزل گو شعراء کے حوالے سے مختلف پھولوں کا تذکرہ اردو شاعری میں کن کن صورتوں میں ہوا ہے اور ان پھولوں کی طبعی اہمیت پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ جتنا قریبی رشتہ انسان کا اپنے حقیقی محبوب، والدین اور دیگر اقارب سے ہوتا ہے کچھ ایسا ہی رشتہ اردو شعراء کا ان پھولوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ حالانکہ ہمارے ناقدین نے یہ شکایت کی تھی، کہ ہمارے شعراء کو مغرب کے پھول نظر آتے ہیں مگر برصغیر کے پھولوں کی مہک کچھ بھلی نہیں لگتی ہے۔ ان باتوں سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہے، ہم صرف پھولوں کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر
پھول ہے صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

جب ہم پھولوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں باغ، باغبان، چمن، مالی، گلشن، گلستان، پھول، کانٹا، گل، پتی، شاخ، ٹہنی، کیاری غرض بہت کچھ آتا ہے۔ گویا پھولوں کے تذکرے سے اس کے پورے خاندان کا تذکرہ لازمی بن جاتا ہے۔ لیکن جب اردو شاعری میں پھولوں پر کی گئی شاعری تلاش کی جاتی ہے تو اس کے لیے ایک مضمون تو کیا ایک ضخیم کتاب سے بھی کام نہیں چلے گا۔ اردو شعرا کے چند اشعار جن میں پھولوں کا تذکرہ آیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں
ستم نو بہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں
تماشائے گل و سرو وصنوبر دیکھتے جاؤ!
یہ حسرت رہ گئی کن کن مزوں سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے
الہٰی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے
کلی سے رشک گل آفتاب مجھ کو کرے
آج بھی شاید کوئی پھولوں کا تحفہ بھیج دے
تتلیاں منڈلا رہی ہیں کانچ کے گلدان پر
اگرچہ پھول یہ اپنے لیے خریدے ہیں
کوئی جو پوچھے تو کہہ دوں گا اس نے بھیجے ہیں

غم عمر مختصر سے ابھی بے خبر ہیں کلیاں
نہ چمن میں پھینک دینا کسی پھول کو مسل کر

کانٹے تو خیر کانٹے ہیں اس کا گلہ ہی کیا
پھولوں کی واردات سے گھبرا کے پی گیا

کانٹوں سے دل لگاؤ جو تا عمر ساتھ دیں
پھولوں کا کیا جو سانس کی گرمی نہ سہ سکیں

خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو
مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

پھول کھلے ہیں لکھا ہوا ہے توڑو مت
اور مچل کر جی کہتا ہے چھوڑو مت

پھولوں کی نازکی ہی نہیں دیکھنے کی چیز
کانٹوں کی سمت بھی تو نگاہیں اُٹھا کر دیکھ

شبنم کے آنسو پھول پر یہ تو وہی قصہ ہوا
آنکھیں مری بھیگی ہوئی چہرہ ترا اُترا ہوا

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

دنیا میں پھولوں کی ہزاروں اقسام ہیں اور ہر ایک پھول کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ یہاں پر ہم ضمنی طور پر چند پھولوں کی طبی اہمیت پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ ان پھولوں کے مثبت اثرات سے عام وخاص لوگ واقف ہو جائیں۔ پھولوں کے طبی فوائد کے ساتھ ساتھ ہم ان پھولوں پر لکھے گئے چند اہم اشعار بھی پیش کرتے چلیں گے۔

املتاس: املتاس مذکر ہے اور اس کے لغوی معنی ایک لمبی پھلی کے ہیں جس کا مغز مسہل کے لیے دیا جاتا ہے۔ 'املتاس' پھول کی خوشبو معدے کی گرانی اور جلن کو دور کرتی ہے، نزلہ، زکام، ناک کا بند رہنا دور کرتی ہے یہ قبض کشا ہے اور بلڈ پریشر کم کرتی ہے۔ اس پھول کا اصل وطن افریقہ ہے۔ اس کی پھلی کا گودا جو بدبودار اور سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کو عربی میں 'خیار شنبر' کہتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

وہ چمن کہ وہ سرخ گھونگچی کے پھول
املتاس اور مال کنگنی کے پھول

بیلا: 'بیلا' ایک قسم کا عجیب وغریب پھول ہے کہ اس کی خوشبو رومان پرور ہوتی ہے مگر گرم مزاج لوگوں کے لیے اس کی خوشبو اچھی نہیں ہوتی ہے۔ گویا عشق مزاجوں کے لیے باعث مسرت اور گرم مزاجوں کے لیے باعث بے چینی ثابت ہوتا ہے۔

بنفشہ: 'بنفشہ' مونث ہے اور یہ ایک خودرو بوٹے کا نام ہے جو برفانی پہاڑوں پر یا لب دریا پیدا ہوتا ہے۔ 'بنفشے' کی خوشبو آنکھوں کی سوزش اور جلن دور کرتی ہے، یہ بخار کا آسان اور موافق علاج ہے اور کھانسی میں کمی کرتی ہے۔ اس سے نزلہ زکام میں خاصی کمی آتی ہے۔ اس سفید رنگ کے پھول کا مترادف زُلف ہے۔ درجنوں اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں بنفشہ کا نام ملتا ہے۔

بنفشہ، ریاحین، سیوتی گلاب
ہزارا چنبیلی گل آفتاب

سائیں کے مکھ گلال تھے مستی عشق اب چڑھی
دور کروں بنفشہ رنگ پیرہن آج پور کر

بنفشئی ہوش اگر وہ خوش ادا ہوئے
بنفشہ رشک سے جل کر یلہ ہوئے

جہاں پہ بیٹھ کے زلفوں کو تونے شانہ کیا
سب اس زمین کا تختہ بنفشہ زار ہوا

پر ہیز اپنا اوہی بنفشہ نے توڑ کے
دوپیے بھر کا سیر بھی آزاد کردیا

رنگ بنفشہ مٹ گیا، سُنبل تر نہیں رہا
صحن چمن میں زینت نقش ونگار ہوچکی

چنبیلی: 'چنبیلی' ایک خوشبودار پھول کا نام ہے جو ہیئت کے لحاظ سے چوڑا ہوتا اور مونث ہے۔ اس کو انگریزی میں (Jasmine) کہتے ہیں۔ اس کا مترادف یاسمین ہے اور''یاسمیں'' مونث ہے۔ اس سے پہلے پاکستان کا قومی پھول کنول تھا۔ اس کا سونگھنا تپ محرقہ کی اسہالی کیفیت میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ سفید رنگ کا خوشبودار پھول دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک زرد رنگ کا ہوتا ہے جس میں زیادہ خوشبو نہیں ہوتی ہے اور دوسرا سفید رنگ کا جس میں نہایت خوشبو ہوتی ہے۔ اگر 'چنبیلی' کے پھول کی طبی اہمیت پر نظر ڈالیں، تو ماہرین کا ماننا ہے کہ چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو سے بے خوابی دور ہو جاتی ہے اور سرسام کے مریض پر اچھے اثرات چھوڑتی ہے۔ طبی اثرات چاہے کیسے بھی ہوں لیکن ایک ادب نواز کی نظر اس پر رہتی ہے کہ ہمارے متقدمین نے اس کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے۔ تو پیش خدمت ہے چنبیلی یا یاسمین پر لکھے گئے چند اہم اشعار

پھر تمھیں روز سنواریں، تمھیں بڑھتا دیکھیں
کیوں نہ آنگن میں چنبیلی سا لگا لیں تم کو

پیار کس کا ملا ہے مٹی میں
اس چنبیلی تلے مہک ہے وہی

وہ پھولی چنبیلی کھلا موگرا
کھلا چاندنی باغ میں جابہ جا

نرگس ہیں آنکھیں اور گل زنبق وہ ناک ہے
رخسار دونوں گل ہیں گل یاسمیں جبیں

دھریک: 'دھریک' کے پھول کی خوشبو وبائی امراض اور متعدی امراض کو پھیلنے سے روکتی ہے۔ جوں ایک اینٹی بایوٹک کام کرتا ہے اسی طرح کا کام کچھ اللہ تعالیٰ نے دھریک کے ذمے رکھا ہے۔ وبائی امراض کی جڑ سیلاب، طوفان، قحط، خشک سالی اور دیگر آسمانی اور زمینی آفات ہوتی ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں اس آسمانی و زمینی آفات کا خطرہ ہو، وہاں لوگوں اور حکومت کو دھریک جیسے پھولوں کی کاشت زیادہ سے زیادہ کرنی چاہیے۔ تاکہ وقت آنے پر ان کا مثبت اثر لوگوں کی جانوں پر پڑے۔

رات کی رانی: 'رات کی رانی' کو کون نہیں جانتا مگر اس بات سے کم لوگ واقف ہوں گے کہ اس پھول سے سردرد، اعصابی تناؤ، ذہنی تھکاوٹ قلب دور ہوتی ہے۔ یہ پھول رات کے وقت کھلتا ہے اور اسی دوران اپنی مہک سے اردگرد کے ماحول کو بھی تروتازہ کردیتا ہے۔

رات کی رانی کا جھونکا یا کسی کی یاد تھی
دیر تک آنگن میرے احساس کا مہکا رہا

زعفران: کشمیر جس کو جنتِ بے نظیر کہا جاتا ہے یہاں زعفران کے پھولوں کی تعداد بے حساب ملتی ہے۔ 'زعفران' کے پھولوں کو سونگھنے سے ہونٹوں پر ہنسی آجاتی ہے دماغ میں تروتازگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ذہنی پریشانی اور خلفشار کو دور کرتی ہے۔ اس کا دوسرا نام کیسر ہے۔ یوں 'زعفران' مونث ہے۔ اصطلاحی معنوں میں زعفران ایک خاص قسم کے پودے کے اندر والے بیج کا نام ہے جو تار، ریشے یا گچھے کی شکل میں زرد رنگ کا باہر نکل آتا ہے۔ اس پودے کی جڑ پیاز سے ملتی جلتی ہے۔ اس پودے پر تین رنگ کے پھول اُگتے ہیں جن میں پیلا، نارنجی اور بینگنی شامل ہیں، اگر چہ تینوں کی اچھی خاصی قیمت ملتی ہے مگر زعفران نارنجی رنگ کا ہوتا ہے اور سب سے خوشبودار اور قیمتی ہوتا ہے۔ زعفران کی متعدد تراکیب بھی استعمال کی جاتی ہیں جن میں'' مشکِ زعفران، عطرِ زعفران، شاخِ زعفران، زعفران زار، رنگِ زعفران، مہکِ زعفران وغیرہ۔ کشمیر کے شعراء کے علاوہ دنیا بھر کے شعراء نے زعفران کی اصطلاح اپنی شاعری میں طرح طرح سے استعمال کی ہے۔

بجا ہے رُخِ زرد پر میرے ہنسنا
کہ ہے رشک یہ تختہ زعفراں کا

عنبر ہو رعود ومشک و زعفراں کا روت آیا ہے
اس تھے باس انو کا جگ میں کرتا ہے گلستانی

صرف گر اس کے تصدق میں نہ ہو ہنگام صبح
پھر گل خورشید میں ہے کون شاخ زعفران

بھلا رہے یہ دماغ سمجھا ہے
آپ کو شاخ زعفران تو نے

کرنا کا پھول: 'کرنا' کے پھول بھی اپنی ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس وجہ سے کچھ زیادہ ہی ہے کہ مرزا غالب نے اپنی شاعری میں پھول 'کرنا' کا استعمال کیا اور عام وخاص لوگوں کو ذہنی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ لیکن جب دیوان غالب کے تمام نسخوں اور کلیات غالب پر نظر ڈالتے ہیں تو غالب کی شاعری میں وہ شعر کہیں موجود ہی نہیں ہے، جس کو غالب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شعر اس طرح سے گڑھ لیا گیا ہے۔

اے مالن مجھے کرنے دے چاہے اس کے پیسے لیں

چاہے حقیقت کچھ بھی ہو لیکن پھولوں میں 'کرنے' نام کا پھول موجود ہے۔ اس پھول کی خوشبو نظام ہضم کو تقویت دیتی ہے، اس کے سونگھنے سے بھوک لگتی ہے، یہ قے کو روکتی ہے، اختلاج قلب کو دور کرتی ہے۔ گویا یہ پھول ہاضمے سے لے کر قلب کی بیماری تک کو دور کرتا ہے۔

کیوڑا: کیوڑا لفظ مذکر ہے اور اس کا درخت اور پھول دونوں خوشبودار ہوتے ہیں۔ 'کیوڑا' کے پھول مقوی اعضائے رئیسہ اور دل ودماغ کو سکون بخش ہوتا ہے۔ یہ پھول گلی کی مانند ہوتا ہے اس لیے کیوڑے کی گلی کہلاتا ہے۔ چنانچہ کیوڑا کی خوشبو سے انسان کا دل ودماغ راحت محسوس کرتا ہے۔ کب ایسا وقت آئے گا کہ لوگ اپنے صحن میں اس قسم کے پھول اُگانا شروع کریں گے۔

گل کیوڑے کہتا ہے کہ کیا تجھ کو تراشا ہے
اور کیتکی کہتی ہے صندل کا تراشا ہے
عرق بہار خراب ہے وہی چھڑکیں گے آپ پر
نہ تو بید مشک ہے گھڑی، نہ تو کیوڑا نہ گلاب ہے

گُلِ موگرہ اور گلِ چڑی: 'گلِ موگرہ' کا سونگھنا دل ودماغ کو تقویت دیتا ہے۔ یہ ایک قسم کی بڑی بیلی ہوتی ہے۔ گل موگرہ جہاں دل ودماغ کو راحت پہنچاتا ہے وہاں گل موگرہ کی شاعری نے بھی اپنا خاص جلوہ دکھایا ہے۔ گلِ چڑی' کو سونگھنے سے مرگی میں فائدہ ہوتا ہے۔ دونوں گل اپنی اپنی طبعی افادیت میں خاصے اہم ہیں لیکن شاعری میں صرف موگرہ کا استعمال ملتا ہے۔

بہار جاکے جو آتا ہے اس خزاں کا وقت
تو موگرا ہے نہ چنپا نہ سیوتی مخمل
کہتا ہے کنول ہر دم میں پاک نمازی ہوں
اور موگرا کہتا ہے میں مرد ہوں غازی ہوں
ہار میں گوندھ لوں اگر پھول ہوں خانہ باغ میں
اب کے برس تو موگرا گھر میں کھلا نہ باغ میں

گیندا: گیندا مذکر ہے اور اس کے لغوی معنی گل صد برگ کے ہیں۔ یہ ایک قسم کا زرد یا نارنجی پھول ہوتا ہے۔ خوشبو اور خوبصورتی کے لحاظ سے اول نمبر کا پھول ہوتا ہے۔ شاعری میں اس کا جگہ جگہ ذکر ملتا ہے

چھاتی سے گیندا بازی کر، گیندا کان پر گھر
دل کو جھپٹ لیا ہے آج آ کے اس ادا سے
جو بن گیندا ہے، لب لالہ، زبان سوسن، انگلیاں نرگس
ہوئے ہیں پھول ہوا تنے تن، بارے قد کی ڈالی سوں

مولسری: مولسری مونث ہے اور یہ نہایت خوشبودار پھول ہوتا ہے۔ جو لوگ سانپ اور بچھو والے علاقے میں رہتے ہیں اُن کو 'مولسری' کے پھول اُگانے چاہیے کیونکہ ان کی خوشبو سے سانپ اور بچھو بستر پر نہیں آتے ہیں۔ اس کا ذکر اردو شعراء نے کھل کر کیا ہے

طرفہ چمن حسن میں ہے نخل ترا قد
کرتا جو ہے اے سرو رواں مولسری کا
رابیل، گیندا اور مولسری، مدمالت، پیلا اور سمن
دوپہری، گیندا، گل لالہ، نافرماں، کرنا، بان مدن
مدھ مالتی، ناگیر اور مولسری کرنا
دوپہر یا د اودی، گلچھیں کنٹھل پرنا

موتیا: ایک خوبصورت پھول ہوتا ہے۔ 'موتیا' مونث ہے اور اس پھول سے سرخ رنگ کی پھلیاں نکلتی ہیں۔ ان پھلیوں کے خاصے طبعی فوائد ہیں۔ 'موتیا' کے پھول ذہنی پریشانی اور بے خوابی کو دور کرنے کے علاوہ خون کی حدت کو بھی کم کرتی ہے۔ یوں ایک دماغی طور پر پریشان انسان اور موٹے انسان کو اور جس کا خون موٹا ہو چکا ہو اور تینوں زندگی سے زیادہ موت کو اہمیت دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن موتیا ہی ان کے مرض کی دوا بنتا ہے۔ ہمارے شعراء نے بھی موتیا کی طبعی وطبی اہمیت یوں اُجاگر کی ہیں۔

حنا، موتیا اور خس بیچتی ہوں
میں شیشی میں پھولوں کا رس بیچتی ہوں

موتیا دانت ہوں لب برگ گل خوبی ہوں
کان دونوں صدف گوہر محبوبی ہوں
کیا ہے لالاں کی جوانی، کیا ہے وہ موتیا کی جھلک
کیا وہ شبنم جو کہے گل کا تری خو کے اکل
موتیا ریشم نظر آیا جو کل بازار میں
پھر گئی آنکھوں میں گردن اور باہوں کی لچک
موتیا کھان سے کچھ کم نہیں چشم عاشق
اشک بھی دیکھ نکلتے ہیں گہر سے باہر
عرق نے گل کیا جس بہار حسن سیں مونہہ پر
گلابی باغ کی یہ موتیا کیا خوب ترقی ہے

نیلوفر: نیلوفر مذکر ہے اور ایک نیلے رنگ کا پھول ہوتا ہے۔ فیروزاللغات میں اس کے معنی یوں دیے ہیں۔ ایک قسم کے نیلے پھول کا نام جو پانی میں پیدا ہوتا ہے اور اس کا دوسرا نام کنول ہے۔ یہ ایک سدا بہار پھول ہے، یورپ میں جوزف بینگٹن نے 1787 میں اس کو اُگانا شروع کیا تھا۔ اس کی جڑ مٹی میں ہوتی ہے اور پتیاں پانی پر تیرتی ہیں۔ یہ دنیا کے چوڑے اور لمبے ترین پھولوں میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ یہ پھول تین میٹر تک پھیلتا ہے اور اس کی پتیاں 60 ملی میٹر اور پھول بیس ملی میٹر تک پھیل سکتا ہے۔ اس کو مختلف مذاہب میں الگ الگ قسم کی رسموں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اتنا مقدس ہوتا ہے کہ مہاتما بدھ کے مجسمے میں ان کو پھول پر ہی بیٹھتے ہوئے دکھا یا جاتا ہے۔ اس کے سونگھنے سے امراض چشم میں اور پیاس کی تسکین میں مدد ملتی ہے۔ اس کا مترادف کنول (Lotus) ہے۔ یہ ہندوستان کا قومی پھول بھی ہے۔ عام طور پر یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک نیلوفر آفتابی ہوتا ہے جو سورج نکلنے کے وقت کھلتا ہے۔ چونکہ طلوع آفتاب کے ساتھ یہ بھی کھلتا ہے اس وجہ سے آفتابی کہلاتا ہے۔ دوسرا نیلوفر ماہتابی کہلاتا ہے کیونکہ اس کی بیلیں شام کے وقت کھلتی ہیں جب چاند نمودار ہونے لگتا ہے۔ ایک دن میں اور دوسرا رات کو

کھل کر اپنی بہار دکھاتا ہے۔

آرائش ایسی اور وہ گل ہائے رنگ رنگ
اوقی ساجن میں غنچہ نیلوفر آسمان
مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہل نظر
مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر

(اقبال)

جسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول

(اقبال)

غم کی لو سے دھڑکتے دلوں کے کنول بجھ گئے
دھوپ میں کیسے کھلتے وہ جو چھاؤں کے پھول تھے

نرگس: نرگس ایک انتہائی قسم کا خوبصورت اور خوشبودار پھول ہے۔اس کے پتے گھاس کی مانند ہوتے ہیں مگر چوڑے اور بڑے ہوتے ہیں۔یہ موسم سرما میں پودے کے بیچ میں سے ایک شاخ سے نکلتے ہیں اور اس کا رنگ سفید ہوتا ہے۔سفید پھول کے درمیان پتوں کے دو زرد ہالے ہوتے ہیں جو اس کی آنکھیں مانی جاتی ہیں۔نرگس کے پھول سردرد اور زکام میں فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔نرگس کو شعراء نے مجازاً معشوق کی مست آنکھ سے تشبیہ دی ہے۔اردو شاعری میں سب سے زیادہ اشعار اسی پھول کے لیے موزوں کیے گئے ہیں:

میر دیکھو گے رنگ نرگس کا
اب جو وہ مست خواب نکلے گا
اس لطف سے نہ غنچہ نرگس کھلا کبھو
کھلنا تو دیکھ نیم اس مژہ باز کا
لڑاتے آنکھ جو دیکھا چمن میں نرگس سے
صبا نے برگ ہزارا کی آستیں پکڑی
پھر گیا دامن نظارہ گل نرگس سے
آنکھ اٹھا کر جو کبھی تو نے ادھر دیکھ لیا
نرگس نے پھر نہ دیکھا جو آنکھ اٹھا چمن میں
کیا جانے کس نے کس سے کیا کرلیا چمن میں
نرگس کو تب سے ہرگز دیکھا نہیں ہوں پیارے
گلشن میں جب سے تو نے آنکھیں بتائیاں ہیں
گھورتی ہے تم کو نرگس آنکھ پھوڑا چاہیے
گل بہت بنستے ہیں کان ان کا مروڑا چاہیے
مخاطب ہیں وہ نرگس سے چمن میں
جھکائے آنکھ ہم شرما رہے ہیں

نرگس اتنا حسین اور خوبصورت پھول ہے کہ خدائے سخن اور غم کے شاعر میر نے نرگس کو مختلف طریقوں سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا
ہو خشک تو بہتر ہے وہ ہاتھ بہاراں میں
مانند نئے نرگس جو جام نہیں رکھتا
تیرے جلوے کا مگر رو تھا سحر گلشن میں
نرگس اک دیدہ حیران تماشائی تھا
میر دیکھو گے رنگ نرگس کا
اب جو وہ مست خراب نکلے گا
کس طور تو نے باغ میں آنکھوں کے تئیں ملا
نرگس کا جس سے رنگ شگفتہ بھی اڑ چلا
پھول نرگس کے لیے بھشک کھڑا تھا راہ میں
کس کا چشم پرفسوں نے میر کو جادو کیا
اس نرگس مستانہ کو دیکھے ہوئے برسوں
افراط سے اندوہ کی بیمار ہوا میں

مرزا غالب کی شاعری میں ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا ہوا ملتا ہے اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے نرگس کی تشبیہ اور اس کا استعارہ استعمال نہ کیا ہو۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تری طرف ہے بہ حسرت نظارہ نرگس
بہ کوری دل و چشم رقیب ساغر کھینچ
گل کھلے غنچے گلے اور صبح ہوئی
سرخوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی
باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چارسوں گر سیر چمن آنکھ دکھایا ہے مجھے

شاعر مشرق علامہ اقبال کی اردو شاعری میں پھولوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا
محروم عمل نرگس مجبور تماشا ہے

(انسان)

رہتی ہے سدا نرگس بیمار کی تر آنکھ
دل طالب نظارہ ہے، محروم نظر آنکھ

(شبنم اور ستارہ)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(طلوع اسلام)

ہم نشین نرگس و شہلا، رفیق گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایہ بلبل ہوں میں

(رخصت اے بزم جہاں)

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

(تصویر درد)

نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی یاد ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن

(ساقی نامہ)

امریکہ اور افریقہ کے مختلف شہروں میں پھولوں کے ذریعے بادشاہوں، شاعروں اور تاریخی شخصیات کے مجسمے بنائے گئے ہیں جو انتہائی دلکش اور دیدہ زیب ہیں۔ 2005 میں چینی سائنسدانوں کے ایک گروپ نے زراعت پر آٹھ سال کی ریسرچ کے بعد ایک' اورچڈ پھول' بنایا جس کی شکل اور پتیاں باقی تمام پھولوں سے مختلف ہیں۔اس کی فروخت دو لاکھ امریکن ڈالر میں کی گئی۔اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ باغبانی کے ذریعے کتنا منافع بخش کاروبار کیا جاسکتا ہے۔ایک اور پھول 'کادوپل' پھول ہے یہ بھی مہنگے ترین پھولوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہ پھول آدھی رات کو کھلتا ہے اور پھر مُرجھا جاتا ہے اس پھول کو سری لنکا کے کچھ مقامات پر دیکھا گیا ہے۔ٹیولپ بلب کو سترھویں صدی میں سب سے مہنگا پھول تصور کیا جاتا تھا۔شاعری کے حوالے سے مہنگا ترین پھول گلاب ہی مانا جاتا ہے۔

امریکه اور افریقه کے مختلف شہروں میں پھولوں کے ذریعے بادشاہوں، شاعروں اور تاریخی شخصیات کے مجسمے بنائے گئے ہیں جو انتہائی دلکش اور دیدہ زیب ہیں۔ 2005 میں چینی سائنسدانوں کے ایک گروپ نے زراعت پر آٹھ سال کی ریسرچ کے بعد ایک' اورچڈ پھول' بنایا جس کی شکل اور پتیاں باقی تمام پھولوں سے مختلف ہیں۔ اس کی فروخت دو لاکھ امریکن ڈالر میں کی گئی۔اس بات سے اندازہ ہوتا ہے که باغبانی کے ذریعے کتنا منافع بخش کاروبار کیا جاسکتا ہے۔ایک اور پھول 'کادوپل' پھول ہے یه بھی مہنگے ترین پھولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یه پھول آدھی رات کو کھلتا ہے اور پھر مُرجھا جاتا ہے اس پھول کو سری لنکا کے کچھ مقامات پر دیکھا گیا ہے۔

یوں تو گلاب دیسی بھی ہوتا ہے اور بدیسی بھی۔ دنیا میں گلاب کی 20 ہزارسے زیادہ انواع واقسام پائی جاتی ہیں، جبکہ رنگوں کے اعتبار سے بھی یہ سفید، سرخ، صندلی، نیلاپیلا اور کئی رنگوں کا ہوتا ہے۔ چین میں 5 ہزار سال قبل گلاب کی کاشت شروع ہوئی تھی۔ اس طرح چین پہلا ملک ہے جس نے گلاب کو کاشت کاری اور کاروبار کے لیے پیدا کرنا شروع کیا تھا۔ 1986 میں دنیا کے طاقت ور ملک امریکا کے کانگریسی صدر ریگن نے گلاب کو امریکا کا قومی پھول قرار دیا تھا۔

گلاب: ’گلاب‘ کو انگریزی زبان میں روز (Rose) کہتے ہیں، جوکہ ایک فرانسیسی زبان کا لفظ ہے۔ علم نباتات کے مطابق گلاب کے پودے کا خاندان (Roseceac) کہلاتا ہے۔ اور اردو گرامر کی بات کریں تو ’گلاب‘ مذکر ہے۔ انگریزی زبان کے مشہور ڈراما نویس شیکسپیئر نے اپنے معروف ڈرامہ ’رومیو اینڈ جیولیٹ‘ (Romio and Joilet) میں گلاب کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا تھا:

”نام کی کیا اہمیت ہے، گلاب کو جس نام سے پکارو اس کی مہک کم نہیں ہوگی۔“

یوں تو گلاب دیسی بھی ہوتا ہے اور بدیسی بھی۔ دنیا میں گلاب کی 20 ہزار سے زیادہ انواع واقسام پائی جاتی ہیں، جبکہ رنگوں کے اعتبار سے بھی یہ سفید، سُرخ، صندلی، نیلا پیلا اور کئی رنگوں کا ہوتا ہے۔ چین میں 5 ہزار سال قبل گلاب کی کاشت شروع ہوئی تھی۔ اس طرح چین پہلا ملک ہے جس نے گلاب کو کاشت کاری اور کاروبار کے لیے پیدا کرنا شروع کیا تھا۔ 1986 میں دنیا کے طاقت ور ملک امریکا کے کانگریسی صدر ریگن نے گلاب کو امریکا کا قومی پھول قرار دیا تھا۔ درآمد کے حوالے سے ہالینڈ کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ جرمنی کو گلاب کی کاشت میں برآمد کی صف میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ 600 قبل از مسیح میں یونان کی معروف شاعرہ سیفو نے ’گلاب‘ کو پھولوں کی ملکہ کا خطاب دیا تھا۔ دنیا میں سب سے خوشبودار گلاب دمشق (شام) میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک سدا بہار پھول ہے اس کی خوشبو مفرح دل ودماغ ہے مقوی ارواح ہے، قوتِ شامہ کی کمزوری کا ازالہ کرنا مقصود ہو تو گلاب کے تازہ غنچے کو سونگھنا مفید ہے۔ اس کی خوشبو بے خوابی کے عارضہ کو دور کرتی ہے، ضعف دماغ ونسیاں کے لیے مفید ہے۔

اٹلی میں گلاب کا ایک عجیب وغریب کاروبار کیا جاتا ہے۔ یہاں گلاب کی سوکھی پتیوں سے نرم نرم بستر بنائے جاتے ہیں۔ گلاب کے بنے ان گدوں اور تکیوں پر سونے کا آرام ہی کچھ الگ قسم کا ہوتا ہے۔ اسی طرح رومن میں لوگ ’گلاب‘ کی پتیوں اور عطر گلاب کو کھانے پینے کی چیزوں پر چھڑکتے ہیں۔ عثمانیہ سلطنت کی آخری نشانی ترکی میں گلاب کا پھول ایک خاص رسم ورواج کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں جب کوئی ذی عزت وذی وقار مہمان آتا ہے تو اس کا استقبال ”عرق گلاب، عطر گلاب، گلاب آب“ وغیرہ سے کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب قدیم زمانے کے بادشاہ اپنے تمغوں پر اکثر وبیشتر گلاب کا عکس چھاپ دیتے تھے یا اس کا نقش تمغوں پر چھاپا جاتا تھا۔ ضمنی طور ہم اردو زبان کے چند اہم شعراء کے کلام میں گلاب پر کی گئی شاعری کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

گلاب ہاتھ میں ہو آنکھ میں ستارہ ہو
کوئی وجود محبت کا استعارہ ہو

(پروین شاکر)

سمیٹ لیتی شکستہ گلاب کی خوشبو
ہوا کے ہاتھ میں ایسا کوئی ہنر ہی نہ تھا

(پروین شاکر)

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

(میر تقی میر)

گلاب آنکھیں، شراب آنکھیں
یہی تو ہیں لاجواب آنکھیں

(امجد)

مختلف پھولوں کے طبی اثرات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ دنیا میں ایسی کوئی بیماری نہیں ہے کہ جس کا علاج ان پھولوں میں نہ ہو اور روزگار کے حوالے سے بھی چند مثالیں پیش کی گئیں تاکہ انسان کو ان کے کاروبار کا شوق پیدا ہو کیونکہ جب کشمیر کا صرف ایک ٹولپ باغ جو ایک مہینے کُھلا رہتا ہے کروڑوں روپیے کما سکتا ہے تو عام انسان کیا اپنے لیے ان پھولوں کی کاشتکاری سے روزی روٹی نہیں کما سکتا ہے؟

روش روش پہ ہے نکہت گلاب کے پھول
حسین گلاب کے پھول، ارغواں گلاب کے پھول

(امجد)

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
میری لحد پہ کھلیں جاوداں، گلاب کے پھول

(امجد)

اُس کا اظہار محبت بھی تھا کتنا دل نشیں
رکھ گیا سوتے میں اک دن میرے ہونٹوں پر گلاب
بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص
دل کو گلاب رُت میں بھی کھلنے نہیں دیا
لوگوں نے تجھ سے اب کے بھی ملنے نہیں دیا
سنو کہ اب ہم گلاب دیں گے، گلاب لیں گے
محبتوں میں کوئی خسارہ نہیں چلے گا
نکل گلاب کی مٹھی سے اور خوشبو بن
میں بھاگتا ہوں ترے پیچھے اور تو جگنو بن
نام کیا دوں میں ایسے موسم کو
اب کے شاخوں پہ آئے خشک گلاب
یہ کون میری روح کے اندر اتر گیا
ہر سو دکھائی دیتے ہیں چہرے گلاب سے

(ایم زیڈ کنول)

ساعت وصل کتنی خوش کن تھی
کیسی تازہ گلاب سوچیں ہیں

(امجد شہزاد)

ان تمام اشعار کو شامل کرنے کا بھی یہی مقصد تھا کہ ان پھولوں پر کی گئی شاعری سے ہم سمجھ جاتے کہ ان کی حقیقت کیا ہے اور یہ پھول کتنے شفقت بھرے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف پھولوں کے طبی اثرات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ دنیا میں ایسی کوئی بیماری نہیں ہے کہ جس کا علاج ان پھولوں میں نہ ہو اور روزگار کے حوالے سے بھی چند مثالیں پیش کی گئیں تاکہ انسان کو ان کے کاروبار کا شوق پیدا ہو کیونکہ جب کشمیر کا صرف ایک ٹولپ باغ جو ایک مہینے کھلا رہتا ہے کروڑوں روپے کما سکتا ہے تو عام انسان کیا اپنے لیے ان پھولوں کی کاشتکاری سے روزی روٹی نہیں کما سکتا ہے؟

چمن میں غنچہ وگل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاق جور گلچین ہو تو پیدا رنگ وبو کرلے

■

Mohd Yaseen Ganie
Lifestyle Readymade Garments, Court Rod
Opposite R&B Department Pulwanma
Post Office: Pulwama - 192301 (J&K)

ہندوستان کا عوامی طرزِ رقص

مقصود احمد انصاری

ہندوستان کی قدیم تہذیبی و تمدنی وراثت باعثِ صد افتخار ہے جو یہاں کے عوامی طرزِ رقص میں پنہاں و پوشیدہ ہے۔ یہاں کے مقامی گیت و موسیقی سے واضح ہوتی ہے۔

مضمون میں یہاں کے مقامی وعوامی طرزِ رقص کے احوال وکیفیات کا تعارف مختصر طور پر پیشِ خدمت ہے۔

(1) **اردونا چل پردیش: 'بورڈ و چھام'** اردونا چل پردیش کا مشہور ومعروف عوامی رقص ہے۔ یہ رقص 'فتح صداقت' کی علامت ہے۔ 'بورڈو چھام' کا مطلب 'رقصِ گردشِ نجوم' ہے۔ بودھ عقائد کے تعلق سے قبائلیوں کے ذریعے اس رقص کی نمائش مختلف تیوہاروں کے جشنِ مسرت پر کی جاتی ہے۔ اس مقامی وعوامی رقص کی نمائش کا مقصد اظہارِ مسرت ہے۔ یہ عوامی طرزِ رقص 'شیر دوک چینپس' قبیلے میں بے حد مقبول ہے۔

(2) **بہار: 'جَتِ جِتن'** صوبۂ بہار کا مقبول عام ومقامی وعوامی طرزِ رقص ہے۔ اس رقص کی نمائش حلقۂ کوسی اور متصلا انچل میں خاص مواقع پر کی جاتی ہے اس مقامی وعوامی رقص میں آفات سماجی، سماوی وقدرتی مسائل کی باتوں کا ذکر اور اس سے نجات کی فکر کا عمل دہرایا جاتا ہے۔

'جھی جھی یا' یہ مقامی وعوامی طرزِ رقص ڈھول، تماشہ اور ہارمونیم کے ساتھ زراعتی عمل کے اختتام پر 'حوصلہ افزائی' کے پیشِ نظر مقامی گیت، رقص وسرود کی تاثر کن کیفیات کے ساتھ عمل میں لایا جاتا ہے۔ بالخصوص مقامی عورتیں اس عوامی طرزِ رقص میں بارش کے لیے خدا سے دعائیں کرتی ہیں۔

'وِدیشیہ'۔ مقامی وعوامی طرزِ رقص تو ضرور ہے لیکن اس کا ڈرامہ/ ناٹک سے قریب تر ہے اس میں خصوصاً رقص کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس طرزِ رقص کے موجد 'بھکاری ٹھاکر' تھے۔

'سوہر کھلونا' اس عوامی طرزِ رقص کا تعلق نوزائیدہ بچے کی پیدائش کی خوشی سے تعلق رکھنے والا رقص ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد بہار میں 'سوہر' گانے کی روایت عام ہے۔ اس میں گیت و موسیقی کے ساتھ رقص بھی شامل ہے۔ خواتین رقص کے ساتھ 'بھگوان رام' کا قصیدہ، گیت کی شکل میں گاتی ہیں۔

(3) **آسام (بیہو): 'بیہو'** طرزِ رقص آسام کے مقامی عوامی قبائلیوں کے ذریعے منایا جانے والا وہ رقص ہے جو عموماً دورانِ تیوہار عمل میں آتا ہے۔ مرد وزن ایک ساتھ جماعت میں یہ عوامی طرزِ رقص عمل میں لاتے ہیں۔ 'بیہو' رقص کے آغاز کا سہرا حکمراں رودر سنگھ کے سر بندھتا ہے۔

'اوجاپالی' یہ طرزِ رقص آسام کا ایک مقامی و عوامی رقص ہے اس رقص کی شروعات 'کتھا کاتا' رسم و رواج سے منسلک ہے۔ عورت و مرد جماعت کے ساتھ اس عوامی رقص کے عمل کو دہراتے ہیں۔ اس عوامی طرزِ رقص کا رواج دارجلنگ کے حکمراں دھرم نارائن کی نگرانی میں خوب خوب پروان چڑھا۔

(4) **چھتیس گڑھ: 'راؤت ناتھ'** یہ عوامی رقص 'بھگوان کرشن' کی عبادت سے مشتق ہے۔ دیواُوندھی ایکادشی کو 'بیداریِ حق' کو تسلیم کرنے کی غرض سے اس عوامی طرزِ رقص کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

'پنڈوانی' حکایتِ مہابھارت کی منظوم شکل 'پنڈوانی' ہے۔ 'بھیم' اس عوامی طرزِ رقص کا اہم کردار ہے۔ چھتیس گڑھ میں یہ طرزِ رقص بے حد مقبول عام ہے 'تیجن بائی' نے 'پانڈوانی' طرزِ رقص کو بین الاقوامی درجہ عطا کیا ہے۔

'پنتھی رقص' یہ چھتیس گڑھ میں 'ماگھ ماہ پورنیما' کے روز 'ست نامی' قبیلے کے لوگوں کے ذریعے عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ رقص عموماً مردوں کے ذریعے ہی عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس عوامی طرزِ رقص میں عورتوں کی شمولیت نہیں ہوتی ہے۔

'سیلا رقص' چھتیس گڑھ میں 'سیلا رقص' مختلف قبائل ومختلف ذات پات کے درمیان عمل میں لانے والا رقص ہے۔ خصوصاً اس رقص میں 'سیلا قبیلہ' کے نوجوانوں کی شمولیت زیادہ ہوتی ہے۔ فصل کی کٹائی کے بعد اس رقص کو عملاً پیش کیا جاتا ہے۔ یہ رقص ماہ 'اگہن' میں پیش کیا جاتا ہے۔

(5) **گوا Goa: 'پھوگدی رقص'** گوا اور کوکن علاقے میں 'گنیش چتورتھی' کے دوران 'پھوگدی عوامی طرزِ رقص' کا انتظام وانصرام کیا جاتا ہے۔ یہ رقص گوا کی سماجی، ثقافتی اور تمدنی روایتوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس عوامی طرزِ رقص میں خواتین بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ اُس طرزِ رقص کی ابتدا حمد ومناجات سے شروع ہوتی ہے۔

'گھالو' گوا کا مشہور ومعروف عوامی طرزِ رقص ہے۔ اس رقص کی نمائش وعمل میں صرف اور صرف خواتین ہی حصہ لیتی ہیں۔ مراٹھی اور کوکنی گیتوں پر مشتمل اس رقص

کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس عوامی رقص کی سماجی، ثقافتی اور تمدنی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

(6) **پنجاب: 'بھانگڑا'** صوبہ پنجاب کے 'ماجھا' حلقہ کا عوامی طرز رقص 'بھانگڑا' یہاں کے سماجی، تمدنی اور ثقافتی معیار کا مقبول عام رقص ہے 'بھانگڑا' عوامی رقص روایتی انداز سے 'بیساکھی' کے موقعے پر منعقد ہوتا ہے۔ یہ عوامی رقص مردوں کے ذریعے عمل میں لایا جانے والا جماعتی رقص ہے۔ اس رقص میں ڈھول اور موسیقی کے مختلف آلات استعمال کیے جاتے ہیں۔

'گِدھا' پنجاب میں خواتین کے ذریعہ کیا جانے والا عوامی رقص 'گدھا' کے نام سے بے حد مشہور و مقبول ہے۔ یہ رقص کم و بیش 'بھانگڑا' کی طرح بے حد مشقت سے پُر عوامی رقص ہے۔ اس عوامی رقص کا انعقاد مختلف مخصوص مواقع پر کیا جاتا ہے۔ خواتین جماعت/گروپ میں اس عوامی رقص کے عمل و حکمت کو پیش کرتی ہیں۔

'گتکا' پنجاب کا مشہور زمانہ عوامی طرز رقص ہے۔ یہ رقص 'مارشل آرٹ' سے متاثر ہے۔ اس رقص میں تلوار، لاٹھی، چاقو اور دوسرے حربہ کی مار، کاٹ اور نمائش کے ساتھ اپنے دفاعی پہلو کو بڑی مہارت کے ساتھ اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس عوامی طرز رقص کے بانی سکھ گرو 'ہرگووند سنگھ' کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس رقص کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

(7) **جھارکھنڈ:** جھارکھنڈ اور اوڈیشہ کے قبائلیوں میں **'پائی کجا'** عوامی رقص بے حد مشہور ہے۔ یہ عوامی طرز رقص ایک جماعت میں مکمل کیا جاتا ہے۔ اس میں مرد ایک مجاہد کی شکل میں دھوتی اور پگڑی پہنتے ہیں اور لڑکی تلوار اور ڈھال کے ساتھ 'چھتم جنگ' کی شکل میں 'پائیکا' رقص کا اہتمام ہوتا ہے۔

'سَرھُل' جھارکھنڈ میں 'سرہل' تیوہار کے دوران روایتی 'سرہل' رقص کی نمائش مقبول عام ہے۔ گیت اور قصہ گوئی کے ساتھ اس عوامی طرز رص کی سماجی و ثقافتی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ رقص 'سرنا' قبائل کے ذریعہ منعقد کیا جاتا ہے۔

(8) **مدھیہ پردیش: 'گِردا'** یہ طرز رقص ربیع فصلوں کی کٹائی اور اناج کو بھنڈار میں محفوظ کر لینے کے بعد گاؤں اور قصبوں میں 'گردا' عوامی طرز رقص کا عمل شروع ہوتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے مختلف قبائلیوں میں یہ رقص مقبول ہے۔ اس رقص کے تین ارکان ہیں۔ اول: 'سیلا' دوم 'سیلالاڑکی' اور سوم 'سیلا بھدونی' ہے۔

'ماچھ' مدھیہ پردیش کے مالوہ حلقہ میں 'ماچھ رقص' بہت زیادہ مشہور ہے۔ یہ موسیقی کے ساتھ پیغام رسانی کا بہترین ذریعہ ہے۔

'تیراتالی' مدھیہ پردیش کے 'کماز' قبائلی کے ذریعے یہ عوامی طرز رقص 'تیراتالی' منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ رقص دو یا تین خواتین کے ذریعے مکمل ہوتا ہے۔ اس رقص میں جسم کے مختلف حصوں پر چھوٹے چھوٹے جھانجھ بندھے ہوتے ہیں۔ سر پر بجے گھڑوں کو صحیح میزان کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اس طرح رقص کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

(9) **گجرات: 'ڈانڈیا'** یہ عوامی طرز رقص 'ڈانڈیا' گجرات کا روایتی عوامی رقص ہے۔ 'ہولی' اور 'نوراتری' کی تقاریب کے دوران اس کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس میں 'ورنداون' میں 'رادھا' اور 'کرشن' کے جذبۂ اظہار محبت کا انعکاس کیا جاتا ہے۔ اسے 'اسٹیک ڈانس' بھی کہا جاتا ہے۔ 'ڈانڈیا' رقص میں عموماً مرد لوگ ہی حصہ لیتے ہیں۔

'گربا' اس رقص کا انعقاد گجرات میں کیا جاتا ہے۔ 'گربا' رقص کا اہتمام 'نوراتروں' کے دوران نو دنوں تک ہوتا ہے۔ 'گربا' کی مرکزی جگہ میں 'دیوی درگا' کی عبادت/پوجا ہوتی ہے۔ 'دیوی درگا' کو عزت بخشنا 'گربا رقص' کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ اس عوامی رقص میں مرد و عورت مساوی طور پر حصہ لیتے ہیں۔

'تیپانی' یہ طرز رقص مقامی و عوامی ہے۔ یہ رقص سوراشٹر (گجرات) کے 'چوڑوواڈ' خطہ میں مقبول عام ہے۔ یہ 'کولی' قوم/ذات کے مزدور وطبقہ کے ذریعے مکمل رقص ہوتا ہے۔ کام کی یکسانیت اور اس سے پیدا شدہ عدم دلچسپی کو ختم کرنے کی غرض سے اس مقامی و عوامی طرز رقص کی نمائش ہوتی ہے۔

(10) **کیرل: 'چکیارکوتھو'** یہ رقص کیرل کا مشہور زمانہ مقامی عوامی طرز رقص ہے۔ اس کی نمائش ایک تنہا اداکار/کلاکار کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس رقص میں 'رامائن' اور 'مہابھارت' کے واقعات/قصے اداکار کی زبانی دہرائے جاتے ہیں۔ یہ جدید 'اسٹینڈ اَپ' کو کومیڈی کی طرح ہوتا ہے۔ اس رقص کے دوران سماج اور سیاست پر بھی طنز و مزاح پیش کیا جاتا ہے۔ یہ 'کیرل' کے چک یا رقوم/جماعت میں زیادہ مشہور و مقبول ہے۔

'اربان بھوتو': اس طرز رقص کو 'دُفو موتو' کے نام سے بھی عوام جانتی پہچانتی ہے۔ یہ کیرل کے مسلم خاندان میں زیادہ مقبول عام ہے۔ اس عوامی رقص میں عربی طرز موسیقی کی نقل کی جاتی ہے۔

'دُفوموتو' کا نام نامی واقعتاً 'دُفو' کے نام پر ہوا جو ایک آلۂ موسیقی ہے۔

'مارگ مکالی' یہ عوامی طرز رقص قدیم ترین طرز رقص ہے۔ 'مارگ مکالی' کیرل کے عیسائیوں میں رائج طرز رقص ہے۔ اس طرز رقص کا اہتمام خواتین کے ذریعے مخصوص تقریبات کے دوران ہوتا ہے۔

(11) **کرناٹک: 'یکچھ گان'** کرناٹک کا مشہور و مقبول عوامی رقص 'یکچھ گان' ہے۔ اس طرز رقص کو ڈرامائی انداز میں زیادہ تر پیش کیا جاتا ہے۔ 'یکچھ گان' اپنے پیغام اسٹائل اور رفتار کے لیے زیادہ جانا پہچانا جاتا ہے۔ 'یکچھ گان' کا تعلق 'ویشنو بھکتی' سے زیادہ ہے۔

'بوراج گاج' کرناٹک کا مشہور رقص ہے۔ یہ طرز رقص میسور کے 'دسہرہ' سے منسلک ہے۔ یہ شراون اور 'کارتیک' مہینے میں صوبہ کے مختلف حلقے میں مکمل ہوتا ہے۔

'بیرگاج' اس کا دوسرا لقب ہے۔ اس طرز رقص میں خواتین زیادہ حصہ لیتی ہیں۔ اس طرز رقص میں 'ہندو پورانک قصے و حکایات' کو خصوصیت کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔

(12) **آندھراپردیش: 'ویرانائیم'** یہ صوبہ آندھراپردیش کا مقبول عام مقامی و عوامی طرز رقص ہے۔ اس رقص کی مذہبی اہمیت ہے۔ یہ رقص 'بھگوان شنکر' کو عزت بخشنے کے لیے منعقد کیا جاتا ہے۔ صوبہ کے تقریباً سبھی 'شیومندروں' میں 'ویرانائیم' عوامی طرز رقص کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

'لمباڈی' آندھراپردیش کے 'انوپو' گاؤں کو 'لمباڈی' عوامی رقص کا جائے پیدائش تسلیم کیا جاتا ہے۔ 'لمباڈی' ایک قبیلہ ہے جسے 'بنجارہ' یا 'سُین گالی' بھی کہا جاتا ہے۔ 'لمباڈی' طرز رقص بیس سے تیس رقاصوں کے ذریعے انجام تک پہنچتا ہے۔ یہ رقص عموماً 'دیوالی' 'دسہرا' یا کسی مخصوص تیوہار پر عمل پذیر ہوتا ہے۔

(13) **جموں اور کشمیر: 'رؤف'** جموں اور کشمیر صوبہ کا مقامی و عوامی طرز رقص کا نام 'رؤف' ہے۔ یہ رقص یہاں کا مقبول عام رقص شمار کیا جاتا ہے۔ 'رؤف' عوامی رقص کے انعقاد میں عموماً مقامی خواتین حصہ لیتی ہیں۔ یہ 'رؤف قبیل' کی خواتین کے ذریعہ عمل میں آنے والا رقص ہے۔ خواتین دو قطار میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر رقص کرتی ہیں۔ یہ صوبہ کے مسلم گھرانوں میں مقبول عام ہے۔

'واچا نغمہ' یہ رقص شادی بیاہ کی شادمانیوں میں یا کسی مخصوص خوشی کے موقعے پر عمل پذیر ہوتا ہے۔ 'واچا نغمہ' رقص صرف اور صرف لڑکوں کے ذریعے ہی انجام پذیر ہوتا ہے۔

کودرقص 'لوک دیوتا کی خوشنودی کے پیش نظر صوبہ جموں و کشمیر میں 'کودرقص' کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ رقص

مخصوص شادمانیوں کی گھڑی میں مثلاً بچوں کی پیدائش کی خوشی کے موقعے پر عمل پذیر ہوتا ہے۔

(14) **بنگال: 'گمبھیر'** بنگلہ تہذیب وتمدن میں 'گمبھیر' عوامی رقص کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اس رقص کے توسط سے قوت/ طاقت یعنی 'شکتی' کی عبادت کی جاتی ہے۔ اس رقص میں دواداکار 'نانا' اور 'ناتی' کا کرار ادا کرتے ہیں۔ مکالمات کے ذریعے سماجی، اقتصادی اور اخلاقی مسائل پر اپنے اپنے خیالات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

'ڈومنی' اس عوامی رقص کا تعلق پچھم بنگال کے مالدہ سے ہے۔ اس رقص کی ابتدا حمد اور مناجات سے ہوتی ہے۔ یہ ایک ڈرامائی رقص ہے۔ اس کے رقاص کو 'نچاری' یا 'لچاری' کہا جاتا ہے۔ اس رقص میں عام حادثات پیش ہوتے ہیں۔

(15) **اترپردیش: 'میورنریتیہ'** رادھا کرشن کے عشق کو اجاگر کرنے والا یہ رقص اترپردیش کے 'برج' علاقہ میں بے حد مقبول عوامی رقص ہے۔ 'میورنرتیہ' کی نمائش عموماً موسم برسات میں کی جاتی ہے۔

'چارکولا رقص' اترپردیش کے برج حلقہ میں یہ رقص مقبول عام ہے۔ خواتین کے ذریعے لکڑی کے اونچے پیرامیڈ کو صحیح اوزان کے ساتھ اس رقص کو مکمل کیا جاتا ہے۔ اس عوامی رقص کے دوران شری کرشن کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔

(16) **تامل ناڈو: 'پرائی آٹم'** یہ تمل ناڈو کا مخصوص عوامی رقص ہے۔ یہ قدیم اور روایتی مقامی وعوامی رقص ہے۔ یہ غیرفوجی کو سرزمین جنگ چھوڑنے کی نصیحت دی جانے والی ہدایت سے متعلق عوامی رقص ہے۔

'کومی' یہ تمل ناڈو کا ایک مقامی وعوامی رقص ہے۔ یہ رقص تمل ناڈو اور کیرل کے کچھ خطے میں عمل پذیر ہے۔ اس رقص میں خواتین گول دائرہ کے ساتھ شریک رقص ہوتی ہیں مندروں میں عمل پذیر تیوہاروں اور 'پونگل' کے دوران 'کومی رقص' کا مخصوص اہتمام کیا جاتا ہے۔

(17) **اُڈیشہ: 'چھو'** یہ ایک نیم شاستریہ عوامی رقص ہے۔ اڈیشہ کے علاوہ بنگال اور جھارکھنڈ میں 'چھو' طرز عوامی رقص مقبول عام ہے۔ یہ مذہبی نقطۂ نظر سے 'شیو'، 'سکت' اور 'ویشنو' جماعتوں سے جڑا ہوا عوامی رقص ہے۔ 'رامائن' اور 'مہابھارت' کی حکایتیں وقصے کو اس رقص کے درمیان میں رکھا جاتا ہے۔

'گوٹی پوآ رقص' یہ رقص اڈیشہ کے نوجوان مرد، عورتوں کے ملبوسات پہن کر رقص کرتے ہیں۔ یہ رقص واقعتاً بھگوان جگن ناتھ اور بھگوان کرشن کی یاد میں علامتی رقص ہے۔

'باگھ رقص' اڈیشہ کے گنجام، بہرام پور اور سورن پور ضلع میں یہ طرز رقص کافی مقبول عام ہے۔ اس عوامی رقص کا اہتمام 'چیت ماہ' میں کیا جاتا ہے۔ 'باگھ نرتیہ' کرنے والے مرد اشخاص اپنے جسم کو باگھ کی شکل اور رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

'کرما' اس لوک نیرتیہ/ عوامی رقص کا مظاہرہ 'کرم دیو' کی پوجا/ عبادت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ کرم دیو کو اچھے وبرے مستقبل قریب کا علم ہوتا ہے۔ وہ اس علم کے خود مختار ہیں۔ ان باتوں پر مقامی لوگوں کا یقین راسخ ہے۔ اس مقامی وعوامی طرز رقص کا مظاہرہ بھادو ماہ میں پیش کیا جاتا ہے۔

(18) **مہاراشٹر: 'پاوری' یا 'طرفہ'** یہ مہاراشٹر کے آدی باسیوں کا مشہور زمانہ عوامی رقص ہے۔ یہ رقص ڈھول کے تھاپ تال میل پر مرکوز ایک عوامی رقص ہے۔ اس رقص کا مقصد اپنی جماعت/ ذات میں بھی بہتر تال میل کے ساتھ بہتر خوش حال زندگی بسر کرنا ہے۔ مختلف تیوہاروں اور خوشیوں کے مواقع پر اس رقص کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

'لاونی' یہ مہاراشٹر کا ہردل عزیز عوامی رقص ہے۔ 'لاونی کے روایتی گیت' اس رقص کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ یہ رقص ڈھولک کے تھاپ پر اور اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ کی مناسبت سے اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ یہ رقص مراٹھی سے زیادہ جڑا ہوا نرتیہ/ رقص ہے۔ 'لاونی' 'لاونیہ' لفظ سے بنا ہے۔ اس لفظ کا مطلب حسن وخوبصورتی ہے۔ 'لاونی' کے ذریعے مقامی سماجی اور سیاسی مدعا کی تکمیل اس کا مقصد ہے۔

'تماشہ' یہ مراٹھی ڈراما/تھیٹر سے جڑا ہوا ایک مقامی وعوامی طرز رقص ہے۔ اسے مراٹھی سنیما میں بھی نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ مہاراشٹر کے 'کول ہاتی جماعت' میں بے حد مقبول عام عوامی رص ہے۔

(19) **راجستھان: 'گھومر'** راجستھان میں 'گھومر' ایک ہر دل عزیز مقامی وعوامی طرز رقص ہے۔ یہ عوامی رقص عموماً خواتین کے ذریعے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اس رقص کا آغاز بھی خواتین ہی کرتی ہیں۔ 'گھاگھرا' اس رقص کا لباس، اس کی پوشاک ہے۔ اس رقص کا انتظام و انصرام مخصوص تیوہاروں میں کیا جاتا ہے۔ شادی، بیاہ کی تقریبات اور 'ہولی' کے تیوہار پر اس عوامی رقص کا اہتمام خصوصیت کے ساتھ کافی زور وشور کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ عوامی رقص راجستھان کے 'کل بیلیا' قبیلہ کا محبوب رقص ہے۔

'کچھی گھوڑی' راجستھان کے سخاوتی حلقہ/ علاقہ میں 'کچھی گھوڑی' عوامی رقص کافی مشہور ومعروف ہے۔ اداکار 'گھوڑے' کا لباس زیب تن کرتا ہے۔ اس رقص کی نمائش اکثر وبیشتر شادی بیاہ کے تقریبات میں خوب ذوق وشوق کے ساتھ عمل میں لائی جاتی ہے۔ یہ رقص عام لوگوں/ قبائلی گھرانوں کے لیے روزی روٹی کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ ایک مقبول عام رقص ہے۔

مذکورہ بالا مرقومہ تمام عوامی ومقامی طرز رقص کی مختصر تفصیلات کے باوجود اور بھی کئی مختلف صوبائی عوامی طرز رقص ہیں۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر باقی صوبائی ومرکزی سطح کے رقص کے نام ساتھ اس کے مقامی وعوامی رقص قلم بند کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ مثلاً:

پنجاب: جاگو، لوڑی، دن کاڑا، جلی، سانی، کیکلی۔
اتراکھنڈ: چھولیا
جھارکھنڈ: سنتال، اگنی، جامدا، جھومتا
تمل ناڈو: مائی لاٹوم، پولیاٹوم، کولاٹم، کاراگرم، پمپوائم
آسام: ھیل، گوپال، رکھال یسہ، آنکیہ رقص، نوگ کریم، بگورومبہ
بہار: کٹھ پتلی، بھاکو، جاترا، رم کھیلیا، کجری، جھومری
چھتیس گڑھ: گینڈی، جھرلیتی۔
گجرات: بھاوئی، ڈانگی، اگوا، پاگھا، ہوود، متوکاڈی، سیدھی دھمال
اڈیشہ: منگل راس، ڈل کھائی، کے ای سابادی، گوٹی پو آ، دھاپ دھوم را
آندھراپردیش: چھم سا، کویا، داپو
سکم: سنگھی چھام
ہریانہ: راس لیلا، دھمال، سوانگ، نقل
ہماچل پردیش: کری یالا، بھگت، ہرن
کرناٹک: بیدراویشا، ساتنا، لالہ ماڈلے، دس رت، رادھنا
جموں و کشمیر: بچال دھمال، لاسنہ، دھوم بل
تری پورا: حوضہ گیری
پودوچیری: گراڈی۔
ناگالینڈ: چانگ لو
میزورم: چیخ
مہاراشٹر: للت بھروت، دشادتار، کولی ڈانس
مدھیہ پردیش: پھول پتی، مٹکی، ماچ، ناچا
کیرل: تھولا، تھے یام، تھیلامبو، موری اٹم، اوپانا، تھی رام یاتم۔

■

Dr. M.A. Ansari (Advocate)
Maskan Durgah, Msnoor Chak
Bachwara - 851128 (Begu Sarai), BIHAR

غیر سرکاری تنظیم کا تصور اور خدمات کی فراہمی

محمد شاہد رضا

پچھلی کچھ دہائیوں میں ترقی پزیر ملکوں کے اندر غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کی پروفائل بہت ہی تیزی سے بڑھی ہے۔ مقامی اور عالمی تنظیموں نے غریبی ختم کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی ترقی کے لیے ایک مرکزی مقام بنانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے ان تنظیموں کو سول سوسائٹی کا ایک اہم حصہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ پالیسی ساز افراد، اسٹیٹ اور مارکیٹ سیکٹر کے ساتھ ساتھ سول سوسائٹی کو بھی کافی اہمیت دیتے ہیں اور جس کی وجہ سے گزشتہ برسوں میں غیر سرکاری تنظیموں کی اہمیت اور تعداد دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ سلیمن (1994) نے 'گلوبل ایسوسی ایشنل انقلاب' کے بارے میں لکھا ہے جس میں تیسرے سیکٹر کی تنظیموں نے اسٹیٹ اور مارکیٹ کے ساتھ سماجی، معاشی اور سیاسی میدانوں میں ایک اہم جگہ بنائی ہے جس کی بنیاد پر عوامی پالیسی میں ان کا بڑا رول ہوتا جا رہا ہے۔ خواہ خدمات مہیا کرانے کی بات ہو، کمیونٹی کو با اختیار کرنے کے لیے کوئی بنیاد رکھنی ہو یا کسی عوامی مسئلے پر بات کرنی ہو، تیسرے سیکٹر کی تنظیمیں اپنی مختلف سرگرمیوں کی وجہ سے دنیا کی بیشتر جگہوں میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ اس ضمن میں بہ طرز جمہوریت، این جی اوز لوگوں کے ذریعے، لوگوں کی اور لوگوں کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ جمہوریت کی ہی ایک توسیع ہے۔

غیر سرکاری تنظیم کا تصور

غیر سرکاری تنظیم (این جی او) کو کسی ایک مخصوص تعریف میں باندھنا نسبتاً ایک مشکل کام ہے کیونکہ لٹریچر میں اس تصور کو مختلف اصطلاحات کے ناموں سے جانا جاتا ہے جس نے عام طور پر ایک کنفیوژن بھی پیدا کیا ہے۔ نجم اور وکیل (1999) نے ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی ایک وسیع تعریف (این جی او تیسرے سیکٹر کے لیے ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے جو بہتر سماجی خدمات اور سماجی تبدیلی سے متعلق ہے اور عوامی فائدے اور خود کی مدد کے لیے ہوتی ہیں) اور محدود تعریف (این جی اوز ایسی درمیانی تنظیمیں ہوتی ہیں جو باہر سے فنڈ لے کر کمیونٹی کی سطح پر کام کرنے والی تنظیموں کو سپورٹ کرتی ہیں) پیش کی ہے۔ بہر حال محدود تعریف میں بھی تنوع سے پر تنظیمیں ہیں جو مختلف میدانوں میں مختلف طبقات کے لیے کام کرتی ہیں۔ اس وسیع تعریف کو اس وجہ سے بھی مقبولیت حاصل ہے کیوں کہ وہ این جی اوز پر ہونے والے بحث و مباحثے کے لیے کارآمد ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ مختلف قسم کی تنظیموں کے درمیان تقابل کے لیے بھی مددگار ہوتی ہیں۔ این جی اوز کے لیے بہت ساری مترادف اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً غیر سرکاری تنظیمیں، غیر منافع بخش تنظیمیں، بنا منافع والی تنظیمیں، والینٹری تنظیمیں، سول سوسائٹی تنظیمیں، والینٹری ایسوسی ایشن جیسی مختلف اصطلاحات مقبول ہیں جنھیں ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

این جی او اصطلاح کا سب سے پہلا ذکر 1945 میں اقوام متحدہ کے چارٹر میں ہوا۔ جس میں انٹر گورنمنٹل مخصوص ایجنسیوں اور انٹرنیشنل پرائیویٹ تنظیموں کی حصے داری کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا۔ اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے ہر طرح کی پرائیویٹ باڈی کو بطور این جی او تسلیم کیا جو حکومت کے کنٹرول سے باہر اور آزاد ہوں اور جو حکومتوں کو بطور ایک سیاسی پارٹی چیلنج نہ کریں یا محض انسانی حقوق کے تنگ دائرے میں سمٹ کر رہ جائیں، جو بنیادی طور پر غیر منافع بخش اور کسی طرح کے جرم کی سرگرمیوں میں شامل نہ رہیں۔ بیرونی دباؤ بالخصوص حکومتوں سے آزاد ہو کر کام کرنا کسی بھی این جی او کی کریڈیبلیٹی کے لیے بہت اہم ہے۔ (بھٹ، سی ای سی- یو جی سی لکچر)

غیر سرکاری تنظیموں کی زمرہ بندی، تنظیموں اور سرگرمیوں کی ایک بڑی تعداد کی طرف اشارہ کرتی ہے جو 'ترقی' جیسے محدود مفہوم سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔ مثال کے طور پر ڈیکن (1997) نے ہماری توجہ ایسے طریقوں کی طرف مبذول کرائی جس میں بین الاقوامی غیر ریاستی تنظیمیں معاشی، تکنیکی اور ثقافتی تبدیلیوں کے زیر اثر ملکوں کے مابین سماجی پالیسی کو بنانے میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے اور ہم جسے عام فہم زبان میں 'گلوبلائزیشن' کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح بینٹ (1995) نے غیر سرکاری تنظیموں کی جنگوں اور قدرتی آفات میں بین الاقوامی انسان دوست ریلیف کی فراہمی پر ہونے والے بحث و مباحثے کے سلسلے میں لکھا ہے۔ فشر (1997) نے کہا ہے کہ علم بشریات کے ماہرین بھی اس بات میں دلچسپی لے رہے ہیں کہ ایک غیر سرکاری تنظیم گلوبل طریقہ کار اور مقامی زندگیوں کے درمیان ایک درمیانی رشتے کا کردار نبھاتی ہے۔ فاؤلر (1997) نے غیر سرکاری تنظیموں کی بابت ایک جامع تصور پیش کیا ہے، انھوں نے کہا کہ غربت کی موجودگی کی وجہ سے تیسرے سیکٹر کی تنظیموں نے ایک قانونی شکل اختیار کر لی ہے۔

اسی طرح ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر ٹامس لامبو (1988-1971) نے کہا کہ ''ہمارے ارد گرد جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس نے نہ صرف ہمارے سکون کو درہم برہم کیا ہے اور انسانی ترقی کے یقین کو چیلنج کیا ہے بلکہ ہمیں شرم، بے یقینی اور احساس جرم میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں ہم نے سائنسی اور تکنیکی ترقیوں میں سب کچھ پیچھے چھوڑ دیا ہے، ہم انسانی زوال اور تنزلی کا نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے دوسری دنیاؤں میں بھی قدم رکھ دیا ہے مگر ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ کسی اور دنیا میں قدم رکھنا آسان ہے مگر غریبی، انسانی استحصال، ناانصافی کو ختم کرنا کہیں زیادہ مشکل عمل ہے۔''

چونکہ تمام غیر سرکاری تنظیمیں اپنے مقاصد اور اہداف میں پسماندہ لوگوں اور طبقات کی بہتر سماجی

فنکشنگ اور سماجی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر کام کرتی ہیں اس لیے ان کو ایک پروفیشنل اصطلاح 'ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن' سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر غیر سرکاری تنظیموں کو اورینٹیشن (رجحان) اور آپریشن کی سطح سے پہچانا جاتا ہے۔ جس کا آسان مفہوم یہ ہے کہ بلا واسطہ مختلف پروجیکٹس اور پروگرام کے ذریعے چھوٹے یا بڑے پیمانے پر بدلاؤ حاصل کرنا۔ آپریشنل یا ایڈووکیسی تنظیمیں اپنے پروگرام کو جاری اور برقرار رکھنے کے لیے معاشی ڈونیشن، میٹریل یا والنٹیئر لیبر کی شکل میں ذرائع و وسائل ڈھونڈتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کام کو کرنے کے لیے انھیں کافی پیچیدہ نظم و ضبط کی ضرورت پڑے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف گرانٹس یا معاہدوں، حکومتوں، فاؤنڈیشن یا کمپنیوں سے فائنانس لینے کے لیے پلاننگ، پروپوزل تیار کرنا، بجٹنگ، اکاؤنٹنگ اور رپورٹنگ میں مہارت درکار ہے۔ وہیں دوسری طرف فنڈ اکٹھا کرنے کے اشتہار کرنے کی، میڈیا سے تعلقات بنانے کی اور سپورٹرز کو ترغیب دینے کی مہارتیں بھی چاہیے۔

غیر سرکاری تنظیموں کی تمام قسموں کا منظم انداز میں بیان مشکل ہے کیونکہ ان تنظیموں کی قسمیں کافی وسیع ہے۔ کچھ تنظیمیں خاص خدمات جیسے تعلیم اور صحت سے متعلق ہوتی ہیں جبکہ کچھ تنظیمیں ایڈووکیسی اور کنسلٹنسی جیسی خدمات دیتی ہیں مگر زیادہ تر تنظیمیں کمیونٹی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے فیلڈ میں ہی کام کرتی ہیں اورینٹیشن کے نقطۂ نظر سے کام کرنے والی تنظیموں میں زمینی سطح پر کام کرنے والی تنظیمیں، روزگار، صحت، تعلیم یا انسانی زندگی کی دوسری بنیادی ضروریات (خدمات کی فراہمی) پر کام کرنے والی تنظیمیں، ایڈووکیسی، کنسلٹنسی/ ریسرچ تنظیمیں، ٹریننگ تنظیمیں، کپیسٹی بلڈنگ تنظیمیں، مذہبی تنظیمیں وغیرہ۔ آپریشن کی سطح پر کام کرنے والی تنظیمیں، کمیونٹی بیسڈ تنظیمیں، شہری تنظیمیں، قومی تنظیمیں، عالمی تنظیمیں وغیرہ ہیں۔ اس مضمون میں خدمات کی فراہمی پر کام کرنے والی تنظیموں کے نظام، طریقہ کار اور پریکٹس پر گفتگو کی جائے گی۔

غیر سرکاری تنظیموں میں خدمات کی فراہمی (سروس ڈلیوری)

مندرجہ بالا بحث سے این جی اوز کی بابت کئی حقائق اور صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں جہاں نیولبرل معاشی نظام نے ہر قسم کی ضروریات زندگی کو بازار سے منسلک کردیا ہے اور ریاست نے 'پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ' کے نظام کے تحت ریاستی ذمے داری اور جواب دہی کو تقریباً ختم کرلیا ہے ایسی صورت حال میں این جی اوز ایک اہم اور دلچسپ دعویدار کے طور پر نظر آتی ہیں۔ اس کے لیے ڈیوڈ لیوس کی کتاب 'مینجمنٹ آف نان گورنمنٹ ڈویلپمنٹ آرگنائیزیشنز - این انٹروڈکشن' (2001) کو بنیاد بنا کر خدمات کی فراہمی (سروس ڈلیوری) پر بحث کی جارہی ہے۔ این جی اوز اپنی غیر منافع بخش نوعیت کی بنیاد پر اپنے 'ٹارگیٹ گروپ' کو بالواسطہ یا بلا واسطہ خدمات فراہم کرتی ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں صحت، تعلیم، زراعت اور ذریعہ معاش کے میدانوں میں تنظیمیں مصروف ہیں مگر گلوبل پریشر کے تحت ماحولیات، ہاؤسنگ، قانونی مدد، ٹریننگ، تحقیق، کنسلٹنسی وغیرہ کی طرف بھی این جی اوز بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ کیرل (1992) نے کہا کہ خدمات کی فراہمی شاید این جی اوز کا ایک صاف دکھائی دینے والا رول یا فنکشن ہے۔ اس طرح کے رول میں کمیونٹی یا لوگوں کی بنیادی ضرورتیں یا ایسی ضرورتیں جن تک لوگوں کی رسائی نہیں ہے، تنظیمیں اپنی ذمے داریاں نبھاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ تنظیمیں حکومت کے لیے یا ان کے ساتھ مل کر کسی سماجی یا معاشی مسئلے پر کام کرتی ہیں۔

کارپوریٹ سماجی ذمے داری کے تصور نے تنظیموں کو مضبوطی دینے کے ساتھ ایک عملی کشمکش میں بھی مبتلا کیا ہے جس میں دو نکتے اہم ہیں: (1) تنظیموں کے لیے خدمات کی فراہمی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ کمیونٹی کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں مگر وہ خدمات فراہمی کے نظام کو خودمختار بناتی ہیں کہ ان کا رول عارضی اور منتقل کرنے والا ہوتا ہے۔ (2) یہ تنظیمیں بذات خود اس طرح سے کام کرتی ہیں کہ وہ دوسری خدمات فراہم کرنے والوں کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔ کورٹین (1987) نے آؤٹ پٹ وینڈر بنام ڈیولپمنٹل کیٹالسٹ کی ایک امتیازی تفریق کے ذریعے این جی اوز کے کردار کو واضح طریقے سے بیان کیا ہے۔ این جی اوز اس لیے مسئلے کا شکار ہیں کیونکہ وہ بازار کی روش پر چلتی ہیں حالانکہ انھیں اپنی اقدار اور غیر منافع فلسفیانہ اساس کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بہت ساری ایسی مثالیں ہیں جس میں تنظیمی خدمات کی فراہمی میں معیاری کنٹرول کی پریشانی، محدود پائیداری، خراب کوارڈینیشن اور عام طور پر غیر پختگی سے عبارت ہوتی ہے (رابنسن اینڈ وہائٹ، 1997)۔ کیرل کے مطابق تنظیمیں ایک کارگر خدمات فراہمی کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور بہت زیادہ کام کرنے کے مواقع بھی پیدا کرسکتی ہیں جیسے حصے داری کی اقدار کو فروغ دینا، جمہوری اصولوں کی تائید کرنا وغیرہ مگر ظاہر ہے کہ ان سارے کاموں کو عملی شکل دینا قطعاً آسان نہیں ہے۔ خدمات کی فراہمی عموماً کسی خاص پروجیکٹ کے تحت دی جاتی ہیں جس کا ایک خاص اور متعین ہدف ہوتا ہے جہاں خدمات کو پائیدار بنانا ضروری ہوتا ہے ورنہ ان کی میعاد زیادہ دنوں تک نہیں رہتی ہے۔ پائیدار رہنے کا تصور تو پس منظر کے مطابق بدلتا ہے مگر کمیونٹی اونرشپ میں ترقی اور رضاکارانہ طور پر کام کرنا یا حکومت کا این جی او کے رول کا متبادل ہوجانے تک جیسے محرکات اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی لیے کیرل کی دلیل ہے کسی بھی تنظیم کی خدمات فراہمی کا اثر اس کے مثبت نتائج کی بنیاد پر جانچنے کی ضرورت ہے۔ کمیونٹی کے ایک خاص طبقے کے لیے جہاں ایک طرف تنظیموں کی خدمات فراہمی اہم اور سود مند ہے وہیں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ خدمات کس طرح بہم کی جاتی ہیں؟

اس ضمن میں 'اختیار کاری' (Empowerment) اور 'حصے داری' (Participation) دو اہم تصور ہیں جو تنظیموں میں عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیرل کا ماننا ہے کہ اگر تنظیموں نے ایک خاص انداز میں خدمات فراہم کرنی شروع کردیں تو ان کا رول اختیار کاری کے عمل کو بڑھا سکتا ہے جس میں وہ دوسری فراہم کرنے والی ایجنسیوں کے کمزور اور غیر پائیدار رول کو ختم کرسکتی ہیں۔ اختیار کاری کا تصور حصے داری سے متعلق ہے جس میں شمولیت، فیصلے لینے کی آزادی ہوتی ہے۔

اختیار کاری بذات خود ایک پروسیس ہونے کے ساتھ ساتھ اس پروسیس کا نتیجہ بھی ہے جبکہ کئی مفکرین کے نزدیک یہ ایک آلہ کار بھی ہے (لیوس، 2011) اختیار کاری کی ابتدا مغربی کونسلنگ اور سوشل ورک کی تھیوری میں ہوئی مگر پاؤلو فریرے کے 'باشعور بنانے کے عمل' کے ریڈیکل تعلیمی خیالات اور گاندھی کے فلسفے میں بھی اس کی جڑیں پائی جاتی ہیں۔ سوشل ورک/کونسلنگ کے پس منظر میں اختیار کاری کو ایک ایسے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس سے غریبوں اور پسماندہ طبقات کی سماجی، معاشی اور سیاسی صورت حال میں مثبت تبدیلی واقع ہوتی ہے اور یہ ایک ایسا پروسیس ہے جس میں ذاتی ترقی کے ساتھ ایکشن لینے کے لیے اجتماعی طور پر قدم اٹھایا جاتا ہے (رولینڈس، 1995)۔ بہت ساری تنظیمیں اب اختیار کاری اور حصے داری پر مبنی انتظام و انصرام پر زور دیتی ہیں جن میں کام کرنے والے اسٹاف ایک مہارت اور صلاحیت سے بھرپور لوگ مانے جاتے ہیں جنھیں مسائل کے حل اور پیش رفت کے لیے مہمیز کیا جاتا ہے۔

اختیار کاری کو سمجھنے کے لیے ہمیں اقتدار (پاور) کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ رولینڈس

(1995) نے دلیل دی ہے کہ پاور اوور (کچھ لوگوں کا کچھ لوگوں پر کنٹرول یا اثر جیسے کہ مردوں کا عورتوں پر، اونچی ذات کے لوگوں کا نچلی ذات کے لوگوں پر) اور پاور ٹو (اقتدار کا عام تصور جس میں لوگ دوسروں کے اندر سرگرمیوں کے ذریعے ان کے حوصلے کو بڑھاتے ہیں) کے درمیان ایک امتیاز ہے اس لیے اصل اختیار کاری پاور ٹو ہے جس کی مدد سے پاور اوور کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ اس پروسیس میں تین اہم پہلو ہیں: پہلا پرسنل، جو کہ خود اعتمادی میں اضافے کی بدولت آتی ہے، دوسرا ریلیشنل، جو کہ قریبی افراد سے گفت وشنید اور فیصلہ لینے کی طاقت سے آتا ہے اور تیسرا اجتماعی، جو کہ مقامی یا قومی پیمانے پر ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے اور مدد کرنے سے آتا ہے۔ فریڈمین (1992) نے اختیار کاری کے تصور کو متبادل ترقی کے لیے مرکزی جگہ دی ہے اور ان کے مطابق تین قسم کے اقتدار ہو سکتے ہیں۔ سماجی اقتدار جس میں کہ معلومات، علم اور مہارت، سماجی اداروں اور معاشی وسائل میں حصے داری شامل ہے۔ سیاسی جس میں کہ ووٹ ڈالنے یا کسی اجتماعی کام کے لیے ہر فرد کو ذاتی طور پر یا گروپ میں فیصلہ لینے کے عمل میں حصے داری ملے۔ نفسیاتی جس میں کہ اقتدار کا احساس اور خود اعتمادی پر مبنی برتاؤ شامل ہے۔ ڈولپمنٹ کے متبادل نظریے یا فریم ورک کے لیے معاشی آسودگی کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر ایک پہلو نہایت ضروری ہے۔

مجلی (1995) کے مطابق 1960 اور 1970 کی دہائی میں جب سماجی ترقی کو فروغ دینے میں حکومتوں نے اپنی نااہلی ظاہر کی تو حصے داری کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ یہ ناکامی حکومت کی بڑے پیمانے پر قائم کی جانے والی بیورو کریسی، ضائع ہونے والے پروجیکٹس اور کرپٹ سیاست دانوں کی شمولیت کی وجہ سے پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں کمیونٹی اونرشپ، کمیونٹی کی حصے داری اور عام لوگوں کو ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آمادہ کیا گیا۔ (مجلی، 60: 1995)

اب سوال یہ ہے کہ کیا حصے داری کا تصور تنظیموں کے لیے ایک مرکزی تصور کی طرح چل سکتا ہے؟ وہائٹ (1995) نے یہ دلیل دی ہے کہ حصے داری شروعاتی دور میں احتجاج کی شکل میں ابھری مگر اب یہ اپنی سیاسی معنویت کھو چکی ہے۔ حصے داری کی سیاست میں دو طرح کا تصور ہے۔ پہلا تو یہ کہ کون حصہ لیتا ہے؟ کیونکہ کمیونٹیز میں یکسانیت کا فقدان ہے اور دوسرا سوال یہ ہے کہ حصے داری کس سطح پر ہوتی ہے؟ کیوں کہ نفاذ کرنا ہی کافی نہیں ہے اور فیصلہ لینے میں ایک اثر و رسوخ کی بھی ضرورت ہے۔ وہائٹ نے حصے داری کی چار قسمیں بتائی ہیں۔ پہلی قسم نامنل ہے جس میں حکومت کے ذریعے گروپ بنائے جاتے ہیں مگر ان کا اصلی مقصد ظاہری طور پر نمایاں کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ دوسری انسٹرومنٹل ہے جس میں وسائل کی کمی کی وجہ لیبر کی فراہمی کی جاتی ہے مگر اس کا نقصان کمیونٹی کے لوگوں کو سہنا پڑتا ہے۔ تیسری نمائندگی پر مبنی ہے جہاں مثال کے طور پر کمیونٹی میں کوئی خاص گروپ کسی بھی پروگرام کی پلاننگ کمیٹی میں داخل ہو جاتا ہے اور اپنی دلچسپیوں کو ہی دیتا ہے۔ چوتھی قسم ٹرانس فارمیٹیو ہے جو سب سے زیادہ ضروری اور کارگر ہے جس میں لوگ باہری مداخلت کے بنا اپنی شرائط پر ہی فیصلے لینے اور ایکشن لینے کے طریقے رائج کرتے ہیں۔ یہ چوتھی اور آخری قسم ہی دراصل 'حصہ داری' کی اصل روح کو پیش کرتی ہے۔ مگر حصہ داری کی ٹاپ ڈاؤن دلچسپیاں باٹم اپ دلچسپیوں سے مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ حصہ داری 'تنازع کی جگہ' ہے جس میں غریبوں کے لیے مثبت اور منفی دونوں طرح کے نتائج ہو سکتے ہیں۔ اختیار کاری کی طرح حصہ داری بھی ایک پروسیس ہے اور یہ عین ممکن ہے کی دلچسپیوں اور ضرورتوں کے پورا نہ ہونے کی صورت میں لوگ حصہ لینا چھوڑ دیں۔

خدمات کی معیاری فراہمی کے موثر نظام کے درمیان تین وجوہات سے خلل پڑتا ہے۔ پہلا تو تنظیمی حرکیات جہاں این جی اوز کے ماحول میں بعض دفعہ تنظیم کو اندرونی حرکیات کی وجہ ایسے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے وہ اپنے 'ہدف سے بھٹک جاتے' ہیں اور اپنے اصلی مقاصد سے دور ہو کر دوسرے طرز پر (کئی بار بہت ہی کم جوش وخروش کے ساتھ) کام کرنے لگتے ہیں۔ کوڑمین کے مطابق تنظیمیں اپنے مقاصد سے اس لیے بھٹک جاتی ہیں کیونکہ فنانشیل اور فنڈنگ کی پریشانی، مسائل کو ختم کرنے میں سسٹم کے ذریعہ کھڑی کی جانے والی رکاوٹیں، اسٹاف کی جاب سکیورٹی کے تئیں فکرمندی اور سب سے آخر میں یہ کہ خدمات بہم کرنے کے معاہدے سے مستقبل میں مزید فنڈ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا بیرونی پریشر خاص طور پر ڈونرز یا فنڈر کی طرف سے ہوتا ہے جس میں ان کی مانگ ہوتی ہے کہ تنظیمیں ایک خاص قسم کی ہی خدمات فراہم کریں جس سے کہ نتائج ایک دم صاف صاف نظر آئیں۔ مثلاً کسی خاص مسئلے پر کمیونٹی بیداری پروگرام میں مقداری پیمانے بنانا ذرا مشکل ہے اس لیے اس طرح کے کام کو ڈونر کئی بار اپنے کام کے فلسفے سے ہی باہر کر دیتے ہیں۔ چونکہ این جی اوز عام طور پر فنڈ کی بدولت ہی اپنی سرگرمیوں کو انجام دیتی ہیں اس لیے انھیں اپنے مقاصد سے سمجھوتہ بھی کرنا پڑتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ موثر خدمات کی فراہمی کا نظام قائم نہیں ہو پاتا ہے اور تیسرا بذات خود ٹارگیٹ گروپ کیوں کہ کئی بار کمیونٹی کے افراد میٹریل وسائل کے خواہش مند ہوتے ہیں جب کہ تنظیم کسی بیداری یا تعلیم کے نظریے کے تحت خدمات دینا چاہتی ہے۔ (یہ سمجھنا بھی اہم ہے کہ ایک دوسرے نظریے سے یہ صحیح بھی ہے کیوں کہ ایک تنظیم کو کمیونٹی کی محسوس کی جانے والی ضرورتوں کو بھی پورا کرنا چاہیے)

خدمات کی فراہمی میں اختیار کاری اور حصے داری کے فروغ کے لیے اور عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے تنظیموں کو اپنے ٹارگیٹ گروپ کے ساتھ مستقل طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ پولے (1994) نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تنظیموں کے لیے یہ ایک اچھا موقع ہے کہ وہ لوگوں کی نہ پوری ہونے والی ضرورتوں کی نشاندہی کریں اور پھر اس میدان میں اسپشلائزیشن کے ساتھ ہی کام کریں کیونکہ اسی صورت میں وہ 'متبادل' تنظیموں کا کردار نبھا سکتی ہیں۔

مندرجہ بالا مباحثے سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ تنظیموں کے ذریعے خدمات کی فراہمی نسبتاً ایک مشکل کام ہے کیوں کہ ہندوستان جیسے ممالک کا معاشی نظام ابھی بھی بے شمار افراد کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر پا رہا ہے۔ ایسے میں این جی اوز کی ذمے داریوں میں اضافہ تو ہوا ہے مگر ان کے کام کرنے لائحہ عمل اور طریق کار میں مذکورہ مباحث کو شامل کرنا نہایت ضروری ہے جس سے وہ اپنی ترقیاتی شناخت کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔ چنانچہ جو تنظیمیں خدمات کی فراہمی کو انجام دینے میں اختیار کاری اور حصے داری کو بنیاد بنا کر اپنے پروگرام اور خدمات کو ڈیزائن کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اندرونی اور بیرونی پریشر سے بھی آزاد رہتی ہیں ان کے لیے ایک موثر خدمات کی فراہمی ممکن ہو پاتی ہے۔ ٹارگیٹ گروپ کے ساتھ ایسی تنظیموں کا رول بھی عارضی ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے طریقہ کار میں مذکورہ پہلوؤں کو مستقل شامل رکھتی ہیں۔ براؤن اور کورٹمین (1989) کے خیال میں جب تک این جی اوز مقامی تنظیموں کی لیاقتوں کو پروان نہیں چڑھاتیں تاکہ ایک وقت کے بعد تنظیمیں خود سے ہی اپنی ترقیاتی سرگرمیوں کا انتظام کریں اور اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو این جی اوز کو یہ کہنے کا اختیار نہیں ہے کہ وہ ترقیاتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

■

Dr. Md. Shahid Raza
Ass. Prof. & Head, Dept of Social Work
MANUU, Hyderabad -500032 (Telangana)

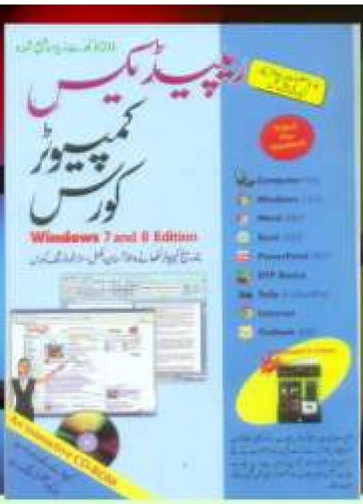

ونڈوز کی بنیادی باتیں (Windows Basics)

آپ میں سے کچھ قاری ایسے ہوں گے، جنھوں نے پہلے کبھی کسی ونڈوز پر مبنی کمپیوٹر پر کام نہیں کیا ہوگا۔ ایسے قارئین کو ونڈوز میں کچھ تکنیکی الفاظ کو سمجھنے میں مشکل پیش آسکتی ہے، حالانکہ ونڈوز نئے سے نئے صارف کے لیے بھی بہت آسان ہے۔ اس باب میں ہم ونڈوز کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں بتائیں گے، جو عموماً ہر ونڈوز پر مبنی سسٹم اور بنیادی طور سے ونڈوز 7 پر لاگو ہوتی ہیں۔ یہاں دی گئی سبھی تصویریں ونڈوز 7 کے مطابق ہیں۔

کسی ونڈوز کی ساخت (Anatomy of a Window)

زیادہ تر ونڈوز میں بہت سے عناصر (Elements) ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہاں ہم کسی ونڈو کے حصوں کا ذکر کریں گے اور ان کی معنویت (Significance) یا اہمیت (Importance) بتائیں گے۔

تصویر W-3.1 میں ایک عام ونڈو دکھائی گئی ہے،

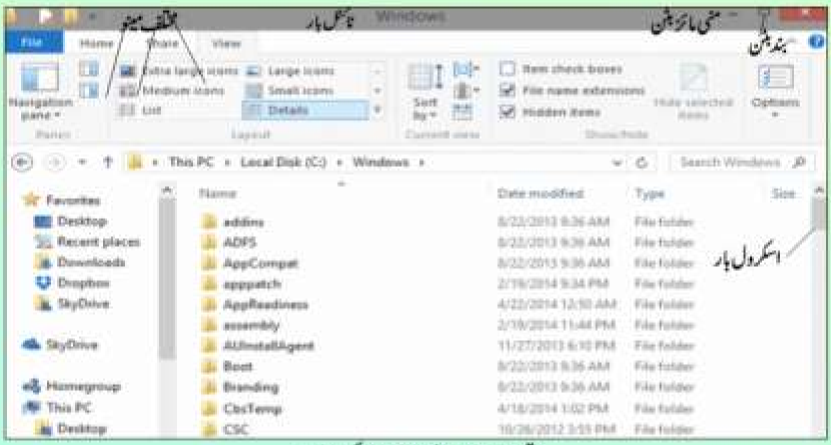

تصویر W-3.1: ایک جیسے ونڈو کی ساخت

جس کے کئی عناصر کو نام سے دکھایا گیا ہے۔ یہ عناصر زیادہ تر ونڈو میں ایک طرح سے پائے جاتے ہیں۔ ان حصوں کا مختصر جائزہ نیچے دیا گیا ہے:

ٹائٹل بار (Title Bar): تقریباً ہر ایک ونڈو کا ایک مخصوص نام ہوتا ہے، جو عام طور سے اس سے وابستہ پروگرام کے نام پر بھی ہوسکتا ہے۔ یہ نام ونڈوز کے سب سے اوپری حصے میں ایک افقی (Horizontal) بار میں پایا جاتا ہے۔ اس بار کو ہی ٹائٹل بار کہتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی پروگرام کی ونڈو کے ٹائٹل بار میں اس دستاویز (یا فائل) کا نام بھی دیا جاتا ہے، جس پر کام کیا جارہا ہے۔ یہ اطلاع اس وقت بڑے کام کی ہوتی ہے، جب ہم ایک ساتھ کئی دستاویزوں پر کام کررہے ہوتے ہیں۔ سرگرم (Active) ونڈو کے ٹائٹل بار کا رنگ یا رفتار (Intensity) دوسرے ونڈوز کے ٹائٹل باروں کے رنگ یا رفتار سے مختلف ہوتی ہے۔

ایڈریس بار (Address Bar): آپ جانتے ہی ہیں کہ سبھی فائل اور فولڈر کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک (Gard Disk) میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی بھی فائل یا فولڈر میں جانا چاہتے ہیں یا اسے کھولنا چاہتے ہیں اور اس میں کام کرنا چاہتے ہیں، تو اس کا نام اور پتہ جاننا ضروری ہوتا ہے۔ ایڈریس بار (Address Bar) کسی بھی فائل یا فولڈر کا پتہ بتانے کے کام آتا اور رہنمائی کرنے میں مدد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر تصویر W-3.1 اور W-3.2 کو دیکھیں۔

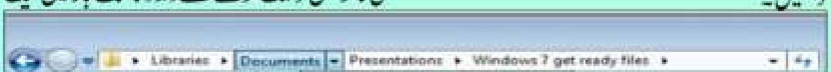

تصویر W-3.2: ایڈریس بار

یہ پتہ (Computer>Local Disk (C:)>Windos) بتاتا ہے کہ ابھی آپ ایک ونڈوز (Windows) نامی فولڈر میں ہیں، جو :C ڈرائیو میں موجود ہے اور یہ :C ڈرائیو ہارڈ ڈسک (جسے ونڈوز کی زبان میں Computer بھی کہا جاتا ہے) میں موجود ہے۔ اگر آپ کو ونڈوز فولڈر سے ایک سطح اوپر جانا ہے، تو آپ ایڈریس بار میں :C ڈرائیو پر ماؤس کلک کرسکتے ہیں۔ اگر آپ ونڈوز فولڈر سے دو سطح اوپر جانا چاہتے ہیں، تو آپ 'Computer' کو بھی کلک کرسکتے ہیں۔ اس طرح ایڈریس بار میں لکھے الفاظ کو کلک کرکے آپ جتنی سطح اوپر جانا چاہیں، جاسکتے ہیں۔

بیک ورڈ اور فارورڈ بٹن (Backward and Forward Button): یہ بٹن ٹائٹل بار کے نیچے ایڈریس بار سے پہلے بائیں جانب نظر آتے ہیں۔ ورڈ بٹن ایک ونڈو (جو آپ کی موجودہ حالت ہے) سے پچھلی ونڈو بار میں جانے میں مدد کرتا ہے اور فاورڈ بٹن پچھلی ونڈو سے واپس اسی بنیادی ونڈو میں آنے میں مدد کرتا ہے۔ ایڈریس بار کے کام کے برعکس ان بٹنوں کے ذریعے آپ ایک بار میں ایک ہی سطح اوپر یا نیچے جاسکتے ہیں۔

منی مائز (Minimize)، **میکسی مائز** (Maximize) **اور کلوز** (Close) **بٹن**: زیادہ تر ونڈوز کے ٹائٹل بار کے اوپری دائیں کونے میں یہ تین بٹن عموماً اسی ترتیب میں پائے جاتے ہیں۔ 'منی مائز' بٹن پر ایک چھوٹی لکیر یا ڈیش چھپا ہوتا ہے۔ 'میکسی مائز' بٹن پر ایک چھوٹا اسکوائر بٹن چھپا ہوتا ہے اور 'کلوز' بٹن پر ایک کراس چھپا رہتا ہے۔ یہ بٹن ونڈو کا سائز بدلنے اور اسے بند کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

منی مائز بٹن کو کلک کرنے سے ونڈو ٹاسک بار میں ایک بٹن کی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے، جسے آپ دوبارہ کلک

کرکے اسے اس کی اصلی شکل میں لا سکتے ہیں۔ کوئی پروگرام ٹاسک بار میں بٹن کی شکل میں آجانے پر بھی چلتا رہتا ہے (یعنی رکتا نہیں)، لیکن اس کی کوئی ونڈو کھلی نہیں ہوتی۔ میکسی مائز بٹن کو کلک کرنے سے ونڈو پوری اسکرین کے برابر ہو جاتی ہے۔ ایسا ہوتے ہی میکسی مائز بٹن ری اسٹور (Restore) بٹن کی شکل میں بدل جاتا ہے، جس پر چھوٹے اسکوائر کا ایک جوڑا چھپا ہوتا ہے۔ ری اسٹور بٹن کو کلک کرنے سے ونڈو اپنے پرانے سائز میں آجاتی ہے۔

اسکرول بار (Scroll Bar): ونڈو کا سائز محدود ہونے کے سبب اس میں تمام اطلاعات ایک بار میں نظر نہیں آتیں، اس لیے اسکرول بار کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اسکرول بار دو ہو سکتے ہیں: عمودی (Vertical) اور افقی (Horizontal)۔ عمودی اسکرول بار کا استعمال ونڈو میں اوپر سے نیچے (یا نیچے سے اوپر) جانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسی طرح افقی اسکرول بار کا استعمال ونڈو میں دائیں یا بائیں جانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ اسکرول ہر ونڈو میں عموماً بالترتیب دائیں اور نچلے کنارے پر پائے جاتے ہیں۔

اسکرول بار میں ایک چھوٹا باکس ہوتا ہے، جسے تھمب (Thumb) یا ایلی ویٹر (Elevator) کہا جاتا ہے۔ ان کو بار میں خواہش کے مطابق سمت میں ماؤس کی مدد سے سرکایا جاتا ہے، جس سے اسی سمت کی اطلاعات ونڈو میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ بار کے دونوں سروں پر ایک ایک بٹن بھی ہوتا ہے، جن پر سمت دکھانے والے تیر بھی بنے ہوتے ہیں۔ ان بٹنوں کو اسکرول بٹن (Scroll bUttons) کہتے ہیں۔ انھیں کلک کرتے ہوئے آپ تیر کی سمت میں جمع اطلاعات کو دیکھ سکتے ہیں۔

مینو (Menu): کوئی مینو کئی آپشن (یا احکام) کی ایک

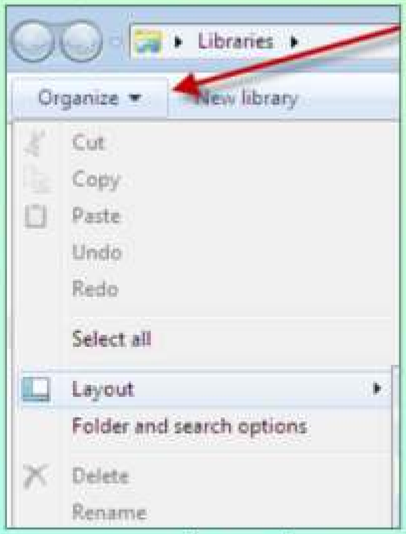

تصویر W-3.3: پل ڈاؤن مینو

فہرست ہوتا ہے، جن میں سے ضرورت کے مطابق کوئی ایک آپشن منتخب کیا جاتا ہے۔ ہر ایک آپشن عموماً کسی کام (Operation) یا سیٹنگ (Setting) کو ظاہر کرتا ہے۔

آپشن کی تعداد زیادہ ہونے پر ان کو گروپوں میں بانٹ دیا جاتا ہے اور ہر گروپ کا ایک مخصوص نام رکھا جاتا ہے، جس سے وہ آپشن وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسے مینو میں اوپر ایک افقی بار ہوتا ہے، جسے مینو بار (Menu Bar) کہا جاتا ہے۔ مینو بار میں سبھی مینو گروپوں کے نام دیے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی مینو نام کو کلک کرنے پر اس گروپ کے سبھی آپشن ایک مینو کی شکل میں اوپر سے نیچے کی طرف دکھائی پڑنے لگتے ہیں۔ ایسے مینو کو پل ڈاؤن مینو (Pull Down Menu) بھی کہا جاتا ہے۔ تصویر W-3.3 میں ایک پل ڈاؤن مینو دکھایا گیا ہے، جو مینو بار کے 'Organise' مینو گروپ (جو تصویر W-3.1 میں دکھایا گیا ہے) سے وابستہ ہے۔

سسٹم کنٹرول مینو (System Control Menu): ہر ایک ونڈو میں ٹائٹل بار کے بالکل آخری بائیں کنارے پر ایک آئیکان ہوتا ہے، جسے سسٹم مینو آئیکان (System Menu Icon) کہا جاتا ہے۔ اس آئیکان کو کلک کرنے پر ایک مینو کھل جاتا ہے، جسے سسٹم

تصویر W-3.4: سسٹم کنٹرول مینو

کنٹرول مینو کہتے ہیں۔ تصویر W-3.4 میں ایسا ایک مینو دکھایا گیا ہے۔ اس مینو میں ونڈو کا سائز بدلنے (Resizing)، اسے دوسری جگہ پر لے جانے (Moving) اور بند کرنے (Closing) کے آپشن ہوتے ہیں۔ اس مینو سے باہر کہیں بھی کلک کرکے اس مینو کو بند کیا جا سکتا ہے۔

ہلکے رنگ میں آپشن نام (Greyed Option Name): کسی کسی مینو میں کچھ یا کوئی آپشن کسی دوسرے رنگ (عموماً ہلکے رنگ) میں دکھائے جاتے ہیں۔ ایسے آپشن چنے نہیں جا سکتے، کیونکہ کسی وجہ سے ان میں بھرے گئے کام کو کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر تصویر W-3.3 میں کاپی (Copy) آپشن کو ہلکا کیا گیا ہے، کیونکہ اس وقت Copy کرنے کے لیے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ مینو میں صرف انھیں آپشن کو عام یا گہرے رنگ میں دکھایا جاتا ہے، جن میں بھرا گیا کام کرنا اس وقت ممکن ہو۔ مینوؤں میں ضرورت کے مطابق آپشن گہرے یا ہلکے ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی ان کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

مینوؤں پر کام کرنا
(Working with Menus)

کسی مینو پر کام کرنے کا مطلب ہے، اس کو فعال بنانا (یا ایکٹو کرنا) اور اس میں سے خواہش کے مطابق آپشن چننا۔ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں ان دونوں کاموں کو کرنے کے کئی طریقے موجود ہیں۔ کسی مینو کو ایکٹو کرنے کا سب سے آسان طریقہ اس کے نام کو کلک کرنا ہے اور مینو کے کسی آپشن کو چننے کا سب سے آسان طریقہ اس آپشن پر ماؤس پوائنٹر لے جا کر کلک کر دینا ہے۔

مینو کو کی بورڈ کی مدد سے بھی ایکٹو (Active) کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے Alt کنجی کے ساتھ اس مینو کے نام کا نشان زد (Underlined) حرف دبایئے۔ مثال کے طور پر اگر مینو کا نام 'Edit' ہے، تو اسے ایکٹو کرنے کے لیے Alt+E (یعنی Alt کے ساتھ E) دبایا جائے گا۔ ایک بار مینو کھل جانے، یعنی ایکٹو ہو جانے پر کسی آپشن کا انتخاب درج ذیل میں سے کسی بھی طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔

1. آپشن پر ماؤس پوائنٹر لا کر کلک کر کے
2. آپشن کا نشان زد حرف ٹائپ کر کے، یا
3. اوپر اور نیچے کی تیر والی کنجیوں کو دبا کر اس آپشن کو ہائی لائٹ کر کے رٹرن یا انٹر (Enter) دبا کر۔

مینو میں خاص اشارے
(Special Indicators in Menus)

کسی کسی مینو میں کچھ آپشن کے پہلے اور بعد میں چند خصوصی نشان دیے ہوتے ہیں۔ یہ نشان اس آپشن

تصویر W-3.5: ایک ابھرتا مینو

کے بارے میں اضافی اطلاعات مہیا کراتے ہیں۔ ان نشانات اوران کی افادیت کا ذکر نیچے کیا گیا ہے:

صحیح کا نشان (Check Mark): یہ عام طور پر کسی آپشن کے ٹھیک پہلے پائے جاتے ہیں۔ ایسے آپشن درحقیقت کسی سوئچ یا حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب وہ سوئچ 'سیٹ' ہوتا ہے، تو اس کے پہلے صحیح کا نشان نظر آتا ہے اور جب وہ سیٹ نہیں ہوتا، یعنی ری سیٹ (Reset) ہوتا ہے، تو یہ نشان نظر نہیں آتا۔ ایسے آپشن کو ٹاگل (Toggle) آپشن بھی کہا جاتا ہے۔ ایسے آپشن کو کلک کرکے سیٹ اور پھر سے کلک کرکے ری سیٹ کیا جاتا ہے۔

مثلث (Triangle): کسی مینو کے کسی آپشن کے دائیں جانب کالے رنگ میں مثلث ہونے کا مطلب ہے کہ اس آپشن سے ایک ذیلی مینو جڑا ہوا ہے۔ اس مینو کو سب-مینو (Sub-Menu) یا ابھرتا مینو (Cascading Menu) بھی کہا جاتا ہے۔ جب بھی ماؤس پوائنٹر ایسے آپشن پر آتا ہے تو اس کا ابھرتا مینو ایکٹو ہو جاتا ہے اور اس کے دائیں جانب (یا اُدھر جگہ نہ ہونے پر بائیں جانب) نظر آنے لگتا ہے۔ یہ مینو بھی دوسرے مینوؤں کی طرح ہی کام کرتا ہے۔ تصویر W-3.5 میں ایک ابھرتا مینو دکھایا گیا ہے۔

نقطہ (Dot): جب کسی مینو میں دیے گئے کچھ آپشن باہم امتیازی (Mutually Exclusive)، یعنی ایسے ہوتے ہیں کہ کسی وقت ان میں سے ایک اور صرف ایک ہی آپشن منتخب کیا جاسکتا ہے، تو اس منتخب کیے ہوئے آپشن کے سامنے ایک بڑا (●) سیاہ نقطہ نظر آتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کون سا آپشن لاگو ہے۔ ایسے آپشن کو ایک گروپ کی شکل میں الگ سے دکھایا جاتا ہے۔ گروپ کے کسی دیگر آپشن کو کلک کرکے اس کو لاگو کیا جاتا ہے۔ یہ بھی تصویر W-3.5 میں دکھایا گیا ہے۔

حذفیہ (Ellipsis): حذفیہ کسی آپشن کے فوراً بعد تین چھوٹے لگاتار نقطوں (...) کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کا

تصویر File:W-3.6 مینو

مطلب ہے کہ اس آپشن سے متعلق کام کرنے سے پہلے کچھ اضافی اطلاعات کی ضرورت ہونی چاہیے۔ ایسے آپشن کو چننے پر ایک ڈائیلاگ باکس کھل جاتا ہے، جس میں آپ ضروری اطلاعات بھر سکتے ہیں۔ اس ڈائیلاگ باکس میں OK بٹن کو کلک کرکے باہر نکلنے پر ہی وہ آپشن ایکٹو ہوتا ہے۔

کنجیوں کا جوڑ (Key Combination): تجربہ کار صاف بار بار ماؤس سے کی بورڈ اور کی بورڈ سے ماؤس پر جانے کی بجائے اکیلے کی بورڈ کا استعمال کرنا آسان سمجھتے ہیں۔ ونڈوز میں ایسی سہولت دستیاب ہے کہ کسی کسی مینو میں کچھ آپشن کو آپ مینو ایکٹو کیے بغیر سیدھے ہی چن سکتے ہیں۔ ایسے ہر آپشن سے ایک کنجیوں کا جوڑ جڑا ہوتا ہے۔ ان کنجیوں کو ایک ساتھ دبانا اس آپشن کو چننے کے برابر ہوتا ہے۔ ایسی کنجیوں کے جوڑی مجموعہ کو شارٹ کٹ کنجی (Short-cut Keys) کہتے ہیں مثال کے طور پر 'Paste' آپشن کے لیے کنجیوں کا مجموعہ 'Ctrl+V' ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ Ctrl کے ساتھ V دبا کر "Paste" ہدایت دے سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، 'Ctrl+V' پیسٹ ہدایت کی شارٹ کٹ کنجی ہے۔ مثال کے طور پر تصویر W-3.66 کو دیکھیں۔

ونڈو کو سرکانا (Moving a Window)

آپ کسی بھی ونڈو کو اپنے ڈیسک ٹاپ پر کہیں بھی آسانی سے لے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے ونڈو کے ٹائٹل بار کو خواہش کے مطابق جگہ پر کھینچ کر لے جایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پوری ونڈو اپنے آپ ہی وہیں پہنچ جاتی ہے۔ ٹائٹل بار کو کھینچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ماؤس پوائنٹر کو اس پر لاکر ماؤس بٹن کو دبائے رکھیے اور پھر ٹائٹل بار کو کھینچ لے جائیے۔ من پسند جگہ پر پہنچ کر ماؤس کو چھوڑ دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ پوری ونڈو نئی جگہ پر پہنچ گئی ہے۔

ونڈو کا سائز بدلنا (Resizing a Windos)

ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کسی ونڈو کا سائز بدلنے کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سب سے آسان طریقہ منی مائز اور میکسی مائز بٹنوں کا استعمال کرنا ہے، جن کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

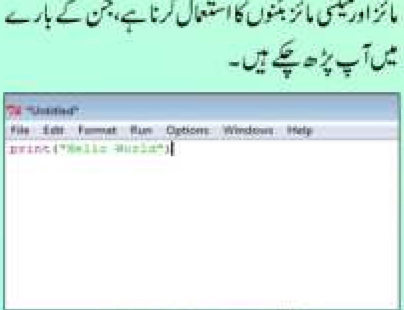

تصویر W-3.7: ونڈو کا سائز بدلنا

ونڈوز کے سائز کو بدلنے کا دوسرا طریقہ اس کے سائڈوں کو ماؤس کی مدد سے ادھر اُدھر سرکانا ہے۔ اس سے ونڈو کی سائڈ (Border) نئی جگہ تک گھٹ یا بڑھ جاتی ہے۔ جب بھی آپ ماؤس پوائنٹر کو کسی ونڈو کے دائیں یا بائیں کنارے پر لے جاتے ہیں، وہ ایک افقی ڈبل تیر کے ( ) نشان میں بدل جاتا ہے۔ اس وقت ماؤس بٹن کو دبا کر پکڑے رکھنے سے آپ اس سائڈ کو افقی سمت میں کہیں بھی لے جاسکتے ہیں۔ جہاں لے کر آپ ماؤس بٹن کو چھوڑ دیں گے، وہ سائڈ وہیں ٹھہر جائے گا اور ونڈو کی چوڑائی بدل جائے گی۔

اسی طرح ماؤس پوائنٹر ونڈو کے اوپری یا نچلے سائڈ پر آتے ہی ایک عمودی ڈبل (↕) تیر کے نشان میں بدل جاتا ہے۔ اس وقت آپ ماؤس کے ذریعے اس سائڈ کو اوپر یا نیچے کہیں بھی لے جاسکتے ہیں۔ اس سے ونڈو کی اونچائی بدل جائے گی۔

کسی ونڈو کی چوڑائی اور اونچائی ایک ساتھ بدلنا بھی ممکن ہے۔ ماؤس پوائنٹر کو ونڈو کے کسی کونے پر لے جاتے ہی وہ ایک ترچھے ڈبل تیر کے نشان (⤢) یا (⤡) میں بدل جاتا ہے۔ اس وقت ماؤس بٹن دبائے رکھ کر آپ اس کونے کو کہیں بھی لے جاسکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ونڈو کی اونچائی اور چوڑائی دونوں ایک ساتھ بدل جائیں گی۔

ڈائیلاگ باکسوں پر کام کرنا (Working with Dialogue Boxes): ڈائیلاگ باکس ایک خاص قسم کی ونڈو ہوتا ہے، جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے۔ اس کا مقصد صارف کے ساتھ بات چیت (Interact) کرنا ہوتا ہے۔ اس میں عموماً کوئی مینو نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی منی مائز یا میکسی مائز بٹن ہوتا ہے، لیکن اس میں کلوز (بند) بٹن ضرور ہوتا ہے۔ تصویر W-3.8 میں ایک عام ڈائیلاگ باکس دکھایا گیا ہے۔

جب بھی کسی مینو میں کوئی ایسا آپشن چنا جاتا ہے، جس میں حذفیہ (...) ہو، تو اس آپشن کو چننے پر ایک ڈائیلاگ باکس کھل جاتا ہے۔ ڈائیلاگ باکس کا استعمال درج ذیل کاموں کے لیے کیا جاتا ہے:

1. مختلف آپشن کی جانچ کرنا
2. کسی کام کو کرنے یا جاری رکھنے کے لیے ضروری اطلاعات دینا
3. دیے ہوئے آپشن کی فہرست میں سے ایک کو چننا
4. اگر کسی ہدایت پر عمل کرنے میں غلطی ہوگئی ہو، تو اس کی تصدیق کرنا یا وارننگ دینا۔
5. سسٹم میں کوئی مسئلہ پیدا ہونے پر آپ کو آگاہ کرنا۔
6. اگر کسی ہدایت پر عمل نہیں کیا جاسکتا، تو اس کی وجہ بتانا۔

تصویر W-3.8: ایک عام ڈائیلاگ باکس

کسی ڈائیلاگ باکس میں بہت سے عناصر ہوتے ہیں، جیسے ہدایت بٹن (Command Buttons)، ڈراپ ڈاؤن لسٹ (Drop Down Lists)، وغیرہ۔ کوئی ڈائیلاگ باکس صرف ایک 'Ok' ہدایت بٹن والا بھی ہوسکتا ہے۔ اگر کسی ڈائیلاگ باکس میں بہت سے ایسے عناصر ہیں، تو وہ کئی سیکشنوں اور جدول میں بٹے ہوسکتے ہیں۔

کسی ڈائیلاگ باکس میں کسی سیکشن، آپشن، باکس یا بٹن کو درج ذیل تین میں سے کسی ایک طریقے سے ایکٹو کیا جاسکتا ہے:

1. اس آبجیکٹ کو ماؤس پوائنٹر سے کلک کرکے۔
2. اپنے کی بورڈ پر ٹیب (Tab) بٹن دبا کر۔ خالی ٹیب دبانے سے گھڑی کے چلنے کی سمت میں (بائیں سے دائیں) ڈائیلاگ باکس کے عناصر سلسلہ وار ایکٹو ہوتے ہیں۔ شفٹ کے ساتھ ٹیب دبانے سے اس کی الٹی سمت میں عناصر سلسلے وار ایکٹو ہوتے ہیں۔
3. Alt کنجی کے ساتھ کسی عناصر کے نام (Element Name) کا انڈر لائنڈ حرف دبا کر۔

ڈائیلاگ باکس کا ہر ایک عنصر آپ کو کئی طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے اطلاعات فراہم کرنے کا موقع دیتا ہے۔ ذیل میں ان عناصر کے بارے میں مختصراً بتایا گیا ہے۔

کمانڈ بٹن (Command Buttons): ان کا انتخاب کسی خاص کام کو شروع کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ او کے (Ok)، رد (Cancel) اور مدد (Help) بٹن سب سے زیادہ استعمال کیے جانے والے کمانڈ بٹن ہیں۔ یہ بٹن ڈائیلاگ باکس میں عام طور پر سب سے نیچے یا دائیں جانب بنے ہوتے ہیں۔ 'Ok' بٹن منتخب کرنے کا مطلب ہے کہ ڈائیلاگ باکس میں آپ نے جو اطلاعات بھری ہیں، وہ ٹھیک ہیں اس کو منتخب کرنے سے ڈائیلاگ باکس بند ہوجاتا ہے اور کام، اگر کوئی ہو، شروع ہوجاتا ہے۔ 'رد' (کینسل) بٹن کو منتخب کرنے سے آپ نے ڈائیلاگ باکس میں جو اطلاعات بھری ہیں، وہ رد ہوجاتی ہیں اور باکس بغیر کچھ کیے بند ہوجاتا ہے۔ ہیلپ بٹن کو منتخب کرکے آپ ڈائیلاگ باکس کے مختلف عناصر کے بارے میں یہ جانکاری حاصل کرسکتے ہیں کہ کوئی عنصر واقعی میں کس کام کے لیے ہے۔

کئی کمانڈ بٹنوں کے نام کے ساتھ حذفیہ (...) بھی ہوتا ہے۔ ایسے کمانڈ بٹنوں کو کلک کرنے سے ایک نیا ڈائیلاگ باکس کھل جاتا ہے۔

جو کمانڈ بٹن کسی وجہ سے دستیاب نہیں ہوتے، انھیں ہلکے رنگ میں دکھایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی جو کمانڈ بٹن اس وقت منتخب کیا ہوا ہوتا ہے، اس کی کناری دیگر کمانڈ بٹنوں کے مقابلے کچھ گہری یا موٹی ہوتی ہے یا اس کے چاروں طرف ٹوٹی لائنوں (Dotted Lines) والا گھیرا (یا مستطیل) بنا ہوتا ہے۔

ڈراپ کا ڈاؤن لسٹ باکس (Drop-Down List Boxes): یہ لسٹ باکس ایسے موقعے پر دیے جاتے ہیں جب آپ کو کئی آپشن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو اور پوری فہرست دینے کے لیے باکس میں جگہ نہ ہو۔ ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس عام لسٹ باکس کی طرح ہی ہوتا ہے، لیکن اس کے دائیں کنارے پر ایک تیر کے نشان والا بٹن ہوتا ہے، جو نیچے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب آپ اس بٹن کو کلک کرتے ہیں، تو دستیاب آپشن کی فہرست ایک باکس میں دکھائی جاتی ہے۔ اگر آپشن کی تعداد باکس میں سمانے لائق تعداد سے زیادہ ہے، تو ایک اسکرول بار بھی دیا جاتا ہے۔ یہ فہرست ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس کے ٹھیک اوپر یا ٹھیک نیچے کھول کر دکھائی جاتی ہے۔

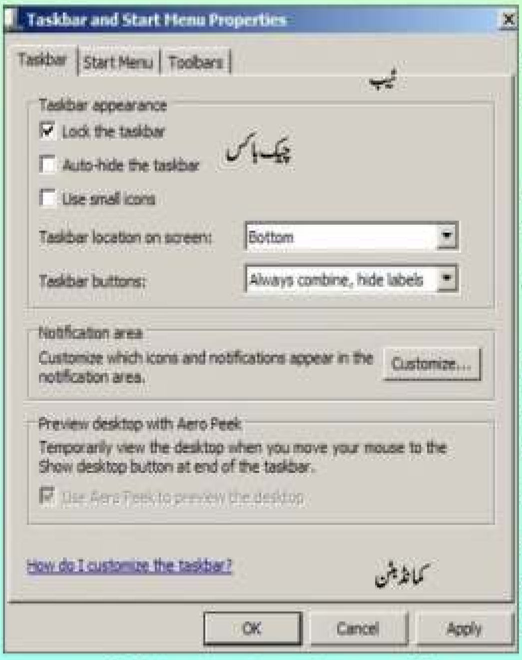

تصویر W-3.9: مختلف عناصر کے ساتھ ایک ڈائیلاگ باکس

ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں سے آپشن چننے کا طریقہ عام لسٹ باکسوں جیسا ہی ہے۔ اس کے لیے آپ من پسند آپشن پر ماؤس پوائنٹر لاکر ماؤس بٹن کو کلک کردیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کے ذریعے چنا گیا آپشن ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں بھرا ہوا نظر آنے لگتا ہے اور کھلی ہوئی فہرست چھپ جاتی ہے۔ کچھ ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس آپ کو یہ سہولت بھی دیتے ہیں کہ اگر دستیاب آپشن میں سے کوئی بھی آپ کو نہیں چاہیے، تو آپ اس میں سیدھے کوئی ٹیکسٹ ٹائپ کرسکتے ہیں۔ ایسا ہونے پر آپ کے ذریعے بھرا گیا ٹیکسٹ آپشن کی فہرست میں جڑ جاتا ہے اور اگلی بار آپ اسے بغیر ٹائپ کیے چن سکتے ہیں۔

چیک باکس (Check Boxes): کوئی چیک باکس ایسے آپشن کے مجموعے کو پیش کرتا ہے، جو باہم امتیازی نہیں ہوتے۔ آپ ان میں سے ایک یا زیادہ آپشن ایک ہی وقت چن سکتے ہیں۔ جو آپشن چنے جاتے ہیں ان کے آگے والے خانے میں صحیح کا نشان (✓) نظر آتا ہے۔ جو آپشن کسی وجہ یا زیادہ آپشن کسی وجہ سے دستیاب نہیں ہوتے، ان کا رنگ ہلکا ہوجاتا ہے۔ تصویر W-3.9 میں ایک ایسا ڈائیلاگ بکس دکھایا گیا ہے، جس میں چیک باکس ہیں۔

ٹیب شیٹ (Tab Sheet): جب کسی ڈائیلاگ باکس میں بہت سے عناصر ایک ساتھ جمع ہوجاتے ہیں، تو وہ صارف کو شک میں ڈال سکتے ہیں۔ اس پریشانی سے بچنے کے لیے، ونڈوز 7 میں ڈائیلاگ باکسوں کو شیٹوں کے مجموعہ (Collection) کے روپ میں منظم کیا جاتا ہے۔ ہر ایک شیٹ کا ایک ٹیب ڈائیلاگ باکس میں ہوتا ہے۔ اس ٹیب کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ اس ٹیب شیٹ میں کیسی اطلاعات مانگی گئی ہیں۔ ایسے سبھی ٹیب کو ٹائٹل بار کے نیچے ایک افقی قطار میں باکسوں کی شکل میں دکھایا جاتا

ہے، جیسا کہ تصویر W-3.9 میں دکھایا گیا ہے۔ موجودہ ٹیب میں سے کوئی ایک ہی کسی وقت ایکٹو ہوتا ہے۔ ایکٹو ٹیب دیگر ٹیب کے مقابلے کچھ اوپر اٹھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کسی ٹیب شیٹ کو ایکٹو کرنے، یعنی کھولنے کے لیے اس کے نام کو کلک کرنا چاہیے۔

آپشن بٹن (Option Button): یہ بٹن باہم امتیازی آپشن کے ایک گروپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کسی بھی وقت ان میں سے صرف ایک آپشن چن سکتے ہیں۔ چنے ہوئے آپشن کے آگے ایک بڑا سیاہ نقطہ (Dot) دکھائی پڑتا ہے۔ اگر آپ کسی دیگر آپشن کو کلک کرتے ہیں، تو ڈاٹ پچھلے آپشن سے ہٹ کر اس نئے آپشن کے سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب وہ آپشن چنا ہوا ہے۔ جو آپشن دستیاب نہیں ہوتے، اس کے ناموں کا رنگ ہلکا ہو جاتا ہے۔ آپشن بٹنوں کو ریڈیو بٹن (Radio Buttons) بھی کہا جاتا ہے۔ تصویر W-3.10 میں آپشن بٹن دکھائے گئے ہیں۔

اسپین کنٹرول باکس (Spin Control Boxes): یہ ایسے چھوٹے باکس ہیں، جن میں کوئی تعداد یا عددی پیرامیٹر بھرا جاتا ہے۔ ایسے باکسوں کے دائیں حصے میں دو چھوٹے تیر کے بٹن لگے ہوتے ہیں، جن میں اوپر کا بٹن اوپر کی طرف اور نیچے کا بٹن نیچے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب ہم اوپر کے بٹن کو کلک کرتے ہیں، تو اس باکس میں بھری ہوئی تعداد بڑھ جاتی ہے اور جب نیچے کے بٹن کو کلک کرتے ہیں، تو اس باکس میں بھری ہوئی تعداد گھٹ جاتی ہے۔ اس طرح آپ اس باکس کی تعداد کو اپنی خواہش کے مطابق تعداد تک لے جا سکتے ہیں۔ ویسے آپ اس باکس میں تعداد سیدھے بھی ٹائپ

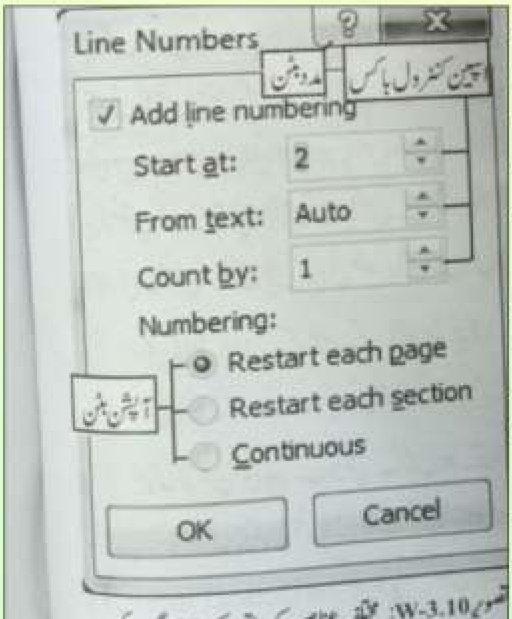

تصویر W-3.10: مختلف عناصر کے ساتھ ایک ڈائیلاگ باکس

کر سکتے ہیں۔ تصویر W-3.10 اسپین کنٹرول باکس دکھائے گئے ہیں۔

مدد بٹن (Help Button): ونڈوز میں زیادہ تر ڈائیلاگ باکسوں میں ایک ایسا بٹن اوپری دائیں کونے پر ہوتا ہے، جس پر ایک سوالیہ نشان (؟) لکھا ہوتا ہے۔ یہ کلوز بٹن (Close Button) کے برابر میں پایا جاتا ہے۔ اسے مدد (یا ہیلپ) بٹن کہتے ہیں۔ تصویر W-3.10 میں یہ بن دکھایا گیا ہے۔

ہیلپ بٹن کا استعمال کسی ڈائیلاگ باکس کے کسی عنصر میں مانگی گئی اطلاع بھرتے وقت امدادی اطلاعات کو حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو کسی عنصر کے بارے میں امدادی اطلاعات چاہئیں، تو درج ذیل ہدایتوں پر عمل کیجیے۔

1. ہیلپ بٹن (؟) کو کلک کیجیے۔ اس سے ماؤس پوائنٹر کے ساتھ ایک سوالیہ نشان (؟) جڑ جاتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اب آپ مدد لینا چاہتے ہیں۔
2. اس وقت ماؤس پوائنٹر کو اس عنصر پر لے جا کر کلک کر دیجیے، جس کے بارے میں آپ امدادی اطلاعات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کرتے ہی اس عنصر سے متعلق امدادی اطلاعات ایک باکس میں نظر آنے لگتی ہیں۔ یہاں آپ ان کو پڑھ سکتے ہیں۔ پڑھ لینے کے بعد کہیں بھی کلک کرنے سے امدادی اطلاعات غائب ہو جاتی ہیں۔

ہیلپ بٹن ایسے معاملوں میں بہت کارآمد ہوتا ہے، جن میں آپ کو یہ پوری طرح معلوم نہیں ہوتا کہ ڈائیلاگ باکس کے کسی عنصر میں کیا اطلاع بھری جائے گی۔

ٹیکس باکس (Text Boxes): یہ ایسے بکس ہوتے ہیں، جن میں آپ نام، عنوان وغیرہ اطلاعات ٹائپ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کو ایسی اطلاعات فراہم کرنے کا موقع دیتے ہیں، جو پروگرام کے لیے ضروری ہیں، جیسے کسی فائل یا دستاویز کا نام۔ جب آپ کسی ٹیکسٹ باکس میں کچھ ٹائپ کرتے ہیں، تو اس باکس میں ایک سیدھی کھڑی لائن (|) نظر آتی ہے، جسے نقطہ شمول (Insertion Point) یا کرسر (Cursor) کہا جاتا ہے۔ جو ٹیکسٹ آپ ٹائپ کرتے ہیں، وہ کرسر کی جگہ ہی نظر آتا ہے، یعنی جوڑا جاتا ہے۔

ٹیکسٹ باکسوں میں پہلے سے ہی کچھ ڈیفالٹ ٹیکسٹ (Default Text) بھرا ہو سکتا ہے۔ جب آپ اس ٹیکسٹ باکس پر آتے ہیں، تو وہ ٹیکسٹ الٹے رنگ میں ابھر آتا ہے۔ اس وقت اگر آپ کچھ اور ٹائپ کریں، تو وہ ڈیفالٹ ٹیکسٹ کی جگہ بھر دیا جاتا ہے۔ ڈیفالٹ ٹیکسٹ کو غائب کرنے کے لیے آپ ڈلیٹ (Del) یا بیک اسپیس (Backspace) کنجی دبا سکتے ہیں۔

لسٹ باکس (List Boxes): ایسے باکس ہیں، جو بعض دستیاب آپشن کی فہرست کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر آپشن کی تعداد باکس کے سائز سے زیادہ ہے، تو اسکرول بار بھی دیا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے آپ پوری فہرست کو دیکھ سکتے ہیں۔ عموماً آپ لسٹ باکس میں کسی ایک آپشن کو چن سکتے ہیں، لیکن کبھی کبھی آپ ایک سے زیادہ آپشن بھی چن سکتے ہیں۔ لسٹ باکس آپ کو کوئی اطلاع ٹائپ کرنے سے بچانے کے لیے دیے جاتے ہیں۔

■

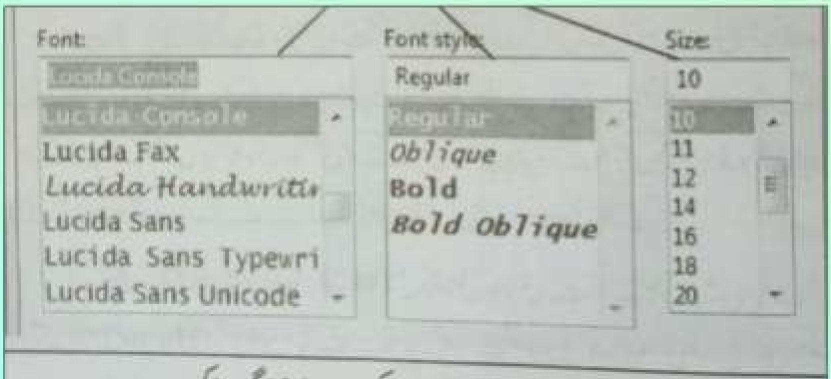

تصویر W-3.11: لسٹ باکس والا ڈائیلاگ باکس

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

باتوں باتوں میں سائنس

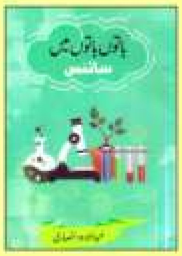

مصنف: عبدالودود انصاری
صفحات: 79، قیمت: 60 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: رفیع الدین ناصر، مولانا آزاد کالج،
روضہ باغ، اورنگ آباد 431001 (مہاراشٹر)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' نئی دہلی، آج کل پروفیسر ارتضیٰ کریم کی سربراہی میں سائنسی کتابوں کو منظرِ عام پر لانے میں بہت فعال کردار ادا کر رہا ہے۔ 'باتوں باتوں میں سائنس' کونسل کی ایک اہم کتاب ہے جس کے مصنف عبدالودود انصاری کا نام اردو سائنسی میدان میں پورے ملک و بیرون ملک میں بہت جانا پہچانا ہے۔ وہ 1983 سے اب تک 400 سے زیادہ سائنسی موضوعات پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں۔ اُن کے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحریر معیاری، معلوماتی، سادہ اور سلیس زبان میں ہوتی ہے جو اردو کے عام فہم قاری کو فوری اپنی طرف راغب کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک بھر کے اخبارات و رسائل اُن کے مضامین کو بڑے احترام سے شائع کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ملک کی بیشتر اکادمیوں اور انجمنوں نے انہیں اپنے اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ کولکاتا کے سرسید ایوارڈ 2017 کی پیشکش اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے۔ کتاب 'باتوں باتوں میں سائنس' اُن کی 23 ویں کوشش ہے جو اپنے آپ میں بہت اچھوتی کاوش ہے۔ اس میں پیش کیے گئے تمام مضامین انتہائی جدید معلومات پر مبنی ہیں۔ جس میں تمام مضامین کو مکالموں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس اندازِ تحریر کے بارے میں جناب عبدالودود انصاری بتلاتے ہیں کہ ''میں نے سائنس کی مشکل شکل کو آسان بنانے کے لیے مکالمہ نگاری کا انتخاب کیا ہے تاکہ بچے آسانی اور دلچسپی کے ساتھ باتوں باتوں میں سائنسی معلومات حاصل کر سکیں۔ آپ جب کتاب 'باتوں باتوں میں سائنس' پڑھیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ کس قدر آسان اور سلیس زبان میں سائنسی معلومات پیش کی گئی ہیں''۔ جوں جوں ہم کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں توں توں تجسس بڑھتا جاتا ہے۔ ہر ایک موضوع کو انتہائی دلچسپ اور پرکشش انداز میں تحریر کیا گیا ہے جیسا کہ چاند کو چندا ماما' سورج کو سورج بادشاہ اسی طرح شبنم آنٹی، تتلی رانی، جگنو راجا، بجلی رانی، سونا راجا، چاندنی بیگم، ریڈیم بابو، چمبک مہاراج، پارا بابا کو نور کی کہانی 'قوس قزح سے بات چیت' وغیرہ کو آپسی عام فہم گفت و شنید کے انداز میں پوری بنیادی معلومات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہر ایک موضوع اپنے آپ میں تمام معلومات کا احاطہ کرتا ہے اسی لیے عام قاری کے ساتھ ساتھ بچے اور وہ طلباء جو مختلف مسابقتی امتحانات میں شرکت کر رہے ہیں' ان کے لیے یہ کتاب انتہائی فائدہ مند ہے۔ باذوق قاری اگر اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ہر ایک عنوان میں ادب کی چاشنی کے ساتھ ساتھ بچوں کی نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر معلومات کو پیش کیا گیا ہے جو بڑوں کے لیے بھی یکساں طور پر فائدہ مند ہے۔

کتاب 'باتوں باتوں میں سائنس' کو دیکھ کر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا تھا کہ سائنس کو اس طرح مکالموں کی شکل میں پیش کرنا قابلِ تعریف کام ہے' اور یہ کام عبدالودود انصاری نے کر کے سائنس پر لکھنے والوں کے لیے ایک نئی راہ فراہم کی ہے۔ عبدالودود انصاری نے ہر ایک موضوع کی گفتگو کو ادبی ماحول سے شروع کیا' جس کو آگے بڑھاتے ہوئے جب سائنس کی بات شروع کی تو ہر ایک عنوان کی مکمل بنیادی معلومات' اس موضوع پر ابھی تک کی گئی تحقیقات کو بہت خوشگوار انداز میں پیش کیا۔ اس لیے ڈاکٹر کیپٹن ایم ایم شیخ نے کہا کہ عبدالودود انصاری نے کتاب 'باتوں باتوں میں سائنس' کو پیش کر کے ادب و سائنس کو یکجا کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کا مطالعہ تمام کے لیے بہت ضروری ہے۔ قومی کونسل نے اس کتاب کو انتہائی معیاری طباعت سے آراستہ کر کے پرکشش ٹائٹل سے سنوار کر بہت خوبصورت انداز میں کم قیمت پر اردو قاری کے لیے پیش کیا جس کے لیے میں قومی کونسل کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور جناب عبدالودود انصاری کے لیے دعا گو ہوں کہ

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (آمین)

تذکرہ شعرائے کشمیری پنڈتان المعروف بہ بہار گلشن کشمیر (جلد اوّل و دوم)

مرتبہ ومؤلف: پنڈت برج کشن کول بے خبر، پنڈت جگموہن ناتھ رینا شوق
ترتیب نو: ڈاکٹر حسین ماجد
صفحات: 454 (اوّل) 538 (دوم)
قیمت: 275 (اوّل) 300 (دوم) روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، بیت الراضیہ، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

اردو میں تذکرہ نگاری کا فن دیگر علوم وفنون کی طرح فارسی سے آیا ہے۔ فارسی میں تذکرہ نگاری نے اردو سے بہت پہلے باضابطہ ایک فن کی شکل اختیار کرلی تھی، جبکہ اردو میں اس کا آغاز وارتقا بہت بعد میں سامنے آیا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے اب تک بڑی تعداد میں شعرا کے تذکرے قلم بند کیے جاچکے ہیں لیکن ان تذکروں کی سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ ان میں بڑی حد تک تنوع پایا جاتا ہے۔ تذکروں کے اہمیت و افادیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تذکرہ نگار بالغ نظری کی خوبی سے متصف ہو۔ تذکرہ نگار جتنا بالغ نظر ہوگا، تذکرہ اسی مناسبت سے قدر ومنزلت کا فن پارہ ہوگا۔ ہمیں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ تذکرے ہماری تاریخی، ادبی، لسانی اور تہذیبی و ثقافتی زندگی کو سمجھنے میں مددگار اور معاون ہوتے ہیں۔

پیش نظر کتاب تذکرۂ شعرائے کشمیری پنڈتان (المعروف بہ بہار گلشن کشمیر جلد اول و دوم) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کشمیری پنڈتوں کی شاعری اور ان کے مختصر تعارف پر مشتمل ہے۔ اس کے اولین مرتبین ومؤلفین پنڈت برج کشن کول بے خبر اور پنڈت جگ موہن ناتھ رینا شوق ہیں جبکہ ترتیب نو کا سہرا ڈاکٹر حسین ماجد کے سر ہے۔ ڈاکٹر حسین ماجد بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ اگرچہ ان کی دلچسپی کے کئی میدان ہیں، لیکن شاعری سے متعلق تذکرۂ شعرائے کشمیری پنڈتان میں ان کی ژرف نگاہی کے ثبوت وافر تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی شاعری سے وابستگی کے سبب ہی مذکور تذکرہ اہم بن پایا ہے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے اپنے معیار ومزاج کے مطابق اس کو مرحلۂ طباعت سے نوازا کر فروغ اردو کے لیے اپنی کوششوں اور علمی وادبی سرمایہ کو محفوظ کرنے کے اپنے مضبوط موقف کے باوصف خوب صورت اور جاذب نظر انداز میں پیش کیا ہے۔

جلد اوّل کے مشمولات میں کم وبیش 100 شعرا کے مختصر حالات اور ان کی شاعری کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ فہرست کو بہ لحاظ تخلص مرتب کیا گیا ہے، جس میں پنڈت ٹیکا رام جیو آخون، پنڈت جوالا پرساد پار موآذر، پنڈت نند کشور آزاد، پنڈت پران ناتھ کرنیل آزردہ، پنڈت پریم نرائن بھان اختر، پنڈت بشمبر ناتھ انور، پنڈت اومکار نرائن بخشی، پنڈت گنگا پرساد بسمل، پنڈت شیام پرساد گنجور بے تاب، پنڈت سوم ناتھ مبتی لکھنوی بے خود، پنڈت مہتاب رائے ہا کچرتا بائی، پنڈت بخت مل تمکین، پنڈت چاند نرائن چاند، پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت امرناتھ زتشی خمار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تذکرہ میں شامل شعرا کے اشعار کے انتخاب میں سختی نہیں برتی گئی ہے، البتہ مبتذل اور غیر اخلاقی اشعار کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ شاعر کے کلام کا اکثر نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ شعرا کے غالب رجحانات اور خیالات کا تعین کرنے میں آسانی ہو۔ اس تذکرے میں پنڈت شاعرات کو بھی جگہ دی گئی ہے، جلد اول سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

قیامت تک رہے جاری یہ صیغہ آبکاری کا
اسی کے دم سے ہے چمکی ہوئی تقدیر میخانہ

پنڈت بشن نرائن درابر

لالہ و گل و یاسمن، ہیں تو کھلے بہم، مگر
سب کی ہے بوجدا جدا سب کا ہے رنگ الگ الگ

پنڈت دیا شنکر کوچک انور

مہرش ہمیں نہ در دل ماجا گرفتہ است
در ہر ولے چو در دل ماجا گرفتہ است

رائے خواجہ پنڈت چندر بھان برہمن

جوش پر بحر لطافت ہے شباب آنے کو ہے
موجزن ہے حسن کا دریا حباب آنے کو ہے

پنڈت درگا پرساد مشران لکھنوی بے خود

پہلی جلد ردیف 'الف' سے شروع ہوکر ردیف 'خ' پر ختم ہوتی ہے جبکہ دوسری جلد ردیف 'د' سے شروع ہوکر ردیف 'ظ' پر تمام ہوئی ہے۔ دوسری جلد کے قابل ذکر شعرا میں پنڈت رام ناتھ یمنی لکھنوی درویش، پنڈت دھرم نرائن میرٹھی ذاکر، پنڈت رام چندر رازداں، پنڈت گنگا پرساد دہلوی رسوا، پنڈت دیاناتھ رنگین، پنڈت امرناتھ ساحر، پنڈت جواہر ناتھ غمخوار کول ساقی، پنڈت امرناتھ بخشی لکھنوی، شعلہ وغیرہ شامل ہیں۔ ترتیب پہلی جلد ہی کے مطابق کی گئی ہے۔ مرتب ڈاکٹر تحسین ماجد کے مطابق 'بہار گلشن کشمیر' جو دو جلدوں پر مشتمل تھی اس کو نئی ترتیب میں چار جلدوں میں پیش کیا گیا ہے۔ فہرست سازی نئے سرے سے کی گئی ہے تاکہ بات مزید واضح ہوسکے۔

امید ہے یہ کتاب اردو دنیا کے لیے ایک اہم ذخیرہ ثابت ہوگی اور قومی کونسل کی دوسری کتابوں کی طرح 'بہار گلشن کشمیر' کو پذیرائی حاصل ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail :ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

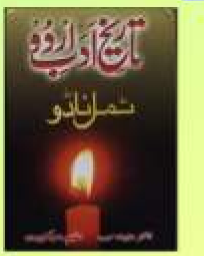

تاریخ ادب اردو تمل ناڈو

مصنف: علیم صبا نویدی، مرتب: ڈاکٹر جاوید حبیب
صفحات: 1504، قیمت: 1100، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: مرتب
مبصر: حلیم صابر،

اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ چنئی کی لکچرر ڈاکٹر جاویدہ حبیب نے اپنے والد محترم علیم صبا نویدی کی برسوں کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں پر مشتمل مضامین جو اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے انھیں بڑی جانفشانی سے نقل وجمع کر کے کتابی شکل دی جو تمل ناڈو کی ادبی تاریخ پر مبنی ایک ایسا کارنامہ انھوں نے انجام دیا ہے جو لائق تحسین ہے اور اس کتاب کی اشاعت اور پیش کش کا سہرا تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز چنئی کے سر جاتا ہے لہٰذا اس ادارے کے اراکین بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کی ایک تاریخی شخصیت علیم صبا نویدی کے ایسے تاریخی کارناموں کو کتابی شکل میں محفوظ کر دیا ہے جو ریاست تمل ناڈو کے مشاہیر ادب کی علمی و ادبی کارگزاریوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف عہد حاضر کے طلبا و طالبات کی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس سے استفادہ کریں گی۔

پیش نظر اس کتاب میں علیم صبا نوی نے ''تمل ناڈو کے اردو شعر و ادب کا تاریخی پس منظر'' سات آٹھ صفحات پر سپرد قلم کیا ہے اس کا مطالعہ اس کتاب کے ابواب پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے جس سے گزشتہ صدیوں کے درمیان تمل ناڈو جو اس عہد میں ریاست مدراس کہلاتی تھی اس کی سیاسی تاریخ کے ساتھ شعر و ادب کے ارتقائی سفر کی روداد بیان کی ہے۔

اردو زبان و ادب کے ابتدائی دور کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو ادب نظم ونثر کی صورت میں نہ صرف شاہی درباروں تک محدود رہی بلکہ صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں بھی کل ہند پیمانے پر اردو زبان و ادب پر اچھا خاصا کام ہوا ہے۔ علیم صبا نویدی نے ''تمل ناڈو میں اردو نثر'' کے عنوان سے وہاں کی تین سو سالہ تاریخ کا احاطہ اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

علیم صبا نویدی نے تمل ناڈو کے مدراس کی اردو خدمات کا مختصر ذکر کرتے ہوئے وہاں کے مدرسین کی تعلیمی خدمات اور درس و تدریس کے حوالے سے معلومات افزا تحریریں سپرد قلم کی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

'' انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مدراس کے اکثر مقامات میں بہت سارے دینی مدرسے مثلاً مدرسہ باقیات الصالحات، مدرسہ لطیفیہ، مدرسہ سعدیہ، مدرسہ محمدی، مدرسہ معدن العلوم، مدرسہ جمالیہ، مدرسہ منبع الانوار اور جامعہ دارالسلام قائم ہوئے۔ ان میں اکثر مدراس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ ان مدراس کے زیر سایہ اردو زبان و ادب نے آفاقی اور نورانی سرحدیں طے کیں۔ ان مدراس کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لیے مدراس کے بہت سارے ہائی اسکول، پرائمری اسکول اور کالج نے اہم رول ادا کیے ہیں۔''

اس ضمن میں انھوں نے 136 اسکولوں اور کالجوں کا ذکر کیا ہے اور وہ اسکول و کالج جن علاقوں میں قائم ہیں ان کا نام بھی پیش کیا ہے۔

صحافت کا تعلق بھی نثر نگاری سے ہے۔ اس سلسلے میں بھی علیم صبا نویدی نے ایک سو دس ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہنامہ اخبارات و رسائل کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے جس میں ان صحافیوں کی خدمات کا تذکرہ بھی مختصر طور پر شامل ہے جو مذکورہ اخبارات و رسائل سے وابستہ تھے۔

اردو شاعری کے تعلق سے عہد قدیم سے لے کر عہد حاضر تک کے تقریباً سو شعرا کا ذکر ان کی حیات و خدمات اور نمونہ کلام کے ساتھ کیا ہے جو تین سو سالہ غزل گوئی کی تاریخ پر محیط ہے۔ تمل ناڈو کے شعرا نے بھی روایتی شاعری کے علاوہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا بھی اثر قبول کیا جن میں زیادہ شعرا کا تعلق بیسویں صدی کے نصف ثانی سے لے کر اکیسویں صدی کے اوائل تک ہے۔

باب دوم میں علیم صبا نویدی نے اردو کے تعلق سے متفرق عنوانات کے تحت تمل ناڈو میں شعر و ادب کا شناخت نامہ، اردو غزل کی ابتدا، نئی غزل کا رجحان، نئی نظم کا سفر، جدید شاعری اور نئے تجربے، تنقیدی شعور کا سلسلہ، اردو خطاطی، مثنوی نگاری، ترقی پسند تحریک کے اثرات، ادب اطفال وغیرہ نیز تمل زبان پر اردو کے اور اردو پر تمل زبان کے اثرات کے پیش نظر 134 مشاہیر ادب کے حالات و خدمات کا جائزہ لیا ہے جن میں کچھ اہل قلم اپنی گراں قدر ادب کی خدمات انجام دے کر گزر گئے اور جو باحیات ہیں ان کی ادبی سرگرمیاں جاری ہیں۔ باب سوم میں ڈاکٹر جاویدہ حبیب نے 'تمل ناڈو میں اردو غزل کی نئی پرانی سمتیں' کے عنوان سے پچاس سے زائد شعراء و ادباء کی ادبی کاوشوں کو معلوماتی تحریروں کا حامل بنا کر پیش کیا ہے جب کہ بعنوان 'تمل ناڈو میں اردو رباعی' باب چہارم ڈاکٹر سید سجاد حسین، ڈاکٹر جاویدہ حبیب، علیم صبا نویدی اور فاروق جائسی کے مضامین پر مشتمل ہے جس میں مولانا باقر آگاہ ویلوری تا فیض قادری تقریباً 80 رباعی گو شعرا کا ذکر اور ان کی رباعیاں بطور نمونہ شامل کی گئی ہیں۔

باب پنجم ''خواتین تمل ناڈو کی علمی و ادبی خدمات'' علیم صبا نویدی مرتبہ ڈاکٹر جاویدہ حبیب بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں تقریباً پچاس خواتین قلم کاروں کی خدمات تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہیں اور صنف نازک جسے ہمیشہ کمتر سمجھا گیا ان کی خوبیوں کو ان کی کاوشوں کے توسط سے اجاگر کیا گیا ہے۔

مذکورہ کتاب کا آخری باب ششم تمل ناڈو کے شعرا کی نعتیہ شاعری کا مظہر ہے جس میں علیم صبا نویدی نے تقریباً ڈیڑھ سو نعت گو شعرا کو ان کے نعتیہ اشعار کے ساتھ پیش کیا ہے اور نعت گوئی کے حوالے سے ایمان افروز باتیں گوش گزار کی ہیں۔

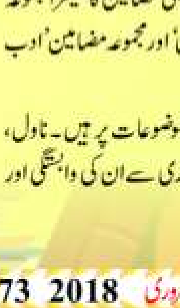

ادب و احتساب

مصنف: ڈاکٹر معصوم شرقی
صفحات: 208، قیمت: 250 روپے
ناشر: الکتاب، کولکاتا
مبصر: پروفیسر فاروق احمد صدیقی، امرود بگان،
جیل چوک، چھنداوارہ، مظفرپور، بہار

'ادب و احتساب' ڈاکٹر معصوم شرقی کے علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کا تحقیقی مقالہ 'نظیر ثانی اشک امرتسری' اور مجموعہ مضامین 'ادب جہاں' کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

پیش نظر مجموعے میں ان کے بیس مضامین ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں۔ ناول، افسانہ، شاعری، تنقید، مکتوب نگاری، تبصرہ نگاری اور سفرنامہ نگاری سے ان کی وابستگی اور

والہانہ لگاؤ قابل داد تو ہے ہی، میرے لیے قابل رشک بھی۔

'ادب و احتساب' کا پہلا مضمون شموئل احمد کے ناول 'ندی' کے تجزیاتی مطالعے پر مبنی ہے۔

اچار یہ شوکت خلیل کے ناول 'اگر تم لوٹ آتے' پر بھی معصوم شرقی نے اپنے مزاج و مذاق کے مطابق تبصرہ کیا ہے۔

راہی معصوم رضا کے ناول 'آدھا گاؤں' پر فاضل مصنف کا تبصرہ بڑا معقول اور بیباکانہ ہے۔ واقعی یہ بڑی افسوس ناک بات ہے کہ 'آدھا گاؤں' پہلے ہندی میں شائع ہوا۔ بعد میں اردو میں!! اس کے پیش لفظ میں کنور پال سنگھ نے جو عذر لنگ پیش کیا ہے، معصوم شرقی اس پر یوں نقد کرتے ہیں:

''بہر حال پیش لفظ میں یہ سب فضول کی باتیں ہیں، کوشش کے باوجود اردو میں شائع نہیں ہو سکا۔ ایسا بھی نہیں کہ راہی معصوم رضا ایسے گمنام تھے کہ کوئی پبلشر ان کا ناول شائع نہ کرتا؟ ایسا بھی نہیں کہ وہ اس کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے... بہر حال یہ ایک شاہکار ناول ہے جو لسانی تعصبات کی نذر ہو گیا۔'' (ص 33)

بجا فرمایا ہے ڈاکٹر شرقی نے۔ تقریباً تمام اردو والے ان کے ہم نوا، و ہم آواز ہیں۔ یہ ایک سوانحی ناول ہے جس میں آپ بیتی کے بوقلموں جلوے تو ہیں ہی، جگ بیتی کی نیرنگیاں بھی اپنی بہاریں دکھلا رہی ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے اس کے ادبی اور فنی محاسن کا بھی بخوبی احاطہ کیا ہے۔ یہ ناول اپنے فکر و مواد اور پیشکش دونوں لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔

'ادب و احتساب' کے تمام مشتملات پر جو بیس کی تعداد میں ہیں، انتہائی اختصار کے ساتھ بھی تبصرہ کیا جائے تو ایک طویل مقالہ تیار ہو جائے گا۔ اس لیے میں اپنی گفتگو انہی تین ناولوں تک محدود رکھتا ہوں۔ اس ایماندارانہ اعتراف کے ساتھ کہ ڈاکٹر معصوم شرقی کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اور عمیق بھی اور وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر بے پایاں قدرت بھی رکھتے ہیں۔ ان کی زبان میں بڑی سلاست اور شگفتگی ہے۔ ہر چند کہ تحقیق و تنقید کی زبان بہت خشک و بے رس ہوتی ہے۔ اس میں جمالیاتی حسن کی گنجائش نہیں مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ احتشام حسین اور کلیم الدین احمد کے مقابلے میں آل احمد سرور کی 'تنقیدی نگارشات' کو پڑھنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔

'ادب و احتساب' کے مصنف کو ایک بار پھر میں صمیم قلب سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ ان کی کتابوں کو پڑھنے میں بھی بڑا جی لگتا ہے۔

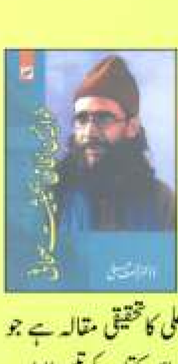

خواجہ حسن نظامی بحیثیت صحافی

مصنف: ڈاکٹر آصف علی

صفحات: 196، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: صبا عنبرین، 5078، پھاٹک باز، حوض قاضی، دہلی 6

یہ کتاب خواجہ حسن نظامی بحیثیت صحافی ڈاکٹر آصف علی کا تحقیقی مقالہ ہے جو انھوں نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں 1993 میں لکھا تھا۔ اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اردو صحافت کی ابتدا سے لے کر خواجہ حسن نظامی کے عہد تک کے سفر کو بیان کرتے ہوئے چھاپہ خانہ اور صحافت کے رشتے کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں نظامی صاحب کی ادبی خدمات کو ان کی شخصیت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے مذہبی اعتقادات اور سماجی زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ان کی صحافت کے سفر کو بیان کیا گیا ہے

خواجہ حسن نظامی کی صحافتی کی زندگی کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ جو نصف صدی کے طویل عرصے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں خواجہ صاحب کے صحافتی سفر کو بیان کرنے کے ساتھ صحافتی تاریخ کے اہم پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ خصوصی طور پر دہلی میں اردو صحافت کے فروغ کو بیان کرتے ہوئے اس عہد کے اردو اخبارات دہلی اردو اخبار (1836-1857)، سیدالاخبار (1846-1849)، اخبار مظہر الحق، (1843-1850) قران السعدین (1845-1853) فوائدالناظرین (1845-1852)، کریم الاخبار (1845-1848) صادق الاخبار (1844)، خیر خواہ ہند یا محب ہند (1847-1851) خلاصہ الطراف (1847)، عجائب الاخبار (1848)، اخبار فوائدالشائقین (1848-1850)، مفید ہند، تحفۃ الحدائق (1848)، ضیاء الاخبار (1849)، دقیق الاخبار (1851)، وحیدالاخبار (1852)، نور مغربی (1853)، اسدالاخبار (1857)، تاج الاخبار (1857) کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح ہر عہد کے معاشرتی، تہذیبی، علمی، اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات افکار وانکشافات ہی ادب کی پیداوار اور مختلف اصناف کی ایجاد کا باعث ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ادیب یا تخلیق کار اپنے عہد سے جدا نہیں ہو سکتا۔ ماضی کی روشنی میں حال اور حال کے پرتو میں مستقبل تلاش کرتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اصلاح پسندی پر مبنی ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بیسویں صدی ہندوستان کے لیے اپنے دامن میں زبردست انقلاب چھپا کر لائی۔ کانگریس کی ملک میں سیاسی بیداری کی مہم، مسلم لیگ کا قیام، تقسیم بنگال کی تجویز، ایشیا اور افریقہ پر مغربی ممالک کی تاراجیت، جلیاں والا باغ کی خوں ریزی، کانپور کی مسجد کا واقعہ، پہلی عالمی جنگ اور ترکی کے حالات ایسے انقلابات تھے جنھوں نے نہ صرف سوراج اور تحریک آزادی کی راہیں استوار کیں بلکہ ان انقلابات نے اردو صحافت کو بھی شدت سے متاثر کیا۔ ان انقلابات نے اردو صحافت پر معرکہ آزادی کے عائد کردہ تاریکی کے دور کو مکمل ختم کر کے اردو اخبارات میں نئی روح پھونک دی۔ ملک کے گوشے گوشے سے نئے نئے اردو اخبارات ورسائل جاری ہوئے اور ان کی تعداد اشاعت میں ہوئی ترقی کو بیان کیا ہے۔ جب خواجہ حسن نظامی نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تب دہلی سے مختلف النوع موضوعات پر متعدد اخبارات ورسائل جاری تھے بعض سے خواجہ نظامی کا براہ راست تعلق تھا۔ آپ نے ملک کے متعدد اخبارات اور رسائل کو قلمی تعاون دینے کے ساتھ نظام المشائخ، منادی، توحید، پیر بھائی، مرشد گرو سیوک، دین و دنیا، تبلیغ نسواں، عورتوں کا اخبار، رعیت، ینگ مسلم، ڈکٹیٹر، نظام گزٹ، درویش، استانی، روزنامچہ، آستانہ، پیشوا، حریت اور مولوی متعدد روزنامے، دوقتہ، سہ روزہ ہفت روزہ، پندرہ روزہ اخبارات اور ماہنامے جاری کیے اور جاری کرائے۔

اپنے عہد کے حالات، واقعات، ماحول اور سماج کی حقیقی تصویر پیش کرنا صحافت کی اصل ذمے داری ہے۔ خواجہ صاحب نے صحافت میں حق گوئی کو اولیت دی ہے۔ آزاد، نذیر احمد اور مولانا آزاد نے جو پیراہن دیا تھا اسے نیا اور خوب فہم روپ خواجہ حسن نظامی نے دیا ہے۔ خواجہ صاحب کی حق گو اور حق پسند پالیسیوں کی وجہ سے ان کے صحافتی کارناموں کو تعلیم وترقی اور معاشی نظام کے تنزل کے اس دور میں بھی وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو صحافت کی بڑھتی ہوئی مانگ، تعلیم اور نظام معیشت کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی اردو کے کم ہی پرچوں کو ملتی ہے۔ اس لیے ان کو شوکت علی فہمی کے بقول ہندوستانی اخبارات کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔

علم ترجمہ: نظری و عملی مباحث

مصنف: ڈاکٹر فہیم الدین احمد

صفحات: 215، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: اردو ٹرانسلیشن اکیڈمی حیدرآباد دکن (تلنگانہ)

مبصر: غضنفر اقبال، 'سائبان' زبیر کالونی، ہاگرگا کراس رنگ روڈ گلبرگہ 585104 (کرناٹک)

'علم ترجمہ: نظری و عملی مباحث' کے مصنف ڈاکٹر فہیم الدین احمد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں شعبۂ ترجمہ میں بہ حیثیت استاد فرائض انجام دے رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب سے قبل ڈاکٹر موصوف کی مختلف موضوعات پر کتابیں اشاعت پذیر ہوچکی ہیں۔ کتاب علم ترجمہ میں 5 مضامین ترجمہ کیے گئے ہیں اور بقیہ 6 مضامین مختلف موضوعات پر جن کا تعلق ترجمہ نگاری سے ہے۔ شامل کتاب ہیں۔

ہندوستان کی مختلف جامعات میں شعبہ ترجمہ قائم ہے لیکن علم ترجمہ ہندوستان کی دانش گاہوں میں حال میں متعارف کروایا گیا ہے۔ اب باضابطہ علم ترجمہ کی تدریس اور تحقیق ہونے لگی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں باقاعدہ ایک علاحدہ شعبہ علم ترجمہ قائم کیا گیا ہے۔ جہاں ایم اے کے مطالعات ترجمہ کے پوسٹ گریجویٹ پروگرام، ایم فل و پی ایچ ڈی کے تحقیقی پروگراموں کے علاوہ گریجویشن کی سطح پر بھی ایک مضمون کے طور پر علم ترجمہ کی تدریس کا نظم ہے۔

سوال یہ ہے کہ علم ترجمہ کیا ہے؟ علم ترجمہ فی زمانہ مطالعات ترجمہ اور ترجمیات کے نام سے معنون ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر فہیم الدین احمد نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

''علم ترجمہ (Translation Studies) دورِ حاضر کا ایک جدید اور تیزی سے ابھرتا ہوا شعبہ علم ہے جس میں ترجمہ کے نظریات اور اس کے عملی اطلاق سے بحث کی جاتی ہے۔''

زیر تبصرہ کتاب میں علم ترجمہ: چند بنیادی مباحث، ترجمہ اور ثقافت، ترجمہ اور تاریخ، ترجمے کی تنقید اور ترجمے کی ادارت، ایسے مضامین جو انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ مصنف نے اس قدر رشتہ، اور بامحاورہ ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مذکورہ مضامین کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فہیم الدین احمد، مشاق ترجمہ کار ہیں اور ان کے قلم میں یہ خوبی اس لیے بھی پیدا ہوئی ہے کہ وہ مسلسل اس میدان میں کچھ نہ کچھ کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے ہیں۔

علم ترجمہ میں شامل ڈاکٹر فہیم الدین احمد کے دیگر مضامین غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ خاص طور سے مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب 'نیرنگِ خیال ایک جائزہ: ترجمے کے حوالے سے' پر لکھا گیا مضمون اہل اردو کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ مشہور ادیب مرصع نگار محمد حسین آزاد کے نیرنگِ خیال کے مضامین انگریزی ادب کے مضامین کا آزاد ترجمہ ہیں۔ ڈاکٹر فہیم الدین نے دلائل، شواہد اور حقائق کی روشنی میں 'نیرنگِ خیال' پر دل آویز انداز بیان اختیار کرتے ہوئے سوالات کو جنم دیا ہے۔ فاضل مصنف ڈاکٹر فہیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''محمد حسین آزاد کے ان مضامین کو ترجمہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ آزاد اور بامحاورہ ادبی ترجمہ ہے۔ یہ واضح رہے کہ محمد حسین آزاد کسی علمی، قانونی یا مذہبی متن کا نہیں بلکہ ایک ادبی متن کا ترجمہ کر رہے تھے جس میں ترجمہ کو لفظوں کی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کی کوشش کرنی پڑتی ہے کہ ترجمہ شدہ متن بھی ادبی شہ پارہ بن جائے اور محمد حسین آزاد اس میں کامیاب ہیں۔''

کتاب کا اگلا مضمون 'مولانا آزاد — الہلال اور اردو اصطلاح سازی' کے زیر عنوان ہے۔ اس میں ڈاکٹر فہیم الدین احمد نے مولانا آزاد کے متعلق لکھا ہے کہ مولانا کو زبان اردو کو سائنسی اور علمی زبان بنانے کا شدید جذبہ موجزن تھا اور یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ مولانا آزاد اردو میں اصطلاحات کے مسائل پر مفصل کتاب لکھنا چاہتے تھے مگر یہ آرزو ان کی پوری نہیں ہوسکی۔

کتاب کے اگلے مضمون 'گلستانِ سعدی کے اردو تراجم اور گلستان امجد' میں مصنف نے لکھا ہے کہ گلستان سعدی کا ترجمہ مشہور رباعی گو شاعر امجد حیدرآبادی نے 1935 میں کیا تھا۔ مصنف اس بات کو مانتے ہیں کہ گلستان سعدی کا یہ اردو ترجمہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے دیگر تراجم کے مقابلے میں کافی بہتر ہے اور حکائی ادب میں اضافہ ہے۔

ڈاکٹر فہیم الدین نے 'اردو خاتون مترجمین ایک جائزہ' کے عنوان سے عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں فاطمہ بیگم، سیدہ نسیم ہمدانی، ممتاز شیریں، رضیہ سجاد ظہیر، الطاف فاطمہ، قرۃ العین حیدر، کے علاوہ مذہبی مترجمین کے ذیل میں محمودہ بیگم اور ثریا شحنہ کی خدمات کا جائزہ بطریق احسن لیا ہے۔

علم ترجمہ کا آخری مضمون 'اردو میں مقبول عام ادب کے ترجمے کی روایت' کے موضوع پر ہے۔ یہ مضمون بھی انتہائی معلوماتی اور معلومات افزا ہے۔

علم ترجمہ میں مصنف ڈاکٹر فہیم الدین احمد نے تلاش و تخریج کا ایک جہان شعبہ ترجمہ کے حوالے سے قائم کیا ہے۔ نئے حقائق کی تلاش کی ہے اور حقائق کی تشریح و تعبیر میں معروضی انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے جن موضوعات پر قلم فرسائی کی ہے اس کو بحث انگیز بنا دیا ہے۔ علم ترجمہ کے مضامین میں وسعتِ معنی ہے اور یہ وسعت معنی ڈاکٹر فہیم الدین کی اپنے مضمون سے مشق و ممارست کی اعلیٰ مثال ہے۔ علم ترجمہ پر اولین کتاب کا وادی ترجمہ میں خیر مقدم کیا جائے گا ایسی امید کی جاسکتی ہے۔

افکارجدید

مصنف: ڈاکٹر محمد ناظم علی

صفحات: 112، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2016

مبصر: بگلشن، 529 ٹیامحل، جامع مسجد، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'افکار جدید' ڈاکٹر محمد ناظم علی صاحب کی آٹھویں تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مختلف النوع مضامین شامل ہیں جو ادبی اور صحافتی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جس میں مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں ان کے شائع شدہ مضامین کو جدید اضافہ کر کے 'افکار جدید' کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

'افکار جدید' کے تمام مضامین میں ڈاکٹر محمد ناظم علی صاحب نے نہایت بے باکی اور غیر جانبداری کے ساتھ ساتھ نہ صرف اردو مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ تجاویز اور اپنے شدید احساسات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اس میں بعض مضامین تاریخی، ادبی اور دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب میں 'اکیسویں صدی میں اردو کی بقاء اور اس کا مستقبل'، 'مادری زبان میں اردو کا فروغ اور ترقی' اور 'اردو کا فروغ اور ہماری ذمہ داریاں' وغیرہ جیسے اردو سے متعلق مضامین میں انھوں نے قوموں کے عروج و زوال میں زبان کے کلیدی رول کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان میں اردو کے موقف کا بھرپور جائزہ لیا ہے کہ تعلیمی اداروں میں اردو تعلیم سے بے راہ روی اور اردو والوں کی بے حسی نے اردو کے تابناک مستقبل کے لیے سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ اردو زبان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شمالی ہند میں اردو زبان بتدریج ختم ہورہی ہے اور جنوبی ریاستوں کے

کچھ ہی علاقوں میں اردو آکسیجن پر چل رہی ہے۔'اس لیے ہم سب کو اردو کے فروغ کے لیے بنیادی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔اس لیے ان مضامین میں مادری زبان کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا گیا ہے۔کیونکہ مادری زبان میں تعلیم سے شخصیت کی نشوونما اور فکرونظر میں وسعت اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ڈاکٹر ناظم علی کا کہنا ہے کہ بچوں کی عمدہ تربیت کے لیے ہمیں مادری زبان اردو کو اپنانا چاہیے کیونکہ مادری زبان قلبی واردات اور اظہار کا موثر وسیلہ ہوتی ہے۔لہٰذا اردو کو ہی بطور مادری زبان تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے تاکہ قومی یکجہتی کی ضمانت حاصل ہو سکے۔اردو کے فروغ کے لیے اردو والوں کو ان کی بنیادی واخلاقی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہیں۔اور اردو کی ناگفتہ حالت کا ذمہ دار اردو والوں کو ہی ٹھہراتے ہیں۔

ڈاکٹر ناظم علی صاحب نے اردو زبان کے ساتھ ساتھ اردو صحافت پر بھی مضامین لکھے ہیں جن میں 'اردو اخبارات کی اہمیت وافادیت'، 'اردو صحافت اور عصری ٹیکنالوجی کا استعمال'، 'اردو صحافت کی بقاء اور مسائل'۔ان مضامین میں وہ کہتے ہیں کہ اگر اردو صحافت نہ ہوتو ادب کو اتنا فروغ ملنا محال ہو جاتا اس لیے اردو صحافت کی بقاء زبان وادب کے فروغ کے لیے لازمی ہے۔عصرِ حاضر میں اخبارات کی اہمیت اور افادیت کا ذکر کرتے ہوئے ناظم صاحب کہتے ہیں کہ اخبارات کی اہمیت صرف روز وشب کی اطلاعات ہی فراہم نہیں کرتے بلکہ ذہنی وشعوری تربیت میں معاون بھی ہے۔اسی لیے انھوں نے اردو اخبارات کو قارئین کے لیے بحرالعلوم سے موسوم کیا ہے جس میں سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور کاروبار وغیرہ سے متعلق تمام معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔مضمون 'اردو صحافت اور عصری ٹیکنالوجی کا استعمال' میں اردو اخبار کا 'جام جہاں نما' سے لے کر آج تک کے طویل سفر اور جدید ٹیکنالوجی کا نہایت ہی موثر اور جامع احاطہ کیا ہے۔'ادبی صحافت کے فروغ میں حیدرآبادی خواتین کا حصہ' اور 'جنوبی ہند کے پبلشرز کی اردو خدمات' منفرد اور معلوماتی موضوعات ہیں۔ان کے کچھ مضامین تعلیم سے متعلق ہیں جن میں 'ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں اردو زبان کی درس وتدریس'، 'مسلمانوں میں عصری تعلیم' اور 'مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اسباب اور سدِّ باب' جیسے مضامین اہمیت کے حامل ہیں اور اس کے علاوہ غالب، الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، ڈاکٹر محی الدین قادری زور پر تحریر کردہ مضامین بھی اہم ہیں۔

مختصراً یہ کہ ناظم علی صاحب کا انداز بیان سلیس وشستہ ہے۔ان مضامین سے ان کی تخلیقی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔انھوں نے روایت سے ہٹ کر نئے موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔امید ہے یہ مجموعۂ مضامین اردو ادب اور اردو زبان کے فروغ میں معاون ثابت ہوگا۔

تاریخ

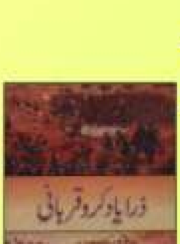

ذرا یاد کرو قربانی

مصنف: پرویز اشرفی

صفحات: 200، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: پرویز عالم بلالہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی

مبصر: زرقا رحمن، پرنسپل: علامہ اقبال ماڈرن پبلک اسکول، سنبھل یوپی

زیرِ نظر کتاب ایسی تاریخی شخصیات وافراد کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے، جنہوں نے ہندوستان کی آزادی میں حصہ لیا۔اور اس کے لیے قربانی سے دریغ نہ کیا۔اس کتاب میں جہاں ایک طرف نواب سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر، علامہ فضل حق خیرآبادی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، اشفاق اللہ خاں، محمد علی جوہر جیسے مشہور ومعروف مجاہدینِ آزادی کا ذکر کیا گیا ہے۔وہیں مولانا سید نصرت حسین، شاہ وجیہ الدین منہاجی، عظیم اللہ خاں، میر محمد قاسم، مولانا فیض احمد بدایونی، شیر علی خاں آفریدی، حکیم شفیق الرحمٰن رامپوری، جیسے غیر معروف حضرات کا بھی ذکر کیا ہے۔خواتین کے زمرے میں بیگم حضرت محل، حاجی بیگم عزیزن، فرحت جہاں، آبادی بانو بیگم اور چھلکاری بائی کا ذکر کیا گیا ہے۔جنگ آزادی میں علمائے اسلام کی قربانیوں کا ذکر کرنے کے لیے باقاعدہ ایک مضمون 'علمائے ہند: جنگِ آزادی کے عظیم قائد' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے، جس میں مولانا جعفر تھانیسری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ولایت علی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ ضامن شہید، مولانا کفایت علی کافی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا منصور انصاری، مولانا عبدالقادر لدھیانوی، مولوی شفیع داؤدی، سید احمد شہید، مولوی عنایت علی غازی، مولوی عبداللہ عظیم آبادی، مولانا برکت اللہ بھوپالی کا ذکر کیا گیا ہے۔

مشاہیر علما اور قائدین کے ساتھ ہی کتاب کے ایک مضمون ''یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا؟؟'' کے تحت ایسے غیر معروف افراد کا ذکر بھی کیا گیا ہے جنھیں آج ہندوستان کی تحریک آزادی کے حوالے سے کوئی بھی نہیں جانتا۔کتاب کے اس حصے میں کل 47 افراد کے نام اور مختصر واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔جس سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ ہماری موجودہ اور آنے والی نسلیں ان کے ناموں اور کارناموں سے واقف ہو جائیں، جن کی قربانیوں کی وجہ سے ہم پر صبح آزادی طلوع ہوئی اور ہم کو ہندوستان کی آزاد فضاؤں میں زندگی گزارنے کا حسین موقع میسر آیا۔دراصل پرویز صاحب کا اس کتاب کو لکھنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہم لوگ ہندوستان کی آزادی میں قربانیاں پیش کرنے والے اصل مجاہدین کے کارناموں سے واقف ہوں۔ان کا یہی درد اس کتاب میں کچھ اس طرح نظر آتا ہے

''کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج جنگِ آزادی کی جو تاریخ لکھی جا رہی ہے اور اسکولوں وکالجوں میں جو تاریخ نصاب میں شامل ہے، ان میں ہندوستانی علماء کی قربانیوں کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔'' ص 185

اسی سلسلے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''افسوس صد افسوس کہ جن قائدین نے اس ملک کی بنیاد میں جمہوریت کا پتھر رکھا، جس جمہوریت کے لیے کوشاں رہے وہ جب قائم ہوئی تو ان اسلاف کو بھلا دیا گیا۔'' ص 130

اس کتاب میں ایک ایسی تاریخی روایت بھی بیان کی گئی ہے، جس سے آج کی نئی نسل شاید واقف ہی نہ ہو۔اور وہ اس طرح ہے:

''گاندھی جی کے سر کو سفید کھادی کی ٹوپی سے جس نے ڈھک دیا تھا وہ کام ایک دردمند ماں ہی کر سکتی ہے۔یہ کام بی اماں نے ہی کیا تھا۔آج بھی وہ ٹوپی ''گاندھی ٹوپی'' کے نام سے مشہور ہے۔'' ص 161

پرویز صاحب چونکہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں اس لیے ان کی تحریر ادبی چاشنی، اسلوب کی انفرادیت اور خوبصورت منظر نگاری سے پوری طرح مزین ہے۔آپ کی اسی خوبی کو مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے، جس میں شہید اشفاق اللہ خاں کے تختۂ دار پر لٹک جانے کا منظر کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''دعا کے بعد گلے میں قرآن لٹکائے ہوئے حاجیوں کی طرح وظیفہ پڑھتے ہوئے حوصلے سے تختۂ دار کی طرف چل پڑے، تختۂ دار پر پہنچ کر قرآن کی چند آیتیں پڑھیں۔پھر پھانسی کے پھندے کو چومتے ہوئے کہا۔میرے ہاتھ کبھی انسانی خون سے رنگین نہیں ہوئے۔جو الزام مجھ پر لگایا گیا وہ غلط ہے۔میرا انصاف اب خدا کے یہاں ہوگا۔'' ص 119

اگرچہ یہ کتاب اس طرح کے بے شمار واقعات اور حالات سے بھری ہوئی ہے مگر اس مختصر سے تعارف وتبصرے میں تو چند مثالیں ہی پیش کی جا سکتی ہیں۔ اب میں ڈاکٹر رضاء الرحمن عاکف سنبھلی کے قلم سے تحریر کیے گئے اس کتاب کے مقدمے سے ایک اقتباس جس میں کتاب کے تعارف کے ساتھ ہی مصنف کے اسلوب نگارش پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پیش کرتی ہوں۔

زیر نظر کتاب 'ذرا یاد کرو قربانی' عام فہم انداز اور آسان زبان میں لکھی ہوئی تاریخ کی ایسی دستاویز ہے جو اپنے مستند تاریخی واقعات اور صحیح روایات کا حسین وجمیل مرقع ہے۔ جس کے لفظ لفظ سے حقائق کی خوشبوئیں اور تاریخی لطافتیں ٹپک رہی ہیں۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ پرویز اشرفی صاحب کا اسلوب نگارش جوان کے افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے پوری طرح ادبی رنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ آپ کے اسلوب کا اعجاز ہی تو ہے کہ تاریخی کتاب ہونے کے باوجود ان کی زبان و بیان میں کسی طرح کا روکھا پن نہیں ہے۔'' ص 13

کتاب کی انھی خوبیوں کی بنا پر پورے اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر پوری طرح مکمل ومحیط ہے۔ اور ہر طرح کے نقص وعیوب سے پاک وصاف ہے۔ ظاہر طور پر بھی دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔ پروف ریڈنگ بھی ذمے داری کے ساتھ کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے املا کی غلطیاں بھی نہیں ہیں۔ الغرض کتاب کو خرید کر پڑھا جا سکتا ہے جو ''ایپلائڈ بکس'' اردو بک ریویو، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

فکشن

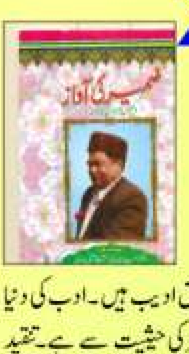

ضمیر کی آواز

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر مسرت اللہ خان مسرت اشرفی بدایونی

صفحات: 168، قیمت: 250 روپے

مبصر: شاداب عالم

جہلم ہاسٹل، روم نمبر-243، جے این یو، نئی دہلی

ڈاکٹر مسرت اللہ خان مسرت اشرفی بدایونی ایک کہنہ مشق ادیب ہیں۔ ادب کی دنیا میں ان کی شناخت افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، تنقید نگار اور شاعر کی حیثیت سے ہے۔ تنقید وتحقیق کے حوالے سے ان کی کتاب 'شکیل بدایونی: فن اور شخصیت' شکیل شناسی میں اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ 'ضمیر کی آواز' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں کل 24 افسانے شامل ہیں۔ افسانوں سے پہلے ڈاکٹر مسرت اللہ خان مسرت اشرفی بدایونی کے حوالے سے چھوٹے بڑے 19 ایسے مضامین بھی اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں جو ان کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ مضامین یا تو تاثراتی نوعیت کے ہیں یا ان کی افسانہ نگاری اور ان کی ادبی خدمات کے لیے انھیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ان میں بعض تنقیدی نوعیت کے بھی ہیں جو ان کی افسانہ نگاری کو بطور خاص حوالہ بناتے ہیں اور ان کے فن، تکنیک، موضوعات اور اسالیب کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر ان کی افسانہ نگاری کے خد وخال اور افسانوی بنت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر مسرت اللہ خان مسرت اشرفی بدایونی کے افسانے 1965 کے بعد سے ہی شائع ہو رہے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک آخری سانسیں لے رہی تھی۔

ڈاکٹر مسرت اللہ خان مسرت اشرفی نے کبھی بھی ادب کی مثبت قدروں سے مفاہمت نہیں کی بلکہ روایتی انداز کی کہانیوں کے ذریعے سماج میں پائی جانے والی چھوٹی چھوٹی برائیوں اور سماج میں پنپ رہے مکر وفریب کے پردوں کو چاک کیا۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف مسائل کو ہی پیش نہیں کرتے بلکہ اس کا حل بھی بتا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مسرت اللہ خان مسرت اشرفی اپنے افسانوں کے موضوعات ومسائل اردگرد بکھری ہوئی انسانی زندگی کی کرچیوں سے حاصل کرتے ہیں اور عصری زندگی کے نشیب و فراز، تنگ نظری، تعصب، ہوس کاری جیسی منفی قدروں کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ ان کی افسانوی تخلیقات باہمی خلوص ومحبت، ملنساری، انسانیت اور اتحاد واتفاق کا درس دیتی ہیں جس میں ان کا اصلاحی نقطۂ نظر اور سماج کے تئیں ان کے خلوص کی واضح جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

ضمیر کی آواز، دوستی، سچا رشتہ، نئی روشنی، روحانی رشتہ وغیرہ اس مجموعہ کی ایسی کہانیاں ہیں، جہاں سماج اپنی ناہمواریوں، نارسائیوں اور تہذیب نو کی چکا چوند سے نکل کر روشن مستقبل کی طرف گامزن ہے۔ 'ضمیر کی آواز' شرافت، انسانیت اور اخلاقیات کا خوبصورت اعلامیہ ہے، جہاں ایک نوجوان اپنی ذلت ورسوائی کے باوجود اپنے ضمیر کی آواز سنتا ہے اور جس کے ہاتھوں ذلیل کیا جاتا ہے اسی کی جان بچا کر معاشرے کو انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ افسانہ صحیح معنوں میں انسانی قدروں کا پاسدار ہے۔ اسی طرح 'دوستی' میں بھی اخلاقی وانسانی قدروں کی عمدہ ترجمانی ملتی ہے۔ اس افسانہ میں سچی اور اچھی دوستی کو، دوستی اور انسانیت کا وقیع مرقع بنا کر پیش کیا گیا ہے جس میں مرکزی کردار اپنے ہم جماعت کو بری صحبتوں میں مبتلا ہو کر غار میں گرتے دیکھتا ہے تو سخت ملول ہوتا ہے اور اس کو اپنے ہمراہ وطن لا کر اس کی زندگی کو روشن قدروں سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ یہ کہانی اپنے بین السطور میں ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ اگر ہم غلط ہیں یا بری صحبتوں میں پڑ کر اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں تو پچھتاوے کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آنے والا۔ 'سچا رشتہ' مسلم بھائی اور ہندو بہن کے رشتے کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے، جو ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت، محبت، خلوص، مروت ایسی بیش بہا قدریں ہیں جو مذہب کی بنیاد پر کھینچی گئی لکیروں سے بالاتر ہوتی ہیں اور ان کا خاتمہ ممکن نہیں۔ ''نئی روشنی'' میں جہیز جیسی سماجی لعنت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسا معاشرتی ناسور ہے، جو مقدس رشتوں اور انسانی ارمان وخواہشات کا خون کر دیتا ہے۔ جہیز کی اس لعنت نے سماج میں کئی طرح کی برائیوں کو جنم دیا ہے۔ یہ افسانہ دل میں جہیز جیسی لعنت کے تئیں نفرت پیدا کرتا ہے اور جہیز کے بغیر شادی کی تلقین کرتا ہے تاکہ سماج نئی روشنی سے منور ہو سکے۔

ڈاکٹر مسرت اللہ خان کی نثر نہایت صاف، سادہ اور رواں ہے۔ موضوعات و مسائل اور ان کا ٹریٹمنٹ بالکل فطری ہے۔ ان کے افسانوں میں کسی قسم کی پیچیدگی اور الجھاو نظر نہیں آتا۔ لفظوں کے استعمال پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ جس واقعہ یا جس منظر کی تصویر کھینچنا چاہتے ہیں اس کے مطابق ایسے الفاظ لاتے ہیں کہ وہ تصویر پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ یہ کہانیاں اصلاحی اور نصیحت آموز ہیں، ان سے گہرے تفکر، جذبات کی شدت، احساس کی ندرت، تجربے کی جدت اور تہہ در تہہ معنویت کی توقع فضول ہے۔ یہ بالکل سامنے کی چلتی پھرتی چیزیں ہیں جسے ہر کوئی دیکھتا اور سمجھتا ہے ڈاکٹر مسرت اشرفی نے ان کو لفظوں کا جامہ پہنا کر اس انداز میں پیش کر دیا ہے، جس سے ہر سطح کا قاری لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب ہر نسل کے لیے یکساں مفید ہے بطور خاص بچے اس سے بہترین نصیحتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مسرت اشرفی اپنی اس تخلیقی کاوش کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید کہ زیر مطالعہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

شاعری

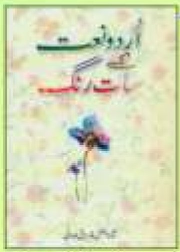

اردو نعت کے سات رنگ

مرتب: شاہ اجمل فاروق ندوی
صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: مکتبہ الفاروق، G5/A، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر محمد مقیم، اے 10، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

شاہ اجمل فاروق ندوی کی کتاب میں ہمارے زمانے کے سات نعت گو شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ یہ سات نعت گو شعرا فنی اور فکری لحاظ سے ایک دوسرے سے خاصے مختلف بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اردو نعت کے سات رنگوں کی تشکیل بھی کامیاب ہوئی ہے۔ اولاً تو یہی کام کچھ کم مشکل نہیں کہ سات ایسے نعت گو شعرا کا انتخاب کرنا جن کا شعری رنگ جدا ہو، پھر ان شعرا کے کلام سے ایسی نعتوں کا انتخاب کرنا جو ان کے مزاج کی بھر پور نمائندگی کریں۔ دوسرے یہ کہ شاہ اجمل فاروق ندوی نے نہ صرف کلام کا انتخاب کیا ہے بلکہ ہر شاعر کا کلام پیش کرنے سے پہلے اس کی شاعری پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے۔ مرتب کے اس طرز عمل نے کتاب کی افادیت کو مزید بڑھا دیا ہے لیکن یہاں ٹھہر کر چند باتوں پر غور کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پہلی تو یہ کہ اگر موضوعات مختلف ہوں تو عموماً بات کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کیوں کہ کہنے کے لیے الگ الگ باتیں ہوتی ہیں اور تکرار و اعادے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ یہ بات تو ہم جانتے ہی ہیں کہ نعت گوئی موضوعاتی شاعری ہے اور جن شعرا کا انتخاب پیش کیا گیا ہے وہ سبھی نعت گو ہیں لہٰذا یہ بات طے ہوگئی کہ موضوع ایک ہی ہے۔

کسی بھی کتاب کی ترتیب کا کام کچھ مقاصد یا اہداف کو پانے کا کام ہے۔ اگر ترتیب و تدوین کا کام بے مقصد اور بے ہدف ہو تو ایسی ترتیب و تدوین کو کارلاحاصل کہا جانا ہوگا۔ بامقصد ترتیب اپنی پیش کش میں ایک سلیقہ لیے ہوتی ہے اور یہ سلیقہ مرتب کے نقطۂ نظر اور فکر و خیال کا غماز ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترتیب میں برتا گیا سلیقہ مرتب کے تصنیفی ذوق اور ژرف نگاہی کی صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے۔ شاہ اجمل فاروق ندوی کے پیش نظر تین بنیادی مقاصد ہیں جو در حقیقت ایسے مباحث ہیں جو نعت گوئی کے حوالے سے ہنوز تشنہ ہیں۔ یہ کتاب ان تشنہ مباحث پر غور و فکر کے در وا کرتی ہے۔ مرتب کے تین بنیادی مقاصد حسب ذیل ہیں:

1۔ اس بات کی عملی کوشش کہ نعت کی تنقید میں فکر و فن کے کن گوشوں پر گفتگو ہونی چاہیے اور کن پر نہیں۔
2۔ فکری و فنی لحاظ سے نعت میں موجود امکانات کا اظہار۔
3۔ اردو نعت کے چند موجود رویوں کا تعین اور شعرا کی تعیین قدر۔

میں سمجھتا ہوں شاہ اجمل فاروق ندوی درج بالا تینوں مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ تین مقاصد تین مباحث ہیں جن پر شاہ اجمل فاروق ندوی نے بڑی شرح و بسط کے گفتگو کی ہے اور شعرا کے کلام کا انتخاب اس گفتگو کے لیے دلیل کا درجہ رکھتا ہے۔ نعت گوئی اور اس کے امکانات کے حوالے سے مرتب کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے بعد اس کتاب کا کام رک نہیں جاتا بلکہ اس باب میں دوسروں کے لیے غور کرنے کا امکان بھی کھلتا ہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نعت کے چند مختلف اشعار پیش کر دیے جائیں تا کہ درج بالا گفتگو کو سند مل جائے اور فکر پر فدا و فن پر نثار دونوں طرح کے قارئین کو کتاب کے حصول کا اشتیاق پیدا ہو۔

آنکھ اگر برسے تو رحمت بھی برستی ہے میاں
گھر بلا لیتی ہے یہ برسات اس برسات کو

سر سے نعلین پاک کا رشتہ — جان لینا ہی تاج داری ہے
دیکھو تو ایک، سوچو تو وہ پیکر حسیں — کونین کے حسینوں کا جم غفیر ہے

(افسر امروہوی)

عقل نے جب بھی بے وفائی کی — عشق نے بڑھ کے رہ نمائی کی
تم کو جانے تو حق کو پہچانے — بندہ و حق کے درمیاں تم ہو

(ساجد امروہوی)

سیرت سرکار پڑھ کر ہم سے تنگ زندگی
آئینے کے پاس سے جاتے ہیں کتراتے ہوئے

(رباب رشیدی)

ساجد امروہوی اور ان کے خاندان کی نعت گوئی پر گفتگو کرتے ہوئے شاہ اجمل فاروق ندوی نے غزل کے فارم پر اصرار اور نعت میں ہیئتی تجربوں سے 'پشتینی بے زاری' کی وجہ غزل کے کلاسیکی ماحول اور قدیم روایات کی پاس داری کے امروہوی مزاج کو قرار دیا ہے۔ یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن شاہ اجمل فاروق ندوی کی اس بات سے میرے ذہن میں کوئی اور ہی بات پیدا ہوتی ہے۔ دراصل محبت رسول کا سب سے بنیادی تقاضا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ حب رسولؐ پر ہر چیز کو مقدم رکھا جائے حتیٰ کہ اپنے نفس پر بھی۔ اس اصول اور اس تقاضے کو بھلا غزل کی روایت سے بہتر کون نبھا سکتا ہے۔ اگر بات ممدوح کے شان و شکوہ کی ہو تو قصیدے کی رسومیات اور محبت و جاں نثاری، ادب و پاسداری کا اظہار مقصود ہو تو غزل کی رسومیات نعت گوئی کے لیے سب سے بہترین حربہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

شاہ اجمل فاروق ندوی مبارک باد کے مستحق ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی اس کتاب کے ذریعے نہ صرف اپنی ایمانی حرارت اور محبت رسول کا اظہار کیا ہے بلکہ علم و ادب کے ایک ایسے گوشے پر گفت و شنید کے در وا کیے ہیں جس پر موجودہ زمانے میں گفتگو تقریباً مفقود ہے۔ میں پر امید ہوں کہ یہ کتاب شائقین میں قبولیت حاصل کرے گی۔

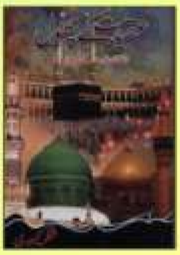

عقیدت کے پھول

شاعر: شنکر کیموری
صفحات: 168، قیمت: 200 روپے
ناشر: ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ 4
مبصر: احمد صغیر، حنیف منزل، کوٹلی پوکھر، پولس لائن، گیا 823001 (بہار)

نعت لکھنا گویا تلوار کی دھار پہ چلنے کے مترادف ہے کیونکہ اس میں ذرا سی بے احتیاطی اگر ایک طرف شرک کی حد تک پہنچا سکتی تو تو دوسری تو ہین رسول کا مرتکب بنا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف کو بہت ہی کم شاعروں نے اپنایا ہے۔ ہر شاعر کے یہاں غزلوں اور نظموں کے کئی کئی مجموعے مل جائیں گے لیکن نعتوں کا مجموعہ شاید ہی نظر آئے گا۔ شنکر کیموری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی پہلی شعری کاوش نعتوں کے مجموعے کے طور پر پیش کی جس کا نام ہے 'عقیدت کے پھول' غالباً ہر شاعر اپنا پہلا شعری مجموعہ غزلوں کا شائع

کرتا ہے لیکن شنکر کیموری کی حضرت محمدؐ سے عقیدت ہی ہے کہ انھوں نے 'عقیدت کے پھول' کے ذریعے عشق رسول کا ثبوت پیش کیا ہے۔

حمد، نعت اور ذکر شہادت کے پھول   مل گئے ہیں مجھے ان کی رحمت کے پھول
پیش کرتا ہے شنکر بصد احترام   بارگاہ نبی میں عقیدت کے پھول

جب ہم 'عقیدت کے پھول' کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ شاعر کا دل عقیدت کے جذبات سے سرشار ہے۔ بندگی اور عاجزی ان کے ایک ایک شعر سے پھوٹ رہی ہے۔ انھوں نے تشبیہ اور استعارے سے بہت کام لیا ہے بلکہ سیدھے سادے انداز میں نعت کہنا زیادہ مناسب سمجھا ہے:

یہ نعت مصطفیٰؐ کا مجھ پر فیض خاص ہے شنکر
میرے طرزِ سخن کا بانکپن میلا نہیں ہوتا

آقائے مدنی کی ذات اطہر کے اوصاف بیان کرتے ہوئے شنکر کیموری اپنے اشعار کے ذریعے یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے آقا نے انسان کو زندگی جینے کا انداز سکھایا ہے اور حیوان نما زندگی سے نکال کر انسانیت کے قریب کر دیا ہے۔ ہمارے نبیؐ نے تہذیب سے نہ صرف آشنا کرایا ہے بلکہ مظلوموں کو بھی معاف کر کے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

دشمن آقا کا سر نیچا کل بھی تھا اور آج بھی ہے   نام نبیؐ کا پرچم اونچا کل بھی تھا اور آج بھی ہے
میرے سرکارؐ جن راہوں سے گزرے   اندھیرے راستے بھی یار چمکے

شنکر کیموری کا تعلق شعر و ادب کے اس گروہ سے ہے جو بہت ہی خاموشی سے اپنی بساط بھر کوشش کر کے شعر و ادب میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں نہ کوئی گھن گرج ہے نہ کوئی نظریہ اور نہ ہی کسی کی پیروی۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اپنی ساری قوت نعت گوئی میں صرف کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سارا شعری حسن نعت میں موجود ہے۔ چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

لب پہ ہو ذکر نبیؐ سینے میں قرآن رہے   آخری وقت سلامت میرا ایمان رہے
بس ایک آرزو ہے دلِ بیقرار میں   آئے اگر قضا تو نبیؐ کے دیار میں
وہیں پہ عمر کا حصہ تمام ہوجائے   زہے نصیب مدینہ مقام ہوجائے

شنکر کیموری کے نعتوں میں موزوں برمحل الفاظ کے استعمال کے ساتھ جذبات کی ترسیل میں ہنرمندی بھی نظر آتی ہے۔ وہ کوئی فلسفہ پیش نہیں کرتے بلکہ عام فہم زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اپنا سارا کمال حضرت محمدؐ سے عقیدت میں دکھاتے ہیں۔ ایک غیر مسلم شاعر کی یہ عقیدت یقیناً قابل تاکش ہے کہ ان کی زبان سے ہمارے نبیؐ کی نہ صرف تعریف نکلتی ہے بلکہ ان کی سیرت، ان کی مہمان نوازی اور دشمنوں سے پیار، سب کچھ جھلکتا ہے:

دل سے نہ پوچھا کیسی خوشی ہوتی ہے
در نبیؐ سے جڑا ہوں جب سے عجیب دولت ملی ہوئی ہے

شنکر کیموری کا یہ مجموعہ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عشق نبیؐ کے سمندر میں غوطہ زن ہیں اور جب باہر آتے ہیں تو خوبصورت اشعار ان کی زبان پر ہوتے ہیں۔ حضرت محمدؐ کی ذات گرامی کا انھوں نے بھرپور مطالعہ کیا ہے کہ ہر شعر محمدؐ سے عقیدت کی گواہی دیتا ہے۔ ان کی ہر نعت کی خوبی یہ ہے کہ محمدؐ کی جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔ انھوں نے بہت ہی خوبصورت انداز میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

گلدستہ مراد

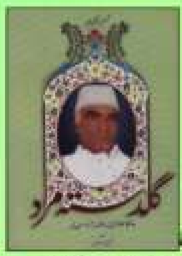

شاعر: مراد سعیدی، حافظ عمادالدین ٹونکی، مرتب: شوق احسنی ٹونکی
صفحات: 152، سنہ اشاعت: 2017
ناشران: فریدالدین خاں وفہیم الدین خاں
مبصر: عزیز اللہ شیرانی، فرحت منزل، کالی پلٹن، ٹونک راجستھان

ہمارے ملک کو 1947 میں آزادی حاصل ہوئی، اقتدار بدلا، ٹونک شہر نے بھی ہجرت کا درد سہا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی شعرا، ادبا اور علما نے ٹونک کی روایت کو قائم رکھا۔

زیرنظر کتاب 'گلدستۂ مراد' شعری مجموعہ کے خالق حافظ عمادالدین خاں ٹونکی بھی اسی روایت کے پاسدار ہیں، جن کے والد مولوی سراج الدین، بقول صاحب زادہ شوکت علی خاں فاؤنڈر ڈائریکٹر مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک 'عمادالدین مراد کے والد حضرت مفتی سراج الدین اگر شریعت کے سراج الدین تھے تو مراد صاحب دین شریعت کے عمادالدین سخنور تھے۔''

'گلدستۂ مراد' میں مراد سعیدی کی زندگی کے حالات اور شعری و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 152 صفحات پر مشتمل کتاب کے دو حصے ہیں۔ اول حصہ میں 32 صفحات کا بقیہ 120 صفحات میں مراد سعیدی کا کلام بلاغت شامل کیا گیا ہے جس میں نعت شریف، غزلیں، منظومات اور چہار بیت ہیں۔ غزلوں کی ترتیب دلچسپ ہے۔ تعداد 82 ہے جو بڑے سلیقے سے مزین کی گئی ہیں۔

ترتیب اس طرح دی گئی ہے کہ اولاً الف سے شروع ہونے والے مطلعوں کی 11 غزلیں ہیں۔ ان کے بعد بالترتیب ی تک کی غزلیں شامل کی گئی ہیں لیکن منظومات میں یہ ترتیب نہیں ہے۔ کل 18 منظومات ہیں۔ پہلی نظم 'ترک شراب' ہے۔ باقی 17 نظمیں شخصی ہیں۔ ابتدا ڈاکٹر ذاکر حسین خان سے کی ہے۔ پھر سیدھے ٹونک کے عمائدین اور شعرا حضرات کی شخصیت پر مبنی ہیں۔ ان میں شامل ہیں: محقق اعظم پروفیسر محمود خاں شیرانی، شفا منزل (مولانا منظور الحسن برکاتی کے حوالے سے) حسن میاں وکیل (سیاسی رہنما)، شاعر رومان اختر شیرانی، نگر سیٹھ اور سماجی خدمت گار: سید عید محمد، صاحب زادہ لیٰسین علی خاں نشاط، شیخ الحدیث مولانا محمد میاں، صاحب زادہ محمد علی خاں عاجز، بسمل سعیدی، رام نواس ندیم، بنواری لال جی بیروا، جے پور کے مولانا احترام الدین شاغل اور افق اجمیری۔

خوبصورت اور برمحل تشبیہات واستعارات کا گلدستہ، گلدستہ مراد میں کھل رہا ہے جو شائقین ادب کی توجہ کھینچتا ہے۔ کتاب کی اولین غزلوں میں اس کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

خوشی کے مقابلے غم زندگی کا رنگ دائمی ہے۔ مثال:

اپنی نظر میں کچھ نہ رہا اب خوشی کا رنگ   راس آگیا ہے اب تو غمِ زندگی کا رنگ
دنیا کا یہ نظام نہیں ایک حال پر   گاہے خوشی کا رنگ ہے گاہے غمی کا رنگ

حالات کی زبوں حالی، جور و ستم اور آزادی میں بے آزادی کی کیفیات آج بھی سر ابھار رہی ہیں۔ مراد کی غزل کے یہ اشعار اس کی ترجمانی کرتے ہیں:

اس حالِ زبوں سے میرے حیران بہت ہیں   وہ مجھ پہ ستم کر کے پشیمان بہت ہیں
اس دورِ ترقی میں نہیں میں ہی پریشاں   اس دور میں انسان پریشان بہت ہیں
آزادی سے اچھی تھی وہی قید ہماری   آزاد ہوئے جب سے پریشان بہت ہیں

وہ انقلاب جہاں سے مقابلہ آرائی کے حامی ہیں۔ اس خیال کو اس شعر میں خوب انداز دیا ہے:

ہمیشہ رہے وقت کی ٹھوکروں میں جو گھبرا گئے انقلاب جہاں سے
خلوص و مہر و وفا اب نہیں زمانہ میں یہ انقلاب زمانہ میں آگیا کیسے

مرادسعیدی کا اصل رنگ محبت اور خلوص کے پیکر میں رنگا ہوا ہے۔ رومانی انداز بیان سرزمین عشق اور دریائے باناس کی شیرینی اور حسین یادیں مراد کی غزلوں میں رنگ وحسن کے موتی بکھیر دیتی ہیں۔ وہ جذبۂ محبت اور عشق کی کیفیات کو شعری گلدستے میں سمو دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے اس موضوع پر کچھ اشعار:

خوشی ہو عشق میں یا کوئی غم محبت کا ہر اک منظر حسیں ہے
تمھاری یاد میں جو اشک بار گزری ہے وہ زندگی تو بہت خوشگوار گزری ہے
نہ گزرا کوئی بھی لمحہ تمھاری یاد بغیر تمھاری یاد سے غافل نہ جاں نثار رہے

گلدستے کے آخر میں ٹونک کی مشہور صنف سخن چہار بیت بھی کتاب میں شامل ہیں۔ پہلی اور دوسری چہار بیت نعتیہ ہے باقی بہاریہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ دیکھیں:

چہرے پہ جو پردہ ہے اسے اب تو ہٹائیں مشتاق جو ہیں دید کے ان کو تو دکھائیں
ہنستے ہوئے بے پردہ وہ سامنے آئیں چہرے کو سر بزم دکھانے کے دن آئیں

گلدستۂ مراد، دراصل ٹونک کی دیرینہ محبتوں کی یادگار ہے اور مرادسعیدی مرحوم ٹونک کے اساتذۂ شعروفن کی ادبی محافل میں صحبتیں اٹھائی ہیں۔ وہ شعروشاعری کے آداب واداؤں سے خوب واقف رہے ہیں بلکہ یہ کہہ دیں تو بے جا نہیں کہ وہ مشاعروں کے ناظم اعلیٰ تھے انھوں نے بڑے بڑے مشاعرے منعقد کیے۔

امید کی جاتی ہے کہ ناشران کتاب مرادسعیدی مرحوم کا بقیہ کلام بھی اسی تزک واحتشام کے ساتھ اشاعت کی منزل تک پہنچائیں گے اور اس سے بھی بہتر بنانے کی سعی کریں گے۔

رسائل و جرائد

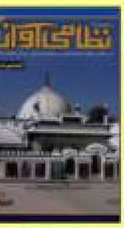

ماہنامہ 'نظامی آواز'

مدیر: فاروق ارگلی

صفحات: 50، قیمت: 30 روپے (فی شمارہ)

ناشر: نظامی آواز، 25 گنیش پارک، رشید مارکیٹ، دہلی 51

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی

اردو میں تصوف اور روحانیت سے متعلق رسالے شائع ہوتے رہے ہیں۔ مگر عام طور پر ایک خاص حلقے تک محدود رہتے ہیں۔ ماہنامہ 'نظامی آواز' کا اختصاص یہ ہے کہ اس کا رشتہ عوام سے ہے اور اس رسالے کا بنیادی مقصد امن عالم اور بقائے انسانیت کے لیے صوفیاء کرام کی روحانی تعلیمات سے ملک اور معاشرے کو روشناس کرانا ہے۔ اس کے دو تین شمارے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ فخر دہلی حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی کی یاد میں نکالا گیا یہ رسالہ مکمل طور پر تصوف اور روحانیت پر مبنی ہے۔ اس میں پوری انسانیت کے لیے محبت اور احترام کا پیغام ہے۔ اکتوبر، نومبر 2017 کا شمارہ اولیائے ہریانہ سے مختص ہے۔ سرورق پر حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کے آستانہ عالیہ کی تصویر ہے۔ اور شمارے میں ہریانہ سے تعلق رکھنے والے بزرگان دین اور صوفیاء کرام پر بیش قیمت تحریریں ہیں۔ ہریانہ وہ سرزمین ہے جو تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ زمین اسطوری حیثیت بھی رکھتی ہے جس کی تفصیل میں نے اپنے مضمون 'ہریانہ کا تحقیقی بیانیہ' مطبوعہ 'بزم سہارا' نئی دہلی اور ہفت روزہ 'مسلم دنیا' نئی دہلی میں میں تحریر کی ہے۔ اس سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہاں بہت سے صوفیاء کرام کے آستانے اور درگاہیں ہیں جہاں عقیدت مندوں کا ہجوم لگا رہتا ہے اور شاید انہی بزرگان دین کا فیض ہے کہ ہریانہ کی سرزمین سرسبز وشاداب ہے۔ فاروق ارگلی نے حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کے حوالے سے بہت اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ قلندر پانی پتی ایک صاحب کشف وکمال بزرگ تھے۔ پیدائشی ولی جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر ویرانوں میں بھٹکتے رہتے تھے۔ کئی کئی دن حجرے کے اندر بغیر کھائے پیے گزار دیتے تھے۔ حضرت قلندر پانی پت کے نواح کے جنگلوں میں عرصۂ دراز تک یاد الٰہی میں مشغول رہے۔ آپ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں۔ فاروق ارگلی نے لکھا ہے کہ حضرت قلندر کرنال اور پانی پت دونوں جگہوں پر قیام فرماتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد دونوں شہروں کے عقیدت مندوں میں تدفین کو لے کر جھگڑا ہو گیا۔ کرنال والوں نے بزور جنازہ اٹھا کر لے جانا چاہا لیکن وہ نہیں اٹھا سکے۔ پھر پانی پت والوں نے اٹھایا تو ان کا جنازہ پھول کی طرح ہلکا تھا۔ قلندر پانی پت میں مدفون ہوئے۔ ان کا آستانہ آج مرجع خلائق ہے اور اس آستانے پر مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم عقیدت مند حاضری دیتے ہیں۔ حضرت جمال الدین ہانسوی پر بھی ایک مضمون شامل ہے۔ ہانسی شریف ہریانہ کا ایک متبرک مقام ہے۔ جہاں بابا فریدالدین شکر گنج نے 12 سال تک قیام کیا تھا اور شیخ جمال الدین ہانسوی کی تربیت فرمائی تھی۔ شیخ جمال الدین ہانسوی اعلیٰ پائے کے خطیب، شاعر وادیب تھے۔ ان کا بھی آستانہ عقیدت مندوں کا مرکز ہے۔ ان کے فیوض وبرکات کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ ہریانہ ہی میں حضرت شیخ جلال الدین محمد کبیر الاولیاء کا آستانہ بھی ہے۔ وہ بھی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ان پر بھی ایک مضمون شامل ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ ان کے دسترخوان پر 1000 لوگ روزانہ کھانا کھاتے تھے۔ ہر مسافر آپ کے لنگر سے فیض پاتا۔ آپ جلالی بزرگ تھے جو بھی زبان سے نکالتے وہ پورا ہو جاتا۔

حضرت کبیرالاولیا اعلیٰ علمی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی کتاب 'زادالابرار' تصوف کی ایک اہم کتاب ہے۔ پانی پت میں آپ کا آستانہ بھی لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہے۔

حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی اعلیٰ پائے کے صوفی تھے آپ ایک مکمل ولی تھے۔ نظامی آواز میں ان پر ایک مضمون شامل ہے۔ ان کا بھی آستانہ لوگوں کی عقیدتوں کا محور ہے۔

حضرت سید غوث علی شاہ پانی پتی بھی ہریانہ کے ایک بزرگ تھے۔ ان کی زندگی بہت ہی سادہ تھی۔ کبھی پر تکلف مرغن کھانا نہیں کھایا۔ آپ کی کرامت کے کئی واقعات مشہور ہیں۔ اسی ہریانہ سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا بھی تعلق تھا۔ ان کی مشہور تفسیر مظہری کے حوالے سے محمد عطاء اللہ عثمانی کا مضمون شامل ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ گیسودراز خسرو حسینی سجادہ نشین بارگاہ حضرت خواجہ گیسودراز بندہ نواز کا ایک مضمون ''صوفیاء کرام کا پیغام امن وانسانیت، بھی اسی شمارے میں شائع کیا گیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پوری انسانیت کے درد کا مداوا تصوف کی تعلیمات میں مضمر ہے۔ امن عالم کا سارا حل اہل تصوف کے پاس موجود ہے۔ کیوں کہ صوفیا نے کبھی جبر وتشدد کو پسند نہیں کیا۔ احترام انسانیت کو فروغ دیا۔ خدمت خلق کو اپنا شعار بنایا۔ اخوت و بھائی چارگی کو بڑھاوا دیا۔ بقائے باہم، امن وشانتی تصوف کا ایک اصول ہے۔ وہاں انسان بحیثیت فرد وملت ہر ایک کے ساتھ شگفتہ تعلقات رکھتا ہے۔ کیوں کہ تصوف توڑنے نہیں جوڑنے پر یقین رکھتا ہے۔ ماہنامہ 'نظامی آواز' میں سرزمین ہریانہ کی تقریباً 162 درگاہوں کے نام شامل ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہریانہ کی سرزمین میں بزرگان دین اور صوفیاء کرام کے فیوض وبرکات کا چشمہ جاری ہے۔ فاروق ارگلی کی ادارت میں نکلنے والا یہ رسالہ تصوف اور روحانیت کے حوالے سے بہت اہم ہے۔

آج کے مادیت پرست عہد میں ماہنامہ نظامی آواز جیسے رسالے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کا پیغام محبت ہندوستان کے ہر کونے میں پہنچایا جانا چاہیے کہ یہ صرف تصوف نہیں بلکہ امن عالم اور بقائے انسانیت کی مہم ہے۔ ■

کونسل انجمن ترقی اردو کی نادرونایاب کتابوں کی اشاعت ثانی پر غور کر رہی ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں اردو ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: (پریس ریلیز)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے ہر ممکنہ کوشش کر رہی ہے تا کہ اردو زبان کا زیادہ سے زیادہ فروغ ہو سکے۔ پچھلی میٹنگ میں اشاعتی نقطۂ نظر سے جو اہم فیصلے لیے گئے ان میں نوے فیصد کتابوں کو آخری شکل دے دی گئی تھی، جن میں زیادہ تر اشاعت ہو چکی ہیں اور کچھ اشاعتی مرحلے میں ہیں۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ اردو ادب پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملک کے ایسے ادارے جہاں مالی بحران کے سبب نادرونایاب کتابیں اشاعت ثانی سے محروم ہیں ایسے اداروں سے باہمی ربط قائم کر کے کونسل نے کتابیں شائع کی ہیں۔

اس دفعہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے بھیجی گئی سفارشات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کونسل انجمن ترقی اردو کی نادرونایاب کتابوں کی اشاعت ثانی پر غور کر رہی ہے۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی۔ انھوں نے پچھلے چھ ماہ کی پینل کی کارکردگی پر تشفی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ کونسل کے لیے فخر کی بات ہے۔ اس کامیابی کا سہرا کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے سر جاتا ہے، جنھوں نے اپنی کوشش سے اشاعتی راہ ہموار کی۔ میٹنگ میں دیگر ممبران نے بھی اپنی اپنی آرا رکھی۔

اس میٹنگ میں پروفیسر وہاج علوی، پروفیسر رئیس انور، جناب مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر نریش، پروفیسر شبنم حمید، پروفیسر مہ جبیں غزال، ڈاکٹر سلیمہ بی کولور کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، جناب محمد انصر، (ریسرچ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 دسمبر 2017

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دهلی: (پریس ریلیز)، آج کا عہد سائنسی عہد ہے بچوں میں سائنسی معلومات، نئی ایجادات اور نئی کھوج کے

حوالے سے تعلیم فراہم کرنا ناگزیر ہے۔ اگر تقاضائے وقت کو ہم پورا کرنے سے قاصر رہ گئے تو ہمارے بچے سائنسی معلومات سے دور ہو جائیں گے۔ نہ صرف عالمی پیمانے پر بلکہ ملکی سطح پر ہونے والے مسابقتی امتحان سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ اسے سامنے رکھتے ہوئے کونسل بچوں میں سائنسی معلومات پر مشتمل چھوٹے چھوٹے کتابچے اردو میں لارہی ہے تاکہ بچوں میں سائنسی بیداری پیدا کی جاسکے۔ اس کے لیے کونسل بچوں کی سائنسی معلومات پر مشتمل قومی سطح پر مضمون نویسی پروگرام منعقد کرے گی تاکہ بچوں کے ساتھ ساتھ اردو قارئین کو سائنس سے جڑنے کا موقع ملے۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ میٹنگ کی صدارت پروفیسر سید احتشام حسنین نے کی۔ انھوں نے کونسل کی جانب سے مختلف شعبوں میں ایوارڈ اسکیم کا خیر مقدم کیا اور ساتھ ہی سائنس کے حوالے سے ایک انعام مختص کرنے کی گزارش کی۔ یہ انعام سائنس کی معروف شخصیت سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے نام پر رکھا جائے۔ اس تجویز کو پینل کے تمام ارکان نے منظوری دی۔ انھوں نے مزید کہا کہ سائنس سے وابستہ ماہرین جدید موضوعات پر اردو میں ایک عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ ان کی خدمات کا بھی اعتراف کیا جانا چاہیے۔

اس میٹنگ میں ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی، حافظ شائق احمد یحیٰی، ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، ڈاکٹر تسنیم فاطمہ ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) محترمہ ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ)، محترمہ شہناز اختر اور ڈاکٹر شاہد اختر نے کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، بھی شرکت کی۔ پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 دسمبر 2017

قومی اردو کونسل میں انور جلال پوری کے انتقال پر تعزیتی نشست

نئی دهلی: عالمی شہرت یافتہ شاعر اور نقیب مشاعرہ انور جلال پوری کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ انور جلال پوری کی رحلت سے اردو دنیا اس جلال و جمال سے محروم ہوگئی

جو ان کی شخصیت کا لاینفک حصہ تھے۔ ان کا انتقال اردو شعر وسخن کا ایک ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ انور جلال پوری نے اپنی جادوئی نظامت سے جہاں سامعین کے دلوں کو مسخر کیا وہیں اپنی شاعری کے ذریعے ایک بڑے طبقے کو اپنا اسیر بنایا۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی ثروت میں بھی گراں قدر اضافہ کیا ہے جسے ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ انھوں نے بھگوت گیتا اور گیتانجلی جیسے شاہکاروں کے ترجمے اردو میں کیے جو ہر طبقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عمر خیام کی رباعیات کا بھی ترجمہ کیا۔ انھوں نے اپنے ترجموں کے ذریعے ہندی داں طبقے کو بھی جوڑنے کی کوشش کی۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ملک زادہ منظور احمد کے بعد انور جلال پوری مشاعرے کی نظامت کے باب میں ایک روشن حوالے کی حیثیت رکھتے تھے مگر افسوس کہ نظامت کا یہ تابندہ ستارہ بھی ڈوب گیا۔

انور جلال پوری کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں ایک تعزیتی نشست ہوئی جس میں قومی اردو کونسل سے وابستہ افراد نے بھی اظہار تعزیت کیا ان میں پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) جناب کمل سنگھ، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحیٰ، توقیر راہی، افضل حسین خان اور حقانی القاسمی قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 جنوری 2018

عالمی کتاب میلے میں ماحولیات اور آب وہوا کی تبدیلی کے موضوع پر مذاکرے کا انعقاد

نئی دھلی: ہم انسان خود کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بہت سارے پودے، کیڑے مکوڑے اور دیگر مخلوقات انسانی وجود کی بقا میں مدد کر رہے ہیں۔ اگر یہ سب ختم ہو جائیں گے تو کرہ ارض پر انسانی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ انسانیت کی بقا کے لیے درختوں کا ہونا بہت ضروری ہے مگر انسان آج لالچ کی وجہ سے ماحولیات کو خراب کرتا جا رہا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی اور کثافت بڑھ رہی ہے اور انسانی وجود کو سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی ہے۔ ماحولیات کا شعور ہمارے پرانے مفکرین اور دانشوروں کو بھی تھا اسی لیے وہ فطرت سے بہت قریب تھے اور فطری اشیا کے تحفظ کے تئیں بیدار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے ماحولیات کو کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا مگر آج ماحولیاتی آلودگی دنیا کے لیے ایک تشویش ناک مسئلہ بن چکی ہے۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم ماحولیات کو بچانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں اور ماحولیات کے تئیں پورے سماج کو بیدار کریں۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ایچ ایس اے یحییٰ نے پرگتی میدان نئی دہلی میں منعقدہ عالمی کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام 'ماحول اور آب و ہوا کی تبدیلی' کے موضوع پر مذاکرے میں کیا۔ ان سے قبل ڈاکٹر رفیع الدین ناصر (اورنگ آباد، مہاراشٹر) نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ عہد میں سائنس اور ٹکنالوجی نے کافی ترقی کی ہے، اس کا ہمارے سماج پر جہاں مثبت اثر پڑا ہے وہیں کچھ منفی اثرات بھی پڑے ہیں اور موجودہ سائنسی ٹیکنالوجی کے غلط استعمال سے ہمارا ماحول کافی متاثر ہوا ہے اور آب و ہوا میں تبدیلی بھی ہوئی ہے، جس کا خمیازہ ہمیں گلوبل وارمنگ کی شکل میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ گلوبل وارمنگ کا اثر زیادہ تر نہ صرف انسانوں پر بلکہ جانوروں اور دیگر مخلوقات پر بھی پڑا ہے جس کی وجہ سے ہمارا ماحولیاتی توازن بگڑ گیا ہے۔ ہمیں اپنے ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے بھرپور کوشش کرنی ہوگی۔ سائنس کے معروف ادیب محمد خلیل نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج ماحولیات میں تبدیلی کی بڑی وجہ ہم خود ہیں۔ ہم اپنے گھر کی صاف صفائی پر توجہ دیتے ہیں لیکن پڑوسی کا گھر گندہ کر دیتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ماحول کے تئیں خود بھی بیدار ہوں اور سماج میں بھی بیداری پیدا کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج ضرورت ہے کہ ماحولیات پر زیادہ سے زیادہ لٹریچر شائع کیا جائے اور مختلف زبانوں میں ماحولیات پر کتابیں آنی چاہئیں تاکہ ماحولیات کے تئیں عوامی شعور بیدار ہو اور لوگ ماحولیاتی توازن کو قائم رکھنے میں تعاون کر سکیں۔

مذاکرے میں استقبالیہ تقریر قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی نے کی۔ انھوں نے مہمانوں کا مکمل تعارف بھی پیش کیا۔ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے سبھی مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ قومی اردو کونسل نے ماحولیات پر بہت ہی اہم اور عمدہ کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے بعض کتابوں کا اس مذاکرے میں اجرا بھی کیا گیا۔

مذاکرے کے دوران کونسل کے ذریعے ماحولیات کے موضوع پر شائع کی گئی چار کتابوں آؤ سائنسی خط لکھیں، باتوں باتوں میں سائنس، جانے انجانے جاندار اور ماحول نامہ کا اجرا بھی کیا گیا۔ مذاکرے میں بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 جنوری 2018

کونسل کے تعاون سے

مولانا حالی اوران کی خدمات

نئی دھلی: مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری، مضامین اور انشاپردازی کے ذریعے قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ ضرورت ہے کہ قوم ان کے طے کردہ خطوط کی روشنی میں سمت سفر طے کرے تاکہ ناکامیوں کا ازالہ ہو اور کامیابی حاصل ہو۔ان خیالات کا اظہار مفتی غلام مصطفیٰ نعیمی نے اپنے صدارتی خطبے میں کھجوری علاقہ کی ایس آر کالونی راجیونگر میں 'مولانا الطاف حسین حالی اوران کی خدمات' عنوان کے تحت منعقدہ سمینار میں کیا۔ اس سمینار کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے جامعہ اردو دہلی نے کیا جس کی نظامت مولانا غلام محمد نے کی جبکہ خیر مقدمی کلمات غوثیہ مسجد کمیٹی کے صدر محمد افسر علی نے ادا کیے۔ مدارس کے بیشتر بچوں کو اردو کی خدمات کے اعتراف میں علماء کرام کے ہاتھوں توصیفی اسناد سے نوازا گیا اور سوسائٹی نے محبان اردو سے 'مولانا الطاف حسین حالی اور ان کی خدمات' پر سوویز کا اجرا بھی کرایا۔ اس موقعے پر بحیثیت مہمان خصوصی حاجی بلو چودھری نے کہا اگر اردو کا تحفظ ہے تو مدارس اسلامیہ میں ہے جبکہ اردو کی ترویج وترقی کے لیے ہمیں تحریک چلانے کی ضرورت ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ شادی کارڈ، پمفلٹ، پوسٹروں اور بورڈ و نیم پلیٹ پر اردو کا استعمال کرنا چاہیے۔ مولانا الطاف حسین حالی اور ان کی خدمات پر مقالہ پڑھنے والوں میں مولانا شریف عالم (امام وخطیب رضا مسجد)، حافظ محمد سلیم (نائب امام غوثیہ مسجد)، حافظ محمد مناظر (امام وخطیب اولیا مسجد)، مولانا پرویز عالم (امام و خطیب نور مسجد) اور مولانا غلام محمد (امام و خطیب مسجد عطائے رسول) شامل تھے۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا'دہلی، 1 جنوری 2018

میر انیس پر یک روزہ سمینار

نئی دھلی: میر انیس اردو کے عظیم مرثیہ نگار تھے اور ان جیسا مرثیہ نگار ابھی تک پیدا نہیں ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مرثیہ، نوحہ خوانی اور سلام پڑھنے کا سلسلہ جاری ہے جو

ان کی بے پناہ مقبولیت کی ضمانت ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے اردو زبان کو مالا مال کردیا۔ ان کے مرثیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ میر انیس نے کربلا کی دردناک تاریخ اور شہادت کے واقعات کے پس منظر میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کی بھرپور تصویر پیش کی ہے۔ ان خیالات کا اظہار حاجی محمد افضال نے 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' اور 'بھارتیہ مانو ادھکار سرکشا پریشد' کے مشترکہ تعاون سے سیلم پور کے جے بلاک میں عالمی شہرت یافتہ شاعر 'میر انیس' پر منعقدہ سمینار میں کیا۔ سمینار کی کنوینر سوسائٹی کی ذمے دار فہمیدہ بانو تھیں۔ اس پروگرام کا افتتاح مدرسہ فیض العلوم کے ذمے دار مولانا فضل الرحمٰن نے کیا اور صدارت حاجی عاشق الٰہی نے کی جبکہ سوسائٹی کا تعارف ڈاکٹر ایم کیو تیمر نے کیا اور پروگرام کی شمع روشن سیلم پور کی کونسلر جن شکیلہ افضال نے کی۔ مقالہ نگار مولانا شوکت علی کاندھلوی نے کہا کہ میر انیس کا اردو زبان وادب پر بہت بڑا احسان ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ لئیق احمد، صلاح الدین، نفیس احمد، محمد امجد اور ڈاکٹر محمد عارف نے مقالے پیش کیے۔ اس سمینار کی کنوینر فہمیدہ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'انقلاب'دہلی، 18 دسمبر 2017

جامعہ عثمانیہ کا صد سالہ سفر

حیدرآباد: دارالترجمہ، عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو زبان کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ اردو ذریعہ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی تھی اس لیے اس کے سامنے فراہمی کتب اور اعلیٰ تعلیم کے تمام شعبہ جات کے لیے اردو زبان میں نصاب بہت اہم مسئلہ تھا۔ حکومت آصفیہ نے اس شدید ضرورت کی تکمیل کے لیے مغربی اور دیگر زبانوں میں موجود کتابوں کا ترجمہ اور کتابیں جو کسی اور زبان میں دستیاب نہیں تھیں۔ ان کی تصنیف وتالیف کے لیے دارالترجمہ والتالیف قائم کیا۔ دوروزہ قومی سمینار بعنوان جامعہ عثمانیہ کا صد سالہ سفر 'شعبۂ اردو' اردو اساتذہ اور دارالترجمہ کی خدمات زیر اہتمام صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی، بہادر پورہ حیدرآباد بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، محکمہ اعلیٰ تعلیم حکومت ہند نئی دہلی کا دوسرے دن کا پہلا اجلاس زیر صدارت پروفیسر حبیب نثار صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی و ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم ایسوسی ایٹ پروفیسر چیئرمین BOS شعبہ اردو اورینٹل لینگویجز عثمانیہ یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ اس موقعے پر شرکا سمینار نے اپنے مقالے پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی ہمہ جہت ترقی واستحکام میں فرمانروا حیدرآباد میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی خدمات کو بڑا دخل ہے۔ اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا خلیل احمد ندوی نظامی سابق و ماہر کتبات، محکمہ آثار قدیمہ وصدر صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی نے کہا کہ جامعہ عثمانیہ مرکز علوم وفنون کے ساتھ گہوارہ تہذیب وثقافت بھی ہے۔ ڈاکٹر جعفر جری چیئرمین بورڈ آف اسٹڈیز شعبۂ اردو، شاتواہنہ یونیورسٹی وکنوینر سمینار نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی چیف کوآرڈینیٹر سمینار نے تمام کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'اخبار مشرق'دہلی، 29 دسمبر 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

مقامی زبانوں میں سائنس کو فروغ دیں: وزیر اعظم

کلکتہ: وزیر اعظم نریندر مودی نے مقامی زبانوں میں سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کی وکالت کرتے ہوئے کہا

ہے کہ زبان سائنسی علوم کے حصول کی راہ میں گراوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ وزیر اعظم نے پروفیسر ستیندر ناتھ بوس کے 125 ویں یوم پیدائش پر کلکتہ میں ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر موصوف نے مقامی زبان میں سائنسی علوم کو فروغ دے کر ہمارے سامنے مثالیں قائم کی ہیں اور انھوں نے بنگالی زبان میں سائنس میگزین نکالا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ نوجوانوں میں سائنسی علوم کے فروغ کے لیے اشتراک، تعاون باہمی کی سخت ضرورت ہے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ انسٹی ٹیوٹ اور لیبارٹری قائم کیے جائیں گے۔ وزیر اعظم مودی نے سائنس دانوں سے اپیل کی کہ وہ سائنس کی مدد سے عام لوگوں کی زندگی کو آسان بنائیں۔ انھوں نے کہا کہ اس بات کا تجزیہ کیا جانا چاہیے کہ ہماری تحقیق اور تجزیوں سے غریب عوام کی زندگی کس قدر بہتر ہو رہی ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ اگر سائنس دانوں کی تخلیقات سے کسی کی بھی زندگی بہتر ہو جاتی ہے تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ وزیر اعظم نے سائنس دانوں سے کہا کہ وہ اپنی ریسرچ سماجی اور معاشی چیلنجوں کو سامنے رکھتے ہوئے کریں۔ یکم جنوری 1894 کو ماہر طبعیات پروفیسر ستیندر ناتھ بوس کی پیدائش ہوئی تھی اور انھوں نے مشہور سائنس داں البرٹ آئنسٹائن کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ پروفیسر بوس کے 125 ویں یوم پیدائش کو پورے سال منایا جائے گا۔ ہم نے ان کی زندگی اور کارنامے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ انھوں نے سماجی اور معاشی طور پر کمزور افراد کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر سائنس کی تھیوری مقرر کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی تھیوری پر تحقیقات کر کے کئی ماہرین طبعیات نے نوبل انعام حاصل کیا ہے۔

روزنامہ 'قاصد' دہلی، 2 جنوری 2017

تعلیم کے بغیر امپاورمنٹ کے خواب کی تکمیل ممکن نہیں

جودھپور: مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور مختار عباس نقوی نے کہا کہ تعلیم دور حاضر کا چیلنج بھی ہے اور ضرورت بھی اور تعلیم کے بغیر کسی بھی شعبہ میں امپاورمنٹ ممکن نہیں۔ یہ باتیں انھوں نے مولانا آزاد یونیورسٹی کیمپس جودھپور میں امریکن فیڈریشن آف مسلمس آف انڈین اوریجن (آفمی) کے 26 ویں سالانہ کنونشن سے خطاب

کرتے ہوئے کہیں۔ یونیورسٹی کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے صدارت کی۔ مرکزی وزیر مختار عباس نقوی نے کہا کہ روزگار پر مبنی تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مرکزی حکومت نے تعلیم کے ساتھ صحت اور صفائی کے شعبوں میں خصوصی توجہ دی ہے اور صفائی سپروائزرس کے عہدوں کے عہدوں پر تقرری کی ہے۔ مختار عباس نقوی نے مولانا آزاد یونیورسٹی کے قیام کے لیے مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی اور اس کے ارباب مجاز بالخصوص محمد عتیق کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ جس جذبے کے ساتھ اس پروجیکٹ کی تکمیل کی جا رہی ہے اس کے لیے وہ سوسائٹی کے ذمے داروں کو سلام کرتے ہیں۔ انھوں نے اس یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں ان کی وزارت کی جانب سے ممکن تعاون کا تیقین دیا اور مشورہ دیا کہ مرکزی حکومت کی اسکیموں سے استفادہ کرے۔ انھوں نے پروفیسر اختر الواسع کو آفمی کی جانب سے سرسید ایوارڈ پیش کرتے ہوئے ان کی تعلیمی میدان میں مسلسل خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ مرکزی وزیر گجندر سنگھ شیخاوت نے جو جودھپور کی نمائندگی کرتے ہیں، مولانا آزاد یونیورسٹی کے لیے 11 لاکھ روپے کے عطیے کا اعلان کیا اور کہا کہ انھیں خوشی اور فخر ہے کہ ان کے اپنے حلقہ میں اس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے لیے ہر قسم کے تعاون کی پیش کش کی۔ وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ آفمی کی اس کنونشن کو جناب مختار عباس نقوی کی شرکت نے تاریخ ساز بنا دیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جن بچوں کے اس نمبر اور پیسے نہیں ہیں یہ یونیورسٹی ان کے لیے ہے کیونکہ یہ سماج کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ ان بچوں کی تعلیم، تربیت، شخصیت سازی اور ان کے مستقبل کو سنوار کر انھیں اپنے ملک کا اثاثہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس موقعے پر ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے میرٹ میں کامیاب طلبہ و طالبات کو گولڈ میڈل پیش کیے گئے۔ امریکہ، کناڈا کے علاوہ ہندوستان کی مختلف اداروں کے سربراہوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 دسمبر 2017

سہ روزہ بین الاقوامی غالب سمینار

بین الاقوامی غالب سمینار

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بین الاقوامی غالب تقریبات کا افتتاح 22 دسمبر شام 6 بجے ایوان غالب کے آڈیٹوریم میں پروقار انداز میں ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں جسٹس آفتاب عالم، پروفیسر ہربنس مکھیا اور ڈاکٹر ایس وائی قریشی کے دست مبارک سے غالب انعامات کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس دفعہ کا غالب انعام اردو تحقیق و تنقید کے لیے پروفیسر قاضی جمال حسین کو، فارسی تحقیق و تنقید کے لیے پروفیسر حسن عباس، اردو نثر کے لیے شفیع مشہدی، اردو شاعری کے لیے پروفیسر شہناز نبی، اردو ڈرامے کا ڈاکٹر کاظم اور مجموعی ادبی خدمات کے لیے پروفیسر ارتضیٰ کریم کو سرفراز کیا گیا۔ یہ انعام مومنٹو، سرٹیفکٹ اور 75 ہزار روپے پر مشتمل ہے۔

سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ممتاز مورخ پروفیسر ہربنس مکھیا نے کہا کہ 'اردو ادب میں تقسیم اور اس کے نتائج' کے موضوع پر بہت زیادہ تحقیق نہیں کی گئی اور شاید ادب میں اور بھی کم کام ہوا ہے۔ جن وجوہ سے ملک تقسیم ہوا تھا شاید اس کا مقصد ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ ہم نے جمہوری نظام کے نفاذ کا فیصلہ کیا اور پاکستان کے مقابلے ہم جمہوریت کے معاملے میں کامیاب رہے۔

مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود سابق چیف الیکشن کمشنر ڈاکٹر ایس وائی قریشی نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ اس دفعہ کا سمینار اپنے موضوع کے اعتبار سے کافی اہم ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ ہمارے جو اسکالرز تشریف لائے ہیں وہ موضوع کے تعلق سے اہم گفتگو کریں گے۔

جلسے کی صدارت کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس آفتاب عالم نے اپنی صدارتی گفتگو میں کہا کہ تقسیم ہند کے اثرات میں سب سے نمایاں تو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف کا اردو ادب تقسیم وطن کا اردو ادب ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں افراد جس اجتماعی اور انفرادی کرب کا شکار ہوئے اس کا بے مثال اظہار ہمارے ادب میں ہوتا ہے۔ ہمارے رنج والم نے ہمارے ادب کو مالا مال کر دیا اور ہمارے اشکوں سے ہمارا ادب درخشاں ہے۔ منٹو، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر نے تقسیم ہند پر بے حد پر اثر کہانیاں لکھی ہیں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ یہ غالب تقریبات ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں ملک اور بیرون ملک کے اساتذہ، اسکالرز، ادبا، شعرا اور طلبہ بڑی تعداد میں اس تقریب کا حصہ بنتے ہیں۔ ہم نے پچھلے کئی برسوں سے اپنے سمینار کا دائرہ بھی وسیع کیا ہے تاکہ ادب کے ہر موضوع پر کھل کر گفتگو ہو سکے۔ اس دفعہ کا موضوع بھی نہایت دلچسپ ہے۔ تقسیم ہند اور اس کے نتائج کے اثرات آج تک ہماری زندگی سے وابستہ ہیں۔ ہمارا ادب ان مسائل سے بھرا ہوا ہے لہٰذا مجھے پوری امید ہے کہ اس اچھوتے موضوع پر بھی کچھ اہم باتیں ہمارے سامنے ضرور آئیں گی جس سے ہمارے علم میں ضرور اضافہ ہوگا۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے ابتدائی گفتگو میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے تاریخی پس منظر پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے اس سال کی سرگرمیوں پر گفتگو کی۔

اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مطبوعات گنجینۂ معنی کا طلسم (رشید حسن خاں)، امداد امام اثر، ادبیات، تصورات اور نوآبادیات (سرورالہدیٰ)، اردو ادب میں غیر کا تصور (صدیق الرحمٰن قدوائی)، مطالب الغالب (سہا مجددی)، قرۃ العین حیدر فن اور شخصیت (صدیق الرحمٰن قدوائی)، غالب نامے کے دو شمارے کے علاوہ ادارے نے شارحین غالب پر مونوگراف کی شکل میں ایک سیریز شروع کی ہے، جس میں تین مونوگراف حسرت موہانی (قمرالہدیٰ فریدی)، سہا مجددی (سرورالہدیٰ) اور عبدالرحمٰن بجنوری (خالد علوی) کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جلسے میں بین الاقوامی شہرت کے حامل غزل سنگر امریش مشرا نے غالب اور دیگر شعرا کے کلام سے جلسے کو نہایت ہی پر لطف بنا دیا۔

اردو ہندو پاک میں مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اس سے پہلے اردو دونوں کی زبان تھی۔ حالانکہ غیر مسلموں نے اردو کو چھوڑ کر بڑا نقصان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلموں نے اردو کو گھر سے نکال دیا تو مسلمانوں نے اسے پناہ دی اور باقی رکھا۔ ان خیالات کا اظہار غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد بین الاقوامی سمینار میں تیسرے اجلاس کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے ہندی کے معروف استاد پروفیسر اپوروانند نے کیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے پڑھے گئے مقالات کی تعریف کی۔ اس سیشن میں جے این یو کے ریسرچ اسکالر ضیاء اللہ انور، الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ عبدالحئی اور معروف فارسی محقق پروفیسر شریف حسین قاسمی نے تقسیم ہند کے اردو ادب پر نتائج پر اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کی۔ ڈاکٹر نجمہ رحمانی، قاضی جمال حسین، ڈاکٹر نریش، ڈاکٹر زبیر شاداب، ڈاکٹر سرور ساجد کے علاوہ ڈاکٹر علی جاوید نے مقالے پیش کیے۔ اپنی صدارتی گفتگو میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ جس طرح کی حساسیت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ سراہے جانے کے لائق ہے۔

اس سیشن میں ڈاکٹر نگار عظیم نے اپنا مقالہ پیش کیا جبکہ مظفر حسین سید نے 'خوشونت سنگھ کے ناول پر مقالہ پیش کیا۔ خیال رہے کہ سمینار کے پہلے دن پروفیسر اپوروانند کے ہاتھوں ڈاکٹر ثمر جہاں کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب 'تنویر احمد علوی کا جہان معانی' کا اجرا بھی کیا گیا۔

سمینار کے اختتامی اجلاس میں صدارتی گفتگو کرتے ہوئے مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھ پور کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ تخلیق حقیقت تک پہنچنے کا ایک معتبر ذریعہ ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کہا کہ تقسیم ہند کا سب سے پہلا نتیجہ تو یہ سامنے آیا کہ ایک نیا ملک بنا اور اس کے بعد کے حالات بھی اسی کا نتیجہ ہیں۔ تقسیم ہند کے نتائج کے طور پر جو ادائیگی ہمیں کرنی پڑتی ہے، اس کی مثلیث ہے ہندوستان، مسلمان اور اردو زبان اور اس مثلیث کے خسارے ہم سب پر عیاں ہیں۔

پروفیسر رضوان قیصر نے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ادب اپنی تاریخ خود پیدا کرتا ہے۔ اس سمینار میں کچھ چیزیں بالکل نئی نکل کر آئیں۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اختتامی اجلاس بنیادی

عالمی کتاب میلے کا شاندار آغاز

طور پر خود احتسابی کی کوشش ہے۔ ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ ہم نے جن اسکالروں کو دعوت دی تھی، ان سب نے اپنے اپنے مقالوں میں محنت کی ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔ سیمنار کے آخری دن کے تینوں اجلاسوں کی صدارت پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی، پروفیسر اصغر وجاہت اور پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کی، انھوں نے اپنی صدارتی گفتگو میں مقالات کو سراہا اور موضوع کے انتخاب پر غالب انسٹی ٹیوٹ کو مبارکباد دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 تا 25 دسمبر 2017

عالمی کتاب میلے کا شاندار آغاز

نئی دھلی: معروف ماہر ماحولیات سنیتا نارائن نے ملک میں بڑھتی آلودگی اور ماحولیاتی تبدیلی پر سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کا ماحول بگڑنے کا سب سے زیادہ اثر ہندوستان پر پڑا ہے اور غریبوں اور کسانوں کو اس کی سب سے زیادہ مار جھیلنی پڑ رہی ہے۔ راجدھانی کے پرگتی میدان میں 26 ویں عالمی کتاب میلے کے افتتاح کے موقعے پر منعقد تقریب میں مہمان خصوصی سنیتا نارائن نے یہ باتیں کہیں۔ انسانی وسائل کے فروغ کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کی غیر موجودگی میں ان کے ویڈیو پیغام کے ذریعے میلے کا افتتاح کیا گیا۔ افتتاحی تقریب میں خواتین کو بااختیار بنانے کی اسکیم کے تحت ہندی کی 3 نوجوان مصنفات یشسوِنی پانڈے، اندرا داگی اور کوشل پنوار کی کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔ اس سال میلے کا تھیم ماحولیات اور ماحولیاتی تبدیلی ہے اور یوروپی یونین کو مہمان ملک کا درجہ دیا گیا ہے۔ محترمہ نارائن نے کہا کہ پوری دنیا میں ماحولیات کے تئیں لوگوں میں تشویش پائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمینی سطح پر کوئی بھی ٹھوس کام نہیں کیا گیا ہے اور دنیا کے ماحولیاتی تبدیلی کا سب سے زیادہ اثر ہندوستان پر ہی پڑا ہے۔

سنیتا نارائن نے حکومت سے اپیل کی کہ شہروں کو اس طرح ڈیولپ کیا جائے جس میں عام آدمی کا خیال رکھا گیا ہو تاکہ وہ سڑکوں پر پیدل چل سکیں اور کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ انھوں نے کہا کہ کتابیں لوگوں کو ماحولیات کے تئیں آگاہ اور بیدار کرسکتی ہیں اس لیے ماحولیات کے سلسلے میں ملک میں بیداری پیدا کی جائے تبھی اس بحران کا حل نکل سکتا ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین بلدیو بھائی شرما نے زندگی اور سماج میں کتابوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لوگوں سے اپنے بچوں کی سالگرہ کے موقعے پر تحفے کے طور پر انھیں کتابیں دینے کی اپیل کی اور کہا کہ کتابوں کے ذریعے سماج میں کئی برائیوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں یوروپی یونین کے سفیر ٹامسز کوزلووسکی نے بتایا کہ ہندوستان اور یوروپی یونین کے رکن ممالک ماحولیات کے بحران کو دور کرنے کے لیے مل جل کر کام کررہے ہیں اور کئی پروجیکٹوں پر بھی کام چل رہا ہے۔ تقریب سے یونان کی ادیبہ کالیا پالا دکی، آئی ٹی پی او کے کارگزار ڈائرکٹر دیپک کمار اور انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت میں جوائنٹ سکریٹری مدھور نجن کمار نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 جنوری 2018

'سرسید کے شہر میں تہذیبی اقدار کا زوال'

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کلچرل ایجوکیشنل سینٹر (سی ای سی) کے مباحثہ وادبی کلب کے کریٹیو ڈسکشن فورم کی جانب سے ایک مذاکرہ 'سرسید کے شہر میں تہذیبی اقدار کا زوال' موضوع پر منعقد کیا گیا جس میں متعدد اساتذہ وطلبا نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ کریٹیو ڈسکشن فورم کے بانی ممبر پروفیسر عبدالمتین نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ علیگ برادری کے ذریعے زندہ روایات وقدروں پر عمل کیا جاتا رہا ہے جس سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ میں ایک خاص کشش پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جیسے جیسے لوگ پیسے اور کریئر کی طرف زیادہ رجحان رکھنے لگے تہذیب کا زوال شروع ہوگیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان لوگوں کی روزمرہ کی گفتگو سے رفتہ رفتہ غائب ہورہی ہے، حالانکہ اردو زبان بولنے والے کے اندر ایک طرح کا وقار پیدا کرتی ہے۔ کلچرل ایجوکیشن سنٹر کے کوآرڈینیٹر پروفیسر ایف ایس شیرانی نے گفتگو میں ظرافت، حس مزاح اور لطیف طنز کے استعمال کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کبھی یہ علیگ برادری کی شناخت ہوا کرتی تھی۔ پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ سرسید احمد خاں ایک روایت شکن تھے، جنھوں نے روایت کے نام پر اندھی تقلید کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی۔ پروفیسر ابوسفیان نے کہا کہ اردو کا استعمال علی گڑھ کی تہذیب کا اہم پہلو ہے۔ ڈاکٹر محب الحق نے سچائی کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تدریس وتربیت کی جگہ پر سچائی پر عمل کرنا ناگزیر ہے۔ پروفیسر تصدق حسین نے علیگ برادری میں درآئی منفی فکر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں منفی سوچ سے اوپر اٹھ کر علی گڑھ کی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔ شعبۂ انگریزی کی اسسٹنٹ پروفیسر علیشا ابکار نے مفکر بٹلر کے نقطۂ نظر سے تہذیب اور برتاؤ کے تصور کا تجزیہ پیش کیا جبکہ شعبۂ انگریزی کے ریسرچ اسکالر کاشف الیاس نے تہذیب کے تصور کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 دسمبر 2017

عالمی یوم عربی کا انعقاد

نئی دھلی: عربی زبان وادب کے فروغ کے لیے سرگرم مرکز ملک عبداللہ اور سعودی کلچرل اتاشی سعودیہ عربیہ کے اشتراک سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سنٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز کے زیراہتمام عالمی یوم عربی منایا گیا۔ اس موقعے پر منعقد تقریب میں سعودی کلچر کے عبداللہ صالح الشتوی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ افتتاحی سیشن کا آغاز کرتے ہوئے سنٹر آف عربک اینڈ اسٹڈیز کے چیئرپرسن پروفیسر رضوان الرحمٰن نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور عربی کے عالمی دن کے جشن کو منانے اور ہندوستان میں اس کی نشرواشاعت کی ضرورت پر زور دیا۔ سینٹر کے سابق چیئرپرسن پروفیسر مجیب الرحمٰن نے عالمی یوم عربی کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ہندوستان کے عربوں سے تعلقات پر روشنی ڈالی اور ہندوستان میں عربی زبان کے فروغ میں مرکز ملک عبداللہ کی کوششوں کو سراہا۔ مہمان خصوصی عبداللہ صالح الشتوی نے کہا کہ ہمیں عربی زبان پر فخر ہے اور ہم اس کو فروغ دینے کے لیے بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اسکول آف لینگویجز، لٹریچر اور کلچرل اسٹڈیز کے ڈین پروفیسر راجندر ڈینگلے نے کہا کہ کاش میں عربی بول پاتا کیونکہ جب میں سن رہا تھا تو میرے کانوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ انھوں نے کہا میں جرمن زبان کا طالب علم ہوں اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں تقریباً 17 زبانیں اور ان کے کلچر و ثقافت کو پڑھایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل اسسٹنٹ پروفیسر

کے شکریہ کے کلمات سے اس سیشن کا اختتام ہوا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے عربی ڈپارٹمنٹ کے صدر پروفیسر حبیب اللہ خان، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر عبدالماجد قاضی، سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز میں ایسوسی ایٹ پروفیسر عبیدالرحمٰن طیب، پرفیسر مجیب الرحمٰن نے عربی زبان اور عملی میدان میں کریئر کے امکانات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2017

نئی دھلی: بروز دوشنبہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے میر انیس ہال میں شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے سعودی کلچرل ہاؤس، شاہ عبداللہ مرکز برائے فروغ عربی زبان اور اتحاد اساتذہ وعلماء عربی زبان کے باہمی تعاون سے عربی زبان کے عالمی دن کے موقعے پر ایک عظیم الشان تقریب کا انعقاد کیا، جس میں سعودی عرب، مصر، یمن، تونس، عراق، فلسطین، الجزائر، اور کویت کے سفراء اور نمائندوں نے شرکت کی، صدارت کے فرائض جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے انجام دیے جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سعودی کلچرل اتاشی ڈاکٹر صالح بن عبداللہ الشتوی نے شرکت کی۔ وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے اپنے خطاب میں عربی زبان کو ہندوستان کا ایک اثاثہ قرار دیا۔ شعبۂ عربی کے دو اساتذہ ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی اور ڈاکٹر صہیب عالم کی کتابوں کا اجرا بھی ہوا۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر حبیب اللہ خان نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ اتحاد اساتذہ وعلما عربی زبان کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے ہندوستان میں عربی زبان وادب کے موضوع پر خطاب کیا اور ہندوستان میں عربی زبان کی ترویج واشاعت اور ہندوستانی علماء کی کاوشوں کا تذکرہ کیا۔ شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر خالد علی حامدی، پروفیسر محمد ایوب ندوی، ڈاکٹر نسیم اختر ندوی اور دیگر نے مقالے پیش کیے۔ سعودی کلچرل اتاشی ڈاکٹر عبداللہ صالح الشتوی نے کہا کہ عربی زبان ایک لافانی زبان ہے، کیونکہ اس زبان میں قرآن مجید نازل ہوا۔ شعبۂ عربی کی استاذہ ڈاکٹر ہیفاء شاکری نے عرب سفراء، سفارتی نمائندوں، مختلف یونیورسٹیز سے تشریف لائے اساتذہ، مہمانوں اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 دسمبر 2017

غالب اور دلی

نئی دھلی: غالب اکادمی دہلی میں مرزا اسداللہ خاں غالب کے دوسو بیسویں یوم پیدائش کے موقعے پر ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا جس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'غالب اور دلی' کے عنوان سے خصوصی لکچر دیا۔

انھوں نے اپنے لیکچر میں کہا کہ دہلی ایک عجیب وغریب شہر ہے۔ یہ درحقیقت محض اک شہر اور آبادی ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب ایک تمدن اور ایک تاریخ کا نام ہے۔ جب سے ہندستان کی باقاعدہ تاریخ لکھی جانی شروع ہوئی اور یہ عمل بیشتر فارسی میں انجام دیا گیا۔ دہلی کی ہر لحاظ سے اہمیت اور عظمت کا ذکر کیا جاتا رہا ہے۔ یہ چوں کہ بیشتر دارالخلافہ رہی ہے یا اسے حضرت دہلی کہا گیا۔ یہاں علماو فضلا کا مجمع رہا ہے اسے قبلۃ الاسلام، بغداد ہند اور خردمکہ کے محترم القاب وخطابات سے یاد کیا گیا۔ امیر خسرو نے دہلی کی اسی ہمہ گیر عظمت کے ترانے گائے ہیں۔ 1757 کے دوران پے در پے حملوں نے دہلی کو برباد کیا۔ پھر 1857 میں انگریزوں کے ہاتھوں دلی کی موت ہوگئی۔ غالب 1857 کے بعد کی دہلی کا ذکر کرتے ہیں۔

غالب نے اپنے ان آثار میں دہلی کی بربادی کی جو تصویر دکھائی وہ حالی، داغ یا ظہیر دہلوی وغیرہ کے مرثیوں پر بھاری ہے۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب کو دلی سے کم دلی والوں سے پیار زیادہ تھا۔ بنارس ان کو بہت پسند تھا اس پر انھوں نے چراغ دیر مثنوی لکھی، کلکتہ سے وہ بہت متاثر تھے۔ محفل کلام غالب میں مدھو چیتا بوس اور انوشکا نے غالب کی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں۔ ڈاکٹر احمد علی برقی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2017

اردو سمیت دیگر اخبارات کی تعداد میں 5.13 فیصد کا اضافہ

ممبئی: آر این آئی کی حال میں جاری کی گئی ایک تازہ ترین رپورٹ الیکٹرانک میڈیا کے دور میں پرنٹ میڈیا کے لیے کافی حوصلہ افزا ہے اور اردو کے نام سے ماتم کرنے والوں کے حوصلے بھی بلند ہوسکتے ہیں کیونکہ ہندی اور انگریزی کے بعد اردو اخبارات تیسرے مقام پر برقرار ہیں اور ان کی تعداد اشاعت بھی اطمینان بخش بتائی گئی ہے جو کہ ایک خوش آئند امر ہے۔ اردو اخبارات کی اشاعت 92 لاکھ 17 ہزار 892 بتائی گئی ہے۔

ذرائع کے مطابق رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ 2015-2016 کے درمیان ملک میں 5 ہزار 423 نئے اخبارات رجسٹرڈ کیے گئے ہیں یا ان کا اجرا ہوا ہے۔ اس طرح ملک بھر میں اخبارات کی تعداد ایک لاکھ 5 ہزار 443 سے بڑھ کر ایک لاکھ 10 ہزار 851 ہوگئی ہے۔ اس رپورٹ کو آر این آئی یعنی رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا نے جاری کیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ملک سے 16 ہزار 136 اخبارات روزانہ شائع ہوتے ہیں اور 94 ہزار 715 ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہنامہ ودیگر ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات سامنے آئی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی بھرمار کے باوجود پرنٹ میڈیا میں 15 اعشاریہ 13 فیصد کا اضافہ درج ہوا ہے۔ جبکہ 2014-15 میں صرف 5.8 فیصد کا اضافہ ہوا۔ وزارت اطلاعات ونشریات نے نئی پالیسی جاری کی ہے اس میں حکومت نے واضح کیا ہے کہ اخبارات اور دورانیہ (ہفت روزہ، 15 روزہ وغیرہ) کے سرکولیشن کی تعداد پر نظر رکھی جائے اور ایڈٹ بیورو آف سرکولیشن (اے بی سی) یا آر این آئی اس کی تصدیق کرے۔ اس کے تحت ہی انھیں اشتہارات جاری کیے جائیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ہندی اخبارات کی اشاعت ملک میں ہر روز سب سے زیادہ 314.5 ملین ہے، اس کے بعد انگریزی اور اردو کا نمبر آتا ہے، جبکہ علاقائی زبانوں کے اخبارات کا نمبر ہے، لیکن ان کی اشاعت بھی بہتر حالت میں پائی گئی ہے اور مستقبل میں بھی ان کی حالت بہتر ہونے کا امکان ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 20 دسمبر 2017

گوگل نے بنایا غالب پر ڈوڈل

نئی دھلی: گوگل نے اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کے 220ویں یوم پیدائش کے موقعے پر ایک خوبصورت

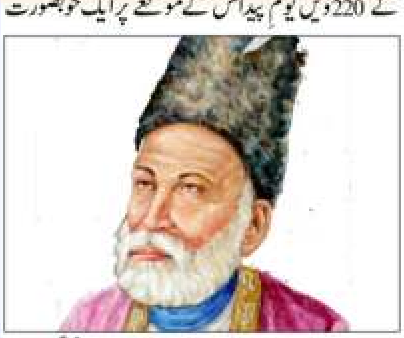

ڈوڈل کے ذریعے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ گوگل کے ڈوڈل میں مرزا غالب ہاتھ میں قلم اور کاغذ لیے مغل طرز کی عمارت کے برآمدے میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ گوگل نے اس تصویر کے ساتھ ہی غالب کے لیے اپنے بلاگ میں لکھا ہے کہ ان کی ہنگامہ خیز اور مصائب سے پرزندگی کی جھلک ان کے کلام میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ خواہ کم عمری میں یتیمی ہو یا پھر اپنی سات اولادوں کی موت یا پھر ہندوستان میں مغلوں کی حکومت کا خاتمہ، ان حالات نے ان کی شاعری کو کافی متاثر کیا۔ تنگ دستی ان کے ساتھ رہی اور انھیں کبھی باضابطہ تنخواہ نہیں ملی۔ بلاگ میں لکھا ہے کہ ان مصائب اور مشکلات کے باوجود

غالب نے اپنی سمجھ بوجھ اور زندگی کے تئیں محبت سے ان حالات کو اپنے لائق بنایا۔ ان کی شاعری کو ان کی زندگی میں اتنی مقبولیت نہیں ملی جتنی آج مل رہی ہے۔ مرزا غالب کا پورا نام مرزا اسداللہ بیگ خاں غالب تھا۔ ان کی پیدائش 27 دسمبر 1797 کو مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت کے دوران آگرہ کے ایک فوجی خاندان میں ہوئی تھی۔ انھوں نے فارسی، اردو اور عربی زبان کی تعلیم حاصل کی تھی۔ 15 فروری 1869 کو غالب نے آخری سانس لی۔ انھیں دہلی کے نظام الدین بستی میں سپردخاک کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 دسمبر 2017

دہلی:

جامعہ میٹرو اسٹیشن پر میورل پینٹنگ کو منظوری

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فائن آرٹس فیکلٹی کے طلبہ جامعہ میٹرو اسٹیشن پر میورل پینٹنگ بنائیں گے۔ اس

پینٹنگ کے ذریعے یونیورسٹی کے اب تک کے سفر کو پیش کیا جائے گا۔ یونیورسٹی کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے پینٹنگ میں دکھایا جائے گا کہ کس طرح پرانی عمارتوں سے جدید فن تعمیر کی عمارتیں جامعہ میں تیار ہوگئی ہیں اور اب یونیورسٹی کی کیا شکل ہے۔ پینٹنگ میں جامعہ کا لوگو بھی بنایا جائے گا۔ جامعہ کے ترانے کی ایک لائن بھی اس پینٹنگ میں شامل کی جائے گی۔ فائن آرٹس فیکلٹی کے ٹیچر شاہ ابوالفیض کی دیکھ ریکھ میں ان کے اسٹوڈنٹس یہ پینٹنگ بنائیں گے۔ اسی سال اگست میں یونیورسٹی کے رجسٹرار اے پی صدیقی کی طرف سے میٹرو اسٹیشن پر جامعہ کے اسٹوڈنٹس کے ذریعہ میورل پینٹنگ بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ ڈی ایم آر سی پہلے ہی میٹرو اسٹیشن کی دیواروں پر پینٹنگ کا کام کسی دوسرے آرٹسٹ کو دے چکا تھا، لیکن یونیورسٹی کی طرف سے لگاتار کوششوں کی وجہ سے ڈی ایم آر سی مان گیا اور آخر کار یونیورسٹی کو میورل پینٹنگ بنانے کی اجازت دے دی۔ ڈی ایم آر سی نے نہ صرف پینٹنگ کی منظوری دے دی ہے بلکہ پینٹنگ بنانے کے لیے ضروری سامان کا خرچ اور طلبہ کو اعزازیہ دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ ڈی ایم آر سی نے جامعہ کو اس کے لیے ڈیمانڈ ڈرافٹ بھی دے دیا ہے۔ جامعہ کے فائن آرٹس فیکلٹی کے لیے جانے والے گیٹ سے متصل میٹرو اسٹیشن سائڈ کی ٹکٹ ونڈو کے بغل کی بڑی دیوار پر یہ پینٹنگ بنائی جائے گی۔ میٹرو کی طرف سے منظوری ملنے کے بعد جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد کافی خوش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میٹرو اسٹیشن سے گزرنے والوں کو اس پینٹنگ کے ذریعے جامعہ کی تاریخ کے بارے میں پتہ چل سکے گا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 31 دسمبر 2017

شہید اشفاق اللہ خان اور پنڈت رام پرشاد بسمل کی یاد میں سمپوزیم

نئی دہلی: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے نیو سیلم پور میں شہید اشفاق اللہ خان اور پنڈت رام پرشاد بسمل کی یاد میں ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید احمد خاں نے شہید اشفاق اللہ خان اور پنڈت رام پرشاد بسمل کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ان دونوں آزادی کے متوالوں اور اردو زبان وادب کے پرستاروں کی خدمات ملک کے لیے ناقابل فراموش ہیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر ساحل احمد نے کہا کہ یہ دونوں نہ صرف مجاہد آزادی تھے بلکہ اردو زبان وادب نوازے بھی تھے۔ آج کے حالات میں ان دونوں کی قربانیوں سے سبق لیتے ہوئے ملک میں اتحاد ویکجہتی کی فضا بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ اس موقعے پر مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ شہید اشفاق اللہ خان اور پنڈت رام پرشاد بسمل کی حیات وخدمات پر مشتمل منصوبے بنائے اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کا لائحہ عمل تیار کرے۔ تمام شرکا کا شکریہ حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 دسمبر 2017

شنکر شاد مشاعرہ

نئی دہلی: کڑاکے کی سردی اور مشاعروں کی محفل کا اپنا ایک الگ لطف رہتا ہے۔ ایسی ہی ایک خوبصورت محفل بارہ کھمبا روڈ واقع ماڈرن اسکول کے آڈیٹوریم میں سجائی گئی، جہاں زبان کے جادو اور اردو شاعری کو سننے کے لیے شائقین کا جوش وخروش بخوبی دیکھنے کو ملا۔ شنکر لال مرلی دھر سوسائٹی کی طرف سے شنکر-شاد مشاعرہ ڈی سی ایم کی وراثت سر شنکر لال شنکر اور لالہ مرلی دھر شاد کی یاد میں منعقد کیا جاتا ہے جو سماجی تعلیم اور نئی دہلی کے ثقافتی ورثہ میں اپنی شراکت کے لیے جانے جاتے ہیں۔ اس ثقافتی ورثہ نے 1953 سے اردو مشاعرے کو ادب آرٹ کے طور پر تسلیم کیا ہے اور اپنے اس جشن سے مسلسل ایک روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس مشاعرے کا 52واں سال ہے، جس نے اردو شاعری کی دنیا میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ سابقہ دور میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری اور دیگر نامور شاعروں نے شنکر-شاد مشاعرہ کو ایک اہم شناخت دی ہے۔ اس سال انور جلال پوری، پروفیسر وسیم بریلوی، پاپولر میرٹھی، منظر بھوپالی، اقبال اشہر، عفت زرین، نواز دیوبندی، شین۔ کاف۔ نظام، ڈاکٹر کلیم قیصر، سیہ کا عباس نقوی، اظہر اقبال، خوشبیر سنگھ شاد، نعمان شوق اور منیش شکلا وغیرہ نے اس محفل میں اپنی پیشکش سے چار چاند لگا دیے۔ ڈی سی ایم شری رام انڈسٹریز گروپ کے ڈائرکٹر نے کہا کہ یہ ہمارے آباواجداد نے شروع کیا تھا اور ہم نے اس وراثت کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ ہم نوجوانوں کے بیچ اس وراثت کو لاتے ہیں اور ہماری کوشش ہے کہ یہ وراثت آگے بڑھتی رہے اور امید ہے کہ یہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 دسمبر 2017

آندھرا پردیش:

قوم کی ترقی مادری زبان میں پنہاں

کرنول: کسی بھی قوم کی ترقی مادری زبان کی حفاظت و ترقی ہی میں مضمر ہے کہ اردو زبان کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کریں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر شیخ محمد نعمان نے اردو اکادمی آندھرا پردیش ضلع کرنول کے زیر اہتمام منعقدہ مولانا ابوالکلام آزاد اردو بھون کرنول میں تقریب تقسیم انعامات میں کیا۔ اس موقعے پر صدر نشین اردو اکادمی آندھرا پردیش ڈاکٹر شیخ محمد نعمان مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک رہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا میں مادری زبان کی بہت ہی اہمیت ہے، تاریخ گواہ ہے کہ جب کسی قوم کو تباہ وبرباد کرنا ہو تو ان کی گردنوں پر تلواریں نہیں چلائی گئیں، بلکہ ان کی مادری زبان ختم کر دی گئی، جس سے خود بخود وہ قوم ختم ہوگئی۔ ڈسٹرکٹ مینارٹیس ویلفیئر آفیسر کرنول جناب شیخ مستان ولی صدر جلسہ کی حیثیت سے شریک رہے۔ انھوں نے طلبا کو نصیحت کی کہ وہ محنت وجستجو کے ساتھ تعلیم حاصل کریں۔ انچارج مینیجر مولانا ابوالکلام آزاد اردو بھون کرنول محترمہ این ثمینہ پروین نے کہا کہ مادری زبان کی ترقی کے لیے ہم کو آگے بڑھنا چاہیے۔ صدر انجمن ترقی اردو کرنول کریم اللہ خاں نے نظامت کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی ترقی میں ہماری کامیابی مضمر ہے۔ آخر میں صدر انجمن کریم اللہ خاں کے شکریے پر تقریب اختتام کو پہنچی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 جنوری 2018

اتر پردیش

مرزا غالب کا یومِ پیدائش

امروہہ: دنیا کے عظیم ترین شاعر مرزا غالب کے یومِ پیدائش پر بزمِ زندہ دلانِ امروہہ کی ایک میٹنگ دفتر محلہ ترپولیہ میں منعقد ہوئی۔ میٹنگ کی صدارت تنظیم کے سرپرست ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے فرمائی۔ جبکہ نظامت کے فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ میٹنگ میں مرزا غالب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ مرزا غالب اردو کے ایک عظیم شاعر اور رجحان ساز نثر نگار ہیں، وہ بلاشبہ ایک آفاقی شاعر ہیں۔ ان کی طرزِ ادا میں جدت و بانکپن ہے۔ سینئر شاعر مسرور جوہر نے کہا کہ غالب محض ایک شاعر کا نام نہیں بلکہ ایک پورے شاعرانہ عہد کا نام ہے جو ماضی حال اور مستقبل تینوں ادوار پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر جمشید کمال نے کہا کہ مرزا غالب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر امروہوی نے کہا کہ مرزا غالب انسانی فطرت کے نباض تھے اور نفسیاتی حقائق کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ انھیں مسائل تصوف خصوصاً فلسفہ وحدت سے گہری دلچسپی تھی۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ مرزا غالب اردو کے وہ عظیم شاعر ہیں جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے غزل کو ایک نئی جہت دی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 28 دسمبر 2017

اتر پردیش میں اردو کا مستقبل: اندیشے اور توقعات

لکھنؤ: اردو کا ماضی شاندار رہا ہے، حال بھی بہت خوب ہے اور مستقبل تابناک نہیں تو قابلِ تشویش بھی نہیں ہوگا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو داں طبقہ احساس کمتری سے باہر نکلے، بیچارگی کا لبادہ اتار پھینکے اور اس کی فلاح و بہبود کے زمینی سطح پر کام کرے۔ ان خیالات کا اظہار پریس کلب میں ایک سیمینار کے دوران مقررین نے کیا۔

الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد سیمینار بعنوان 'اتر پردیش میں اردو کا مستقبل، اندیشے اور توقعات' سے خطاب کرتے ہوئے معروف شاعر اور یوپی ہندی سنستھان کے ڈائرکٹر منیش شکلا نے کہا پاکستان مخالف رویہ نے ہندوستان میں اردو کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ اس زبان کی خوشبو، اس کی شیرینی، اس کی افادیت ایسی ہے کہ اسے کبھی بھی ختم نہیں کیا جاسکتا اور آج اگر پوری دنیا میں اردو کی صورت حال پر نظر ڈالیں تو ایک طرح اس میں انقلاب آگیا ہے۔ البتہ اتر پردیش میں یہ دوسری سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی وہ توجہ اور اہمیت نہیں پاسکی جس کی یہ حقدار ہے۔

مہمانِ خصوصی بالیندو دویدی، ضلع اقلیتی بہبود افسر نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ اردو سے زیادہ شیریں اور خوشبودار زبان کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ انھوں نے بھی کہا کہ کسی بھی زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں بھی اردو کے کئی بڑے نام غیر مسلم ہیں۔ پروگرام کے صدر سینئر صحافی اور معروف کمنٹیٹر پی کے تیواری نے بھی احساس کمتری سے باہر نکلنے کی صلاح دیتے ہوئے کہا کہ بچپن میں ہی اگر ہم اردو لٹریچر کتابیں، کہانیاں، کویتاؤں کا ترجمہ فراہم کریں تو نئی نسل کو اس زبان کی چاشنی کا اندازہ ہو جائے گا اور وہ بڑے ہوتے ہوتے اس کے مضبوط محافظ بن جائیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 دسمبر 2014

چراغ دیر کے عنوان سے سیمینار کا انعقاد

علی گڑھ: حکومت راجستھان کے آثار قدیمہ و میوزیم شعبہ اور مرزا غالب سوسائٹی جے پور کے زیر اہتمام اردو

کے ممتاز شاعر مرزا غالب کی یاد میں 'چراغ دیر' کے عنوان سے ایک قومی سیمینار کا انعقاد البرٹ ہال جے پور میں عمل میں آیا جس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ قانون کے سینئر استاد پروفیسر شکیل صمدانی نے کہا کہ آج مرزا غالب کی مقبولیت برصغیر ہند سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ گوگل نے بھی ان کے یومِ پیدائش پر خصوصی چیزیں اپلوڈ کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غالب نے شاعری کے ساتھ خطوط نویسی کو بھی نئی جہات سے روشناس کرایا۔

پروفیسر صمدانی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ امر باعثِ تشویش ہے کہ اردو زبان جو اس ملک میں پیدا ہوکر یہیں پروان چڑھی آج وہ اپنے ہی ملک میں سوتیلے سلوک کا شکار جس کی وجہ سے ہر دن کے ساتھ یہ زبان اپنے ہی وطن میں کمزور ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان کو مذہب کی عینک سے نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ زبان زبان ہوتی ہے اور جو اس زبان کو بولتا ہے وہ اسی کی زبان ہو جاتی ہے۔ پروفیسر شکیل صمدانی نے ممتاز شاعر تبسم رحمانی کے دو شعری مجموعوں کا اجرا بھی کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 جنوری 2018

لسانی ٹیکنالوجی کے لیے چیلنج

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے لسانی ٹیکنالوجی لیب میں 'لسانی ٹیکنالوجی کے لیے چیلنج' موضوع پر قومی سیمینار کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ صدر شعبہ پروفیسر علی رفاد فتیحی نے اپنی افتتاحی تقریر میں سیمینار کی اہمیت اور اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ملک کے مختلف حصوں سے آئے شرکا، دانشوروں، ساتھیوں، مہمانوں اور طلبا کا استقبال کیا۔ سیمینار کے کلیدی مقرر ڈاکٹر ایل راما سوامی (ہیڈ ایل ڈی سی - آئی ایل) نے لسانی ٹیکنالوجی پر ملک بھر میں تحقیقی سرگرمی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایل ڈی سی - آئی ایل، یونیورسٹیوں میں بین موضوعاتی تحقیق کو فروغ دینے کے لیے سیمیناروں اور کانفرنسوں کو اسپانسر کرتا ہے۔ مہمان خصوصی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے پروفیسر ویشنا نارنگ نے اپنی افتتاحی تقریر میں، نوجوان ذہنوں کو لسانی ٹیکنالوجی کی طرف راغب کرتے ہوئے کہا کہ انھیں وقت سے قدم ملنے کے لیے اس طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے ہی پروفیسر پردیپ کے داس نے بتایا کہ لسانیات کی فیکلٹی، لسانی ٹیکنالوجی کے فروغ میں زیادہ اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ پروفیسر رجنیش اروڑا نے نوجوان محققین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بتایا کہ اس علاقے میں معیاری تحقیقاتی کام کو کس طرح آگے بڑھانا ہے۔ پروفیسر زاہد، ڈین فیکلٹی آف آرٹس سیمینار کے افتتاحی تقریب کی صدارت کی اور سبھی معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ مسعود علی بیگ نے اس موقعے پر سبھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی 30 دسمبر 2017

ابتدائی تعلیم میں اردو زبان کی اہمیت

دیوبند: اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن مظفر نگر کے زیر اہتمام ایک اردو کانفرنس بعنوان 'ابتدائی تعلیم میں اردو زبان کی اہمیت' کا اہتمام سادات ہوسٹل، آریہ سماج روڈ پر کیا گیا جس کی صدارت صوبائی کنوینر محمد صابر خان نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی

کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے شرکت کی۔ نظامت ڈاکٹر طاہر قمر نے کی۔ اس موقعے پر ایوی ایشن کے ضلع سکریٹری محمد شہزاد نے کہا کہ 9 نومبر عالمی یوم اردو اور 11 نومبر یوم تعلیم کے موقعے پر پرائمری و جونیئر سطح کے سرکاری اسکولوں کے طلبا و طالبات کا اردو خوشخطی مقابلہ 100 اسکولوں میں 2050 طلبا و طالبات کے درمیان منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں بلاک اور ضلع سطح پر پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو اعزاز، اسناد اور ایوارڈ دے کر حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس کے علاوہ بلاک کی سطح پر مقابلے میں اپنا اہم کردار نبھانے والے 3-3 اردو اساتذہ کو بھی اعزازی اسناد اور ٹرافی دے کر نوازا گیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے خطاب میں کہا کہ مادری زبان کی اہمیت کسی بھی طالب علم کی زندگی میں بڑا مقام رکھتی ہے۔ صوبہ کنوینر محمد صابر خان نے کہا کہ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوی ایشن صوبائی سطح پر اردو زبان کی ترقی اور اردو اساتذہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے کام کرتی ہے۔ صوبائی سکریٹری راؤ عبدالستار نے کہا پرائمری سطح کے بچوں میں اردو زبان کے فروغ کے لیے ایسے پروگرام کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ سید وجاہت شاہ نے کہا کہ مائیں اپنے بچوں کو روزانہ اردو کی کوئی نہ کوئی کہانی ضرور سنائیں، اس سے بچوں کے اندر اردو زبان سے محبت پیدا ہوگی۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوی ایشن علی گڑھ کی نمائندگی کرتے ہوئے کلیم تیاگی نے کہا کہ آج اردو زبان کے چاہنے والوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ نواب عظمت گرلس کالج کی پرنسپل صفیہ بیگم نے تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور خاص طور سے لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو مولانا عبدالکلام آزاد ایوارڈ سے نوازا گیا اور محمد صابر خان، راؤ عبدالستار، رئیس الدین رانا، صفیہ بیگم کو علامہ اقبال ایوارڈ دیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 دسمبر 2017

پروفیسر محمد شفیع مرحوم یادگاری خطبہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کی ریٹائرڈ پروفیسر اور یو جی سی، بی ایس آر فیلو پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ نے شعبۂ جغرافیہ، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کے ذریعے منعقد 39 ویں انڈین جیوگرافیکل کانفرنس کے موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پرو چانسلر اور پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع کی حیات و خدمات پر پہلا پروفیسر محمد شفیع میموریل خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر محمد شفیع

کے ساتھ 40 برس سے زائد عرصہ تک کام کیا۔ وہ پہلے بطور شاگرد، پھر بطور ریسرچ اسکار اور پھر بطور ٹیچر شعبہ سے وابستہ رہیں۔ اپنے خطاب میں پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ نے کہا کہ پروفیسر محمد شفیع اپنے رفقا اور طلبہ میں شفیع صاحب کے نام سے معروف تھے۔ وہ یکم اگست 1924 کو جونپور میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھے چنانچہ اسکول و کالج اور پھر الہ آباد و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پھر لندن میں اپنی ذہانت و صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ 1941 میں ہائی اسکول اور 1943 میں انٹرمیڈیٹ جونپور سے کیا۔ 1945 میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے اور 1947 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ اس کے بعد لندن اسکول آف اکنامکس سے پروفیسر سر ڈڈلے اسٹامپ کی رہنمائی میں پی ایچ ڈی کی۔ وہ 1948 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرر بنے، 1957 میں ریڈر ہوئے اور 1962 میں پروفیسر ہوئے۔ شعبۂ جغرافیہ کے وہ 22 سال تک صدر رہے۔ وہ اے ایم یو کے پرو چانسلر اور پرو وائس چانسلر بھی رہے۔ پروفیسر آبھا لکشمی سنگھ نے کہا کہ پروفیسر شفیع خاص طور سے اپنے استاد پروفیسر ڈڈلے اسٹامپ سے متاثر تھے۔ زراعتی جغرافیہ میں وہ اسٹامپ کی روایت کے امین تھے۔ ان کی علمی تحقیق نے 'لینڈ یوٹلائزیشن ان ایسٹرن اتر پردیش' کے عنوان سے ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مستقبل کے ریسرچ اسکالروں کے لیے مشعل راہ کا کام کیا۔ پروفیسر محمد شفیع کی نگرانی میں تقریباً 34 طلبہ نے پی ایچ ڈی کی۔ انھوں نے 139 ریسرچ پیپرز اور 13 کتابیں شائع کیں۔ انھیں 1984 میں پروفیسر ایمریٹس بنایا گیا۔ ان کا انتقال 9 نومبر 2007 کو ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 دسمبر 2017

کمپیوٹر کے ذریعے اردو زبان کی ترقی

نجیب آباد: کمپیوٹر کے ذریعے اردو زبان کی ترقی پر منعقد سمینار میں مقررین نے کہا کہ اردو زبان ایک شیریں زبان ہے جس کی مٹھاس اور خوشبو دور دور تک پھیلی ہے۔

محلہ حویلی تلی میں واقع آزاد پبلک اسکول میں صبح انسٹی ٹیوٹ آف ایسوی ایشن کے زیر اہتمام منعقد سمینار کا آغاز مفتی اویس کی تلاوت کلام اللہ سے کیا گیا۔ مہمان خصوصی سابق چیئرمین معظم خان نے کہا کہ اردو کسی ایک شخص یا ایک فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ جو بھی اردو بولتا ہے یہ اسی کی زبان بن جاتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان کو بولنے لکھنے پڑھنے پر زور دیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر آفتاب نعمانی نے کہا کہ کمپیوٹر کے آنے سے اردو زبان کو مزید ترقی ملی ہے۔ کمپیوٹر کے ذریعے اردو میں کسی بھی خبر کو دور دور تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اردو انٹرنیٹ کے ذریعے کسی بھی زبان سے پیچھے نہیں رہ گئی ہے۔ حافظ رئیس کی صدارت اور ماسٹر شبیر حسین عرفی کی نظامت میں منعقد سمینار کو مہتاب خان چاند، ڈاکٹر الیاس، چاندنی عباس، عابد رشید، شکیل رضا، ڈاکٹر سمینہ، ڈاکٹر شمیم، محمد جاوید وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 دسمبر 2017

بہار:

اردو زبان گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار

موتیہاری: ماہر لسانیات اگر زبانوں کی شیرینی، جاذبیت اور کشش پر بحث کریں اور اس کی فہرست مرتب کریں تو یقینی طور پر اردو زبان کو نمایاں مقام حاصل ہوگا، لیکن گزشتہ کچھ سالوں سے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار اردو زبان دم توڑ رہی ہے اور اسے حاشیہ پر ڈھکیلنے کی بے جا باتیں کی جا رہی ہیں جو بالکل ہی بے سود ہے۔ یہ باتیں موتیہاری کے ٹاؤن ہال میں منعقد اردو سیل موتیہاری کے زیر اہتمام فروغ اردو سمینار اور مشاعرے کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سینئر اے ڈی ایم مشتاق احمد نے کہیں۔ اس موقعے پر ایم ایس کالج، شعبہ انگریزی کے پروفیسر اقبال حسین نے کہا کہ اردو زبان کی بقا اور ترویج سرکار یا آئین کے ذریعے نہیں بلکہ اس کے چاہنے والوں کے ذریعے ہو رہی ہے۔ فرحت پروین نے عوامی سطح پر اردو زبان کے فروغ میں درپیش۔ مسائل اور ان کا حل کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کا افتتاح زکٹیا کے ایم ایل اے ڈاکٹر شمیم احمد، اے ڈی ایم ارشد علی، سینئر ڈپٹی کلکٹر محمد مشتاق احمد، ضلع تعلیمی افسر افتخار احمد نے شمع روشن کر کے مشترکہ طور پر کیا۔ پروگرام دو نشستوں میں منعقد کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2017

فروغ اردو سمینار

سمستی پور: اردو جیسی شیریں زبان کہیں نہیں ملتی۔ اس زبان میں جو نفاست ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ کسی زبان کے زندہ رہنے کے لیے اس کا تعلق عوام سے ہونا ضروری ہے۔ یہ باتیں ضلع مجسٹریٹ پرنو کمار نے شہر کے ٹاؤن ہال میں اردو سیل کی جانب سے منعقد فروغ اردو سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف سالانہ سمینار کرا لینے سے اردو زبان کی ترقی ممکن نہیں ہے، اس کے لیے زمینی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ضلع انتظامیہ سمیت ریاستی حکومت ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کے فروغ کے لیے سنجیدہ ہے۔ اس کے فروغ کے لیے تمام محبان اردو آگے آئیں اور ضلع انتظامیہ کو مشورہ دیں کہ کس طرح اس زبان کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچایا جائے۔ ضلع مجسٹریٹ نے مزید کہا کہ آج سرکاری سطح پر اس زبان کی جو ترقی ہونی چاہیے تھے وہ نہیں ہوئی ہے، اس کا احساس ضلع انتظامیہ کو ہے، اس کمی کو کس طرح دور کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اردو والے کے ہی یہاں یہ شیریں زبان کسی گوشہ میں پڑی سسک رہی ہے۔ اردو کی روٹی کھانے والے ہی اردو سے انحراف کر رہے ہیں۔ اگر اس زبان کو بچانا ہے تو اپنے گھروں میں اردو زبان کو رائج کریں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2017

خدابخش لائبریری میں ہندومت کے نادر قدیم مخطوطات کی نمائش

پٹنہ: خدابخش لائبریری میں 31 دسمبر کو محفوظ ہندومت سے متعلق نادر مخطوطات کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش کا افتتاح مشہور مورخ ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی نے کیا۔ ڈاکٹر اوم پرکاش نے کہا کہ 26-25 برس کی عمر سے ہی مجھے اس لائبریری کی ہر اینٹ سے محبت ہوگئی تھی اور عمر کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کی نمائش سے سماج میں ہم آہنگی کی فضا بنتی ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ خدابخش لائبریری میں مختلف موضوعات پر متعدد مخطوطات نادر اور بیش قیمتی ہیں۔ اس لائبریری میں جہاں اسلامی اور ہندوستانی علم و ثقافت کا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے، وہیں ہندومت سے متعلق متعدد قیمتی قلمی نسخے موجود ہیں۔ ہندومت سے متعلق ایک سو سے زائد نادر اور قیمتی مخطوطات اس لائبریری کی شان بڑھا رہے ہیں۔ یہ قلمی نسخے فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی زبانوں میں ہیں۔ فارسی زبان میں 69 مخطوطات ہندومت پر ہیں۔ اپنشد، وید، رامائن، مہابھارت، گیتا وغیرہ ہندومت کی اہم کتابیں جو فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی ہیں، اس لائبریری میں موجود ہیں، جن پر مغل بادشاہوں نے خصوصی توجہ دی۔ داراشکوہ، ابوالفضل اور فیضی نے ہندومت کی متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ خدابخش لائبریری میں محفوظ 69 مخطوطات میں کتابت کے اعتبار سے سب سے قدیم 'گیتا' کا وہ نسخہ ہے جو شاہ جہاں بادشاہ کے عہد حکومت میں 1635 میں لکھا گیا۔ اردو زبان میں 16 مخطوطات ہندومت پر ہیں۔ ان میں کتابت کے اعتبار سے سب سے قدیم بھگوت پران از بھوپت ہے جس کی کتابت مولراج نے 1748 میں کی۔ ہندی اور سنسکرت میں 36 مخطوطات موجود ہیں۔ ان میں کتابت کے اعتبار سے سب سے قدیم شری رامائن کا وہ نسخہ ہے جسے گیا دین نے 1778 میں لکھا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 جنوری 2017

خدابخش لائبریری میں ہندومت کے نادر قدیم مخطوطات کی نمائش

قرۃ العین حیدر کا فکر و فن

پٹنہ: قرۃ العین حیدر اردو فکشن میں اقوام عالم کی تہذیب و ثقافت کی بہترین نمائندہ ہیں۔ انھوں نے اپنے فکشن میں ایک نئی زبان ایجاد کرنے میں کامیابی حاصل کی اور فکری اعتبار سے اپنی چیزوں کو اپنے فکشن کا حصہ بنایا۔ انھوں نے اپنے وقت کے بڑے مسائل کا آزادانہ طور پر احتساب کیا۔ قرۃ العین حیدر کے فکر و فن اور ان کی شخصیت کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف ادیب و نقاد ڈاکٹر صفدر امام قادری نے اپنے کلیدی خطبہ میں یہ باتیں کہیں۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے مشترکہ تہذیب اور رواداری کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں جس مشترکہ کلچر اور تہذیب کی مٹتی ہوئی قدروں کا ذکر کیا تھا ہمیں آج اس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے قرۃ العین حیدر کے افسانے پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے افسانہ نویسی کے ذریعے ہندوستان کی تہذیبی دھاراؤں کے مربوط تسلسل کو اپنی تحریروں میں قید کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ڈاکٹر واحد نظیر نے قرۃ العین حیدر کے خاکے کے حوالے سے کہا کہ زیادہ تر اردو ادیب و شاعر مفکر نہیں ہیں اور ان میں سے زیادہ تر مغرب پرست ہیں۔ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین نے کہا کہ اردو کے مایہ ناز فکشن نگاروں میں قرۃ العین حیدر کی اپنی ایک خاص پہچان ہے، مگر وہ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ معروف شاعر اور نقاد پروفیسر علیم اللہ حالی نے قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کے حوالے سے اہم گفتگو کی۔ مشہور افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ عینی آپا نے اپنی تخلیقات میں سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کو بھی شامل کیا مگر وہ اپنی انا کا شکار تھیں اور انھوں نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کو خود سے کمتر سمجھا۔ معروف افسانہ نگار شوکت حیات نے قرۃ العین حیدر سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا۔ سمینار کے افتتاحی سیشن میں افشاں بانو، سید حامد رضا، شبیہ راحت وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی۔ اس میں نسیم احمد نسیم، فیروز انصاری، ڈاکٹر نوشاد عالم ڈاکٹر محمد ذاکر حسین اور مشتاق صدف نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 دسمبر 2017

معاشی اعتبار سے کمزور طلبہ کو روزگار سے جوڑ رہا ہے این سی پی یو ایل

پٹنہ: این سی پی یو ایل کا کمپیوٹر سینٹر معاشی اعتبار سے کمزور طلبہ کو روزگار سے جوڑنے کا بڑا سبب بن گیا ہے۔

پٹنہ کے بہار اردو اکیڈمی میں این سی پی یو ایل کے سینٹر نے اپنے معیار کو کافی بلند رکھا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہاں سے تکنیکی تعلیم حاصل کر کے غریب طلبہ نہ صرف روزگار سے وابستہ ہو رہے ہیں، بلکہ اپنے اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی یہاں کی تعلیم کو ضرور مانتے ہیں۔ تقریباً 18 سال پہلے بہار اردو اکیڈمی میں شروع کیے گئے این سی پی یو ایل کے اس

سینٹر سے اب تک سیکڑوں طلبہ نے تکنیکی تعلیم حاصل کی ہے اور انھیں روزگار سے جڑنے کا موقع ملا ہے۔ یہاں ایک سالہ کمپیوٹر ڈپلومہ کورس میں طلبہ کو تمام بنیادی باتوں کی جانکاری دینے کے ساتھ ساتھ اساتذہ ایک بہتر ماحول بھی فراہم کرتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ یہاں سے تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ کے روزگار کے لیے اکادمی بھی اپنی سطح پر کوشش کرتی ہے، جس کے نتیجے کے طور پر کافی طلبہ پٹنہ سمیت دہلی، لکھنؤ اور بیرونی ممالک میں روزگار سے جڑے ہیں۔ سینٹر سپروائزر محمد جمال الدین کا کہنا ہے کہ غریب طلبہ کے خوابوں کو پورا کر رہا این سی پی یو ایل کا یہ سینٹر کافی کم پیسہ میں انھیں تکنیکی تعلیم مکمل کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ طالب علموں کے مطابق ایک سال کے کورس کے لیے دوسرے اداروں میں کافی پیسہ لیا جاتا ہے جبکہ این سی پی یو ایل کے اس سینٹر میں معمولی رقم سے بھی انھیں وہ تمام سہولتیں دستیاب کرادی جاتی ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 15 دسمبر 2017

تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت

بتیا/مغربی چمپارن: ہر قوم کی ترقی کا انحصار اس کی تعلیم پر ہوتا ہے۔ تعلیم ہی انسان کے احساس وشعور کو نکھارتی ہے اور نئی نسل کو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتی ہے۔ تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو تخلیق انسانی کے ظہور سے شروع ہوا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت سیدنا آدم کو تمام مفید انسانی علوم عطا کیے اور پھر یہ علوم رفتہ رفتہ نسل انسانی میں منتقل ہوتے رہے۔ ان خیالات کا اظہار قاضی نثار احمد قاسمی نے اردو گرلس ہائی اسکول امام باڑہ میں تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت کے عنوان سے منعقد ایک تقریب کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ دین اسلام نے واضح طور پر یہ بتادیا ہے کہ مرد اور عورت کی تخلیقی بنیاد ایک ہے۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی فضیلت انسانی کا ذکر آیا ہے اس میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔ تقویٰ اور آخرت کی فلاح کا معیار جو مرد کے لیے مقرر کیا ہے وہی عورت کے لیے بھی ہے۔ انوار میموریل فاؤنڈیشن کے سکریٹری سید جمیل انور نے کہا کہ موجودہ دور میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی تعلیم پر بھی توجہ دینی چاہیے کیونکہ جس قوم کی بیٹی پڑھی لکھی ہوتی ہے اس قوم کی اخلاقی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہوتی ہیں۔ انوار میموریل فاؤنڈیشن کے صدر محمد داؤد نے کہا کہ تعلیم کا مقصد صرف نوجوان نسل کی علمی پیاس بجھانا ہی نہیں ہے بلکہ ان میں اخلاق کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا احساس بھی پیدا کرنا ہے تاکہ وہ علم کی روشنی میں نیک و بد، صحیح و غلط کی تمیز پیدا کرسکیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 دسمبر 2017

کلیم الدین احمد کی یادگاری تقریب

کلیم الدین احمد یادگاری تقریب

پٹنہ: پروفیسر کلیم الدین احمد کی سخت گیری اور برتر ادبی حیثیت کی نفی کی وجہ سے جو ہنگامہ آرائی شروع ہوئی وہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، مگر اس کے باوجود اردو ادب اور اردو دنیا میں وہ امتیازی شناخت کے حامل ہیں۔ بدھ کو محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام کلیم الدین یادگاری تقریب سے اپنے خطاب میں پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر جاوید حیات نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ کلیم الدین احمد نے شاعری اور تنقید نگاری میں جو عبارت درج کی اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔ مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو ادب میں ایک نئی فکر کے ساتھ سامنے آئے۔ تنقید کرتے وقت انھوں نے تہذیبی پس منظر کو اہمیت نہیں دی تھی، اس کے باوجود انگریزی ادب کے تنقیدی اصولوں سے انھوں نے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ راشد احمد نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کلیم الدین احمد اردو کے جید نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں مغرب زدگی کے ساتھ مشرقی قدروں کا بھی زبردست ادراک ہے۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس سے قبل اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کلیم الدین احمد کا مختصر تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر دیگر مقالہ نگاروں نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر محمد اسلم جاوداں نے کی جبکہ صدارت سابق پرو وی سی مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی پروفیسر توقیر عالم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 دسمبر 2017

تلنگانہ

یومِ یادگارِ غالب

حیدر آباد: ایوانِ غزل ہنمکنڈہ ورنگل (تلنگانہ) کے زیر اہتمام 31 دسمبر 'یوم یادگار غالب' کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر بہادر علی موظف پرنسپل اسلامیہ کالج، جناب محمد عبدالوحید گلشن سینئر صحافی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد بہادر علی موظف پرنسپل اسلامیہ کالج نے مخاطب کرتے ہوئے غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں۔ ان کے شاعرانہ خطوط اور مزاج سے متعلق کافی اہم باتیں بتائیں۔ انھوں نے غالب کی زندگی کے کئی ایک پہلوؤں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔ سینئر صحافی جناب وحید گلشن نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مرزا غالب کی زندگی مصائب سے پر رہی۔ غالب کی شخصیت مشکل دور میں پروان چڑھی۔ انھوں نے کہا کہ غالب کی شاعری کو سمجھنا ایک مشکل امر ہے۔ وحید گلشن نے اس موقعے پر غالب کی زمین پر لکھی ہوئی تازہ غزل کو ترنم کے ساتھ پڑھ کر شرکا سے خوب داد تحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر عزیز احمد عرسی موظف پرنسپل اسلامیہ کالج ورنگل نے کہا کہ غالب کی شخصیت بیک وقت آدمیت اور انسانیت کے عناصر سے مالا مال تھی۔ دکھوں، شدت احساس اور حالات کے جبر سے محفوظ رہنے کا ان کا اپنا طریقہ تھا اور یہ زندگی سے فرار نہیں بلکہ ان کا سامنا کرنے کے لیے تھا۔

روزنامہ 'قاصد' 1 جنوری 2018

اعزاز و اکرام

اردو میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بیگ احساس اور ترجمہ ایوارڈ محمود احمد سحر کو

نئی دھلی: اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ادیب پروفیسر بیگ احساس کو ان کے افسانوی مجموعہ 'دخمہ' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2017 دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اکادمی کے صدر

پروفیسر وشوناتھ پرساد تیواری کی صدارت میں ہوئی۔ ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگ کے دوران ہندوستان کی 24 زبانوں کے ادیب و شاعروں کو ان کی تصنیفات پر

مولانا جوہر کی یوم پیدائش پر تقسیم ایوارڈ

ایوارڈ دیے جانے کے فیصلے کو منظوری دی گئی۔ اس کے بعد ایک پریس کانفرنس کے دوران سکریٹری، ساہتیہ اکادمی، ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے سبھی زبانوں کے انعامات کا اعلان کیا۔ اردو میں یہ ایوارڈ پروفیسر بیگ احساس کو دیا جائے گا۔ اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں پروفیسر بیگ احساس ایک نمایاں نام ہے۔ فن افسانہ نگاری پر ان کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ افسانوی مجموعہ 'دخمہ' سے قبل ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2017 کا بھی اعلان کیا گیا۔ اردو کے لیے محمود احمد سحر کو 'کالیداس کی عظیم شاعری میگھ دوت' کے منظوم ترجمے کے لیے یہ انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اجین، مدھیہ پردیش کے رہنے والے 80 سالہ کہنہ مشق ادیب و شاعر اور مترجم محمود احمد سحر نے 'میگھ دوت' کے علاوہ کالیداس کی تصنیفات رتو سنہار، کمار سمبھو کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے بھرتر ہری کی سنسکرت شاعری 'سنگار شتک' کا بھی سنسکرت سے براہ راست اردو منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ایک لاکھ روپے اور امتیازی نشان جبکہ ترجمہ ایوارڈ 50 ہزار روپے اور امتیازی نشان پر مشتمل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 دسمبر 2017

مولانا جوہر کے یوم پیدائش پر تقسیم ایوارڈ

نئی دہلی: مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کے 139 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر تقسیم ایوارڈ کا 29 ویں سالانہ جلسے میں مہمان خصوصی کے طور پر معروف ادیب و سابق ایم پی پدم شری پروفیسر لوکیش چندر نے مولانا محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی کے شانہ بہ شانہ چلنے والے مولانا محمد علی جوہر نے جو قربانی ملک کے لیے دی ہے وہ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے بی ایس عبدالرحمٰن آڈیٹوریم میں منعقدہ پروگرام میں مہمان ذی وقار کے طور پر ہمالیہ ڈرگس کے سربراہ ڈاکٹر سید فاروق، آئی آئی سی سی کے سرپرست سراج الدین قریشی، الحرمین فارمیسی کے چیئرمین صبور احمد صدیقی نے شرکت کی۔ مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی (رجسٹرڈ) اور ریکس ریمیڈیز کے اشتراک سے پروگرام منعقد ہوا۔ اس موقعے پر رکن پارلیمنٹ سید طارق انور نے صدارت کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ جو قوم اپنے اسلاف کو یاد کرتی ہیں وہ ہمیشہ کامیاب ہوتی ہیں۔ اس موقعے پر رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر ادت راج، پروفیسر رتن لال ہانگلو، محمد شفیع پنڈت (سابق آئی اے ایس)، پروفیسر قسیم حنفی، ڈاکٹر راشد اللہ خان، پروفیسر عاصم علی خان، سہیل انجم، صاحب زادہ ڈاکٹر محمد نجم الدین کو 'مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ' دیا گیا۔ حمیرہ احمد کو 'بی اماں ایوارڈ' دیا گیا جبکہ 'ایم سلیم میموریل ایوارڈ' ٹی وی صحافی عارفہ خانم شیروانی کو دیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 دسمبر 2017

سینئر صحافی عابد انور کو ایکسیلنس ایوارڈ

نئی دہلی: یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (اردو سروس) کے سینئر صحافی عابد انور کو ان کی لائق ستائش صحافتی سرگرمیوں کے اعتراف میں آل انڈیا مسلم ایڈووکیٹ فورم فار جسٹس کی طرف سے پرنٹ میڈیا ایکسیلنس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مشہور وکیل، اٹارنی سولیسٹر اور آل انڈیا مسلم ایڈووکیٹس فورم فار جسٹس کے سکریٹری جنرل سرفراز احمد صدیقی کی زیر صدارت مسلم ایڈووکیٹس فورم کا ایک اہم اجلاس، 'بار کونسل کا کردار اور ذمہ داری' کے عنوان سے منعقد کیا گیا، جس میں مختلف شعبوں میں امتیازی خدمات انجام دینے والے اداروں اور شخصیات کو اعزازات پیش کیے گئے، جن میں اردو صحافت کے شعبے میں قابل قدر خدمات انجام دینے کے لیے یو این آئی کے سینئر صحافی اور مشہور کالم نگار عابد انور کو پرنٹ میڈیا ایکسیلنس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی صحافتی کاوشوں کے اعتراف میں اس سے پہلے انھیں بہار اردو اکیڈمی کی طرف سے بہترین صحافی کے 'غلام سرور ایوارڈ' سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 دسمبر 2017

پروفیسر طلعت احمد ممتاز وی سی ایوارڈ سے سرفراز

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منظم ساتویں بین الاقوامی انسانی حقوق کے اعزاز تقریب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد کو ممتاز اور کامیاب وائس چانسلر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ پروفیسر احمد کو یہ اعزاز بہت متاثر کن اور بے مثال قیادت اور امن کے فروغ دینے کی خدمت کے لیے دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ پروفیسر طلعت احمد نے جامعہ وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد جامعہ کو اعلیٰ مقام تک لے جانے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے سماج کو امن شانتی اور تعلیم کا پیغام دینے کے لیے بھی نمایاں خدمات انجام دے ہیں۔ یاد رہے کہ دسمبر کو ہر سال انسانی حقوق لبرٹیوں اور سوشل جسٹس کے آل انڈیا کونسل بین الاقوامی انسانی حقوق کے دن ان افراد کی عزت کرتا ہے جو انسانی حقوق، امن اور باہمی ورثہ کو فروغ دینے میں بہترین کام کرتے ہیں۔ اس سال کونسل نے ان اختتامی تقریبات کو ایمنسٹی ورلڈ وائز تحریک، نیشنل کونسل آف نیوز اور براڈ کاسٹنگ اور ایشیائی انسانی حقوق کونسل کے اشتراک سے یہ پروگرام منعقد کیا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 دسمبر 2017

ڈاکٹر شمس کمال انجم کو 'ممتاز محقق ایوارڈ'

نئی دہلی: بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری جموں و کشمیر ریسرچ و تحقیق کے فروغ کے لیے و اساتذہ کی

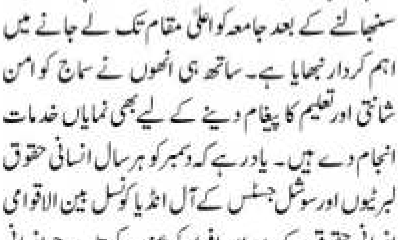

حوصلہ افزائی کے پیش نظر ہر سال 'ممتاز محقق ایوارڈ' دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ادبیات، سوشل سائنس اور مینجمنٹ زمرے کا سب سے پہلا 'ممتاز محقق ایوارڈ برائے 2017' مشہور و معروف عربی و اردو اسکالر صدر شعبۂ عربی، اردو اور اسلامک اسٹڈیز ڈاکٹر شمس کمال انجم کو یونیورسٹی کے چودھویں یوم تاسیس کے موقعے پر آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں ریاست کے کابینی وزیر جناب نعیم اختر، شیخ الجامعہ جناب پروفیسر جاوید مسرت، رجسٹرار اور ڈین اکیڈمک افیئرس پروفیسر اقبال پرویز، ڈین اسٹوڈنٹ پروفیسر ایم اصغر اور ایم ایل اے

راجوری جناب قمرحسین چودھری کے ہاتھوں تفویض کیا۔ واضح ہو کہ یہ ایوارڈ سند، ٹرافی اور دو لاکھ روپے بطور ریسرچ گرانٹ پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم کا نام عرب وعجم کے علمی و ادبی حلقے میں محتاج تعارف نہیں۔ آپ ایک شاعر، ادیب اور محقق کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ آپ نے عربی کی بڑی وقیع اور اہم کتابوں کو اردو کا جامہ پہنا کر اردو والوں کو عربی کے عظیم ادبیات سے براہِ راست استفادے کا موقع فراہم کیا ہے۔ آپ کی دو درجن سے زائد تالیفات وتصنیفات و تراجم اور ایک سو سے زائد علمی و ادبی مضامین کے علاوہ 'جدید عربی ادب، جدید عربی شاعری، عربی نثر کا فنی ارتقا' عربی تنقید کا سفر، تاریخ ادب عربی، بلاغت قرآن کریم حدیث عرب وعجم اور تاریخ مدینہ منورہ' نامی کتابوں کو اردو حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہو چکی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 دسمبر 2017

باسط قادری کو بیسٹ جرنلسٹ ایوارڈ

حیدرآباد: تلنگانہ حکومت نے شعبہ صحافت میں نمایاں خدمات پر شہر حیدرآباد کے سرکردہ صحافی سید باسط محی الدین علی (باسط قادری) کو بیسٹ جرنلسٹ ایوارڈ پیش کیا۔ محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ کے دفتر میں منعقدہ تقریب میں تلنگانہ اسٹیٹ میڈیا اکیڈمی کے چیئرمین الم نارائنا اور کمشنر محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ نوین متل نے صحافیوں کو 3 سال کے ایوارڈس پیش کیے جن میں بیسٹ جرنلسٹ کے طور پر باسط قادری کو یہ ایوارڈ دیا گیا۔ ان کو سند کے علاوہ رقم اور مومنٹو بھی پیش کیا گیا۔ باسط محی الدین علی، شہر حیدرآباد کے اردو روزنامہ اعتماد کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں اور سرکردہ صحافیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 دسمبر 2017

زاہد آزاد جھنڈانگری میر تقی میر ایوارڈ سے سرفراز

کرشنا نگر: نیپال کی معروف سنگھیا سماجوادی فورم نیپال کے 'اُپیندر یادو' سابق نائب وزیراعظم کے ہاتھوں سے صدر انجمن ارتقائے اردو ادب نیپال زاہد آزاد جھنڈانگری کی جانب سے ایک تقریب میں 'میر تقی میر' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام میں معروف افراد نے شرکت کی، سرگرم نوجوان نیتا اکرم عبدالرحمن خان کی تنظیم کی جانب سے یہ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ صدر انجمن نے دلی شکریہ ادا کیا ہے۔

پریس ریلیز: اسامہ اکرم، کرشنانگر، بڑھنی، 1 دسمبر 2017

مولوی عبدالحق ایوارڈ

دیوبند: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن ضلع مظفر نگر کے صدر کلیم تیاگی اور اردو مترجم راجیہ کرمچاری سنگھ کے نائب

صوبائی صدر تحسین علی کو مظفر نگر کی ایک پروقار تقریب میں ان کی اردو خدمات پر 'بابائے اردو مولوی عبدالحق' ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اس موقع پر ان کو متعدد ادبی و سماجی تنظیموں کی جانب سے انھیں مبارک باد پیش کی گئی۔ واضح ہو کہ گذشتہ 24 نومبر کو اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن مظفر نگر کی جانب سے منعقد اردو خوشخطی مقابلہ کے پروگرام میں کلیم تیاگی اور تحسین علی کو ان کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 27 دسمبر 2017

صحافی محمد مصطفی کو اعزاز

نئی دہلی: پرواز یوتھ فاؤنڈیشن (این جی او) کے زیراہتمام 25 دسمبر 2017 کو اردو ادب انعامات تقریب

2017 کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو کاز کے لیے کام کرنے والے لوگوں کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس تقریب میں روزنامہ ملاپ کے نیوز ایڈیٹر اور سینئر صحافی محمد مصطفی انصاری کو دلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر پرویز میاں اور مشہور سماجی کارکن ڈاکٹر فہیم بیگ کے ہاتھوں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر پرویز میاں نے اس موقع پر کہا کہ اردو ایک میٹھی زبان ہے، اس کی ترویج و اشاعت کے لیے ہمیں متحد ہو کر کام کرنا چاہیے۔ دوسری طرف کرشنا نگر ودھان سبھا حلقہ کے سرکاری اسکولوں میں اردو پڑھنے والے 150 سے زائد طلبا و طالبات کو اچھے نمبرات لانے پر انعام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس موقع پر کونڈلی وارڈ کے کونسلر دیپک ملہوترہ، ممبر اسمبلی ایس کے بگا، سابق کونسلر عشرت جہاں، ڈاکٹر فہیم بیگ، ڈاکٹر پرویز میاں نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور پرواز یوتھ فاؤنڈیشن کے چیئرمین فرقان انصاری اور ان کی ٹیم کی اردو کے تئیں خدمات کو سراہا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، 26 دسمبر 2017

اجرا:

ظہورِ غزل

دیوبند: انسانی حقوق ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے زیراہتمام رامپور منیہاران، سہارنپور میں ڈاکٹر ظہور احمد ظہور کے شعری مجموعہ 'ظہور غزل' کا رسم اجرا بدست عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی عمل میں آیا۔ اس

موقع پر چار مقالہ نگاروں نے ظہور غزل شعری مجموعے کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عالمی شہرت یافتہ مشہور معروف شاعر واتر پردیش اردو اکادمی کے سابق صدر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ یہ خوش آئند بات ہے کہ ظہور احمد ایسی جگہ پر شاعری کے پودوں کی آبپاشی کر رہے ہیں جہاں سازگار ادبی ماحول کا فقدان ہے۔ تاہم ان کی ادبی کاوش لائق تحسین ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی شاعری میں ایسے اوصاف موجزن ہیں جو جمہور کے دل و دماغ پر تادیر اپنے اثرات چھوڑتے ہیں۔ مہمان خصوصی زیڈ۔ اختر مدیر 'جہاں نما' نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 دسمبر 2017

چند مایہ ناز اسلاف

کاندھلہ: اپنے اسلاف اور ورثے سے ناواقف قوم قصہ پارینہ ہو جایا کرتی ہے، اس کی تہذیب اور تمدن بھی گزرے زمانہ کی چیزیں ہوتی ہیں، جبکہ ماضی سے رشتہ جوڑنے والی اقوام زندہ دل ہوا کرتی ہیں، یہ قومیں ماضی سے سبق حاصل کر کے کوتاہیوں اور خامیوں کا ازالہ کر کے مستقبل کے لیے ٹھوس لائحہ عمل تیار کیا کرتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار 'چند مایہ ناز اسلاف' نامی کتاب کے اجرا کے موقع پر وفاق المساجد کے صدر مولانا محمد عارف قاسمی نے کیا۔ قابل ذکر ہے کہ مولانا مفتی مسعود عزیزی ندوی کی تصنیف کردہ 534 صفحات پر مشتمل اس کتاب پر ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم اعلیٰ مولانا رابع حسنی ندوی کا مقدمہ اور مولانا سعید الرحمن (کنیڈا) کا پیش لفظ ہے جس

میں حضرت عمر بن عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر جیلانی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، خواجہ سائیں توکل شاہ انبالوی، مولانا محمد اسماعیل جھنجھانوی، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مولانا عبدالباری ندوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، مولانا قاری محمد طیب، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور شیخ الحدیث مولانا مولانا محمد یونس سمیت گزشتہ اور رواں صدی کے 42 ممتاز اہل علم اور عبقری شخصیات کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 دسمبر 2017

دبستانِ بجنور دوم

نئی دہلی: دبستانِ بجنور ڈاکٹر شیخ نگینوی کا تاریخی کارنامہ ہے۔ جس کو علمی حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے

دیکھا جاتا رہے گا۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کیا۔ وہ دبستانِ بجنور کی دوسری جلد کا اجرا کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ضلع بجنور مغربی اتر پردیش کا ایک مردم خیز خطہ ہے جہاں مصحفی اور قائم چاند پوری سے لے کر ڈپٹی نذیر احمد، اختر الایمان اور نشتر خانقاہی جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں کے علاوہ متعدد علمی، دینی، ادبی، ثقافتی وصحافتی شخصیات نے اپنی صلاحیتوں کے پرچم لہرائے ہیں۔ کئی بڑے سائنس داں، موجد اور مورخ اس خطے کی پیداوار ہیں، دبستان بجنور میں تمام نئے اور پرانے چراغوں کی روشنی ہے۔ قومی کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر شمس اقبال نے ڈاکٹر شیخ نگینوی کو دبستانِ بجنور کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ مذکورہ کتاب میں جس قدر معلومات فراہم کرائی گئی ہے وہ واقعتاً بجنور کے دبستان ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ معروف نقاد حقانی القاسمی نے کہا کہ آج کے عہد میں علاقائی ادبی تاریخ مرتب کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی نے دبستان بجنور تحریر کرکے ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ آنے والے وقت میں ایسی ہی کتابوں سے اردو ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ لکھی جاسکے گی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 8 دسمبر 2017

احساسات

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول گڑھی پیر خاں، ٹھاکر گنج میں سید اولاد علی رضوی ساقی لکھنوی مرحوم کے شعری مجموعہ کلام 'احساسات' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس کتاب کو ان کی بھتیجی محترمہ

شمیم حیدری نے مرتب کیا ہے۔ تقریب کی صدارت معروف شاعر و سابق چیئرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی نہال رضوی نے کی جبکہ بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر ظفر حیدری چیف ایڈیٹر 'حکیم الامت' کشمیر اور بحیثیت مہمان اعزازی انجینئر تیرہ حسین وصوفی سید اظہار علی سجادہ درگاہ شاہ عبدالرحمٰن شریک ہوئے۔ مہمانوں کا استقبال ڈاکٹر منصور حسن خاں، تعارف ڈاکٹر ثروت تقی، اظہار تشکر محمد کلیم خاں اور نظامت شکیل گیاوی نے کی۔ تقریب کا آغاز مسعود احمد نے ساقی لکھنوی کی غزل سے کیا۔ جن شعرا نے اپنے کلام پیش کیے ان میں نہال رضوی، سید آل ہاشم رضوی، ڈاکٹر ہارون رشید قمر سیتاپوری، رفعت شیدا صدیقی، محمد رضا لکھنوی، احسن اعظمی، ڈاکٹر منصور حسن خاں، شکیل گیاوی، عارف محمود آبادی اور سرور مظفر پوری تھے۔ اس موقع پر صدر عالی وقار نے کہا کہ اس طرح کی رسم اجرا کی محفلیں نہ صرف کتاب کے فروغ کا ذریعہ ہیں بلکہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا وسیلہ بھی ہیں۔ سید اولاد علی کی کتاب ان کی وفات کے کافی عرصے کے بعد منظر پر آئی ہے اس کے لیے شمیم حیدر صاحبہ قابل ستائش ہیں۔ ڈاکٹر ظفر حیدر نے اردو زبان کے فروغ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں اردو پہلی زبان کی حیثیت سے بولی لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 دسمبر 2017

'صفدر، تخلیقی وتنقیدی جہتیں' جشن رونمائی

ورود: 'جدیدیت کی تحریک کے تحت ودربھ میں ابھرنے والے شاعروں اور ادیبوں میں صفدر ایک اہم نام ہے۔ ان کی تصانیف جدید شعری تنقید، شاعری وشیوۂ پیغمبری اور بے آمیز نے انھیں تنقیدی ادب میں شناخت عطا کی اور اردو کے صف اول کے ناقدین نے ان کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ جدید شاعر کی حیثیت سے بھی ادب میں ان کو اہم مقام

حاصل ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر میر اظہر علی نے شاہد رشید کی مرتبہ کتاب صفدر، تخلیقی وتنقیدی جہتیں، کے جشن رونمائی کے موقعے پر اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔

ودربھ کے ضلع امراوتی میں واقع قصبہ ورود میں عالمگیر ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب میں شاہد رشید نے کہا: صفدر علاقہ برار کے پہلے تنقید نگار بھی ہیں اور پہلے جدید شاعر بھی ان کی نگارشات، شب خون، تحریک، شاعر، آہنگ، جواز اور اوراق جیسے رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ معروف انشائیہ نگار محمد اسد اللہ نے قصبہ ورود میں ڈاکٹر صفدر کی تدریسی اور سماجی خدمات کے علاوہ بحیثیت ناقد، شاعر اور انشائیہ نگار ان کے ادبی کارناموں کا ذکر کیا۔ جدید شاعر عارج میر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس قصبے میں ڈاکٹر صفدر نے نہ صرف ادب تخلیق کیا بلکہ نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں کی رہنمائی کی اور سخنوروں کے لیے مشہور اس بستی کو ادب کی دنیا میں بھی پہچان دلائی۔ واضح رہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کے تعاون سے منظر عام پر آئی ہے۔ ڈاکٹر صفدر نے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، اپنے تخلیقی سفر اور اس علاقے کی تعلیمی وادبی فضا سے متعلق خیالات پیش کیے۔

پریس ریلیز: عارج میر، رکن عالمگیر ایجوکیشن سوسائٹی، مہاراشٹر، 28 دسمبر 2017

وفیات:

شعیب مرزا

نئی دہلی: دہلی کی ادبی محفلوں میں بہترین شاعر کے طور پر شناخت رکھنے والے شعیب مرزا کا 15 دسمبر 2017 کو دل کا دورہ پڑ جانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 50

برس کے تھے اور خوش اخلاق شخصیت کے مالک تھے۔ ہفت روزہ تصویر وطن کے ایڈیٹر کے طور پر صحافتی خدمات پیش کرنے والے شعیب مرزا مرحوم کی تدفین ان کے آبائی وطن شیرکوٹ ضلع بجنور میں کی گئی۔ ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی دہلی

کے ادبی حلقے میں بے چینی اور غم کی لہر دوڑ گئی جس میں لوگوں نے اس انتقال کو نا قابل برداشت خسارہ قرار دیا۔ معین شاداب نے کہا کہ مرحوم ایک بہترین انسان تھے اور مشاعروں کی دنیا میں قابل قدر نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ بزرگ شاعر ابرار کرت پوری، سید راشد حامدی، اعجاز انصاری، عرفان احمد اور قاری یعقوب نے بھی اظہار تعزیت کیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 دسمبر 2017

سینئر صحافی احتشام قریشی

نئی دہلی: انگریزی اور اردو کے بزرگ صحافی احتشام قریشی کا طویل علالت کے بعد 21 دسمبر 2017 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ ان کی اہلیہ کئی برس قبل انتقال کر گئی تھیں۔ انگریزی روزنامہ 'ہندوستان ٹائمز' سے طویل وابستگی کے دوران انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ کئی برس تک بھوپال میں 'ہندوستان ٹائمز' کے بیورو چیف بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ دہلی واپس آگئے اور کئی برس تک حیدرآباد کے روزنامہ 'سیاست' کے لیے کالم لکھتے رہے۔ انھیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ احتشام قریشی مشرقی دہلی کی ہاؤسنگ سوسائٹی تاج انکلیو میں مقیم تھے، جہاں ظہر بعد ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 22 دسمبر 2017

چیف فوٹو گرافر سید فدا علی

نئی دہلی: مقبول عام روزنامہ 'صحافت' کے چیف فوٹو گرافر حاجی سید فدا علی کا 24 دسمبر 2017 کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 78 برس تھی۔ پسماندگان میں تین بیٹے ہیں۔ مرحوم کی تدفین بعد

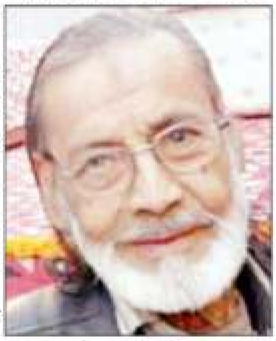

مغرب مشرقی دہلی کے برجپوری قبرستان میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر اعزا و اقربا کے علاوہ کثیر تعداد میں سینئر صحافی اور سیاسی رہنما موجود تھے۔ شہر ادب لکھنؤ کے مہذب لکھنوی کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے سید فدا علی مشرقی دہلی کے خوریجی خاص میں مقیم تھے۔ پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) کے منظور شدہ فوٹو گرافر سید فدا علی نے 1950 میں فوٹو صحافت کے پیشے کو منتخب کیا اور 1959 میں دہلی آئے اور ایک نیوز ایجنسی میں فوٹو گرافر کی حیثیت سے اپنے کریئر کا آغاز کیا۔ 1962 میں انھوں نے اردو اخبار 'بنیاد' میں ملازمت اختیار کی۔ اس دوران کئی دیگر اخبار کو بھی مفت خدمات فراہم کرنے والے سید فدا علی کا نام عصر حاضر کے فوٹو صحافیوں میں نہایت نمایاں اور قابل قدر ہے۔ انھوں نے کیمرے کو اپنی زبان اور ادبی، ثقافتی نیز قیاسی پروگراموں کو اپنا میدان بنا رکھا تھا۔ مرحوم نے اپنے پیشے پر کبھی بھی بڑھتی عمر اور بیماری کو حاوی نہیں ہونے دیا اور کچھ روز پہلے تک اپنے لرزتے ہاتھوں میں کیمرہ سنبھالے نظر آئے۔ فدا علی کے ذریعے لی گئی تصاویر ہماری تہذیب اور ثقافت کی ترجمان ہیں۔ مرحوم کو ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں کئی ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے جن میں شوبھنا ایوارڈ (1984)، فلم ستارے ایوارڈ (1985)، غالب میموریل ویلفیئر سوسائٹی ایوارڈ (1986)، دہلی اردو اکادمی ایوارڈ کے 'مصور اردو' ایوارڈ (1986) کے علاوہ دو درجن سے زائد اعزازات شامل ہیں۔ ان کے انتقال پر دنیائے صحافت سے وابستہ معزز شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔ 'صحافت' کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر حسن شجاع نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ فدا علی ہمارے سرپرستوں میں سے تھے جنھوں نے فوٹو صحافت کے ذریعے ادارے کو منفرد پہچان دلوائی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 دسمبر 2017

مشہور بنگالی اداکار پارتھا مکھر جی

کلکتہ: بنگالی فلموں کے مشہور اداکار پارتھا مکھر جی کا 25 دسمبر کو گردہ فیل ہونے کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر

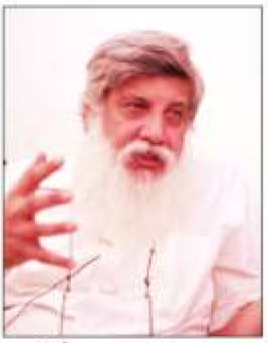

70 سال تھی۔ انھوں نے کم عمری میں ہی اپنی اداکاری سے شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی طبیعت گذشتہ اکتوبر سے ہی خراب تھی اور انھیں پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں داخل کرایا گیا تھا۔ پارتھا مکھر جی کو 1956 میں پہلی فلم میں کاسٹ کیا گیا تھا۔ کم عمری کے باوجود ان کی اداکاری کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ انھوں نے کئی اہم و مشہور بنگالی فلموں میں اداکاری کی تھی۔ انھوں نے اتم کمار کے ساتھ کئی فلموں میں اداکاری کی تھی۔ ان کی پیدائش 21 جون 1947 میں ہوئی تھی۔ جنوبی کلکتہ میں واقع چکرابیریا ہائر سیکنڈری اسکول سے انھوں نے ہائر سیکنڈری پاس کیا تھا۔ اس کے بعد بی کام کرنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے ایم کام میں داخلہ لیا مگر فلمی مشغولیات کی وجہ سے کورس مکمل نہیں کر سکے۔ چٹرجی بہترین اداکار کے ساتھ ایک بہترین گلوکار بھی تھے۔ وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی نے پارتھا چٹرجی کے انتقال پر ان کے اہل خانہ اور مداحوں کی تعزیت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 26 دسمبر 2017

انور جلال پوری

لکھنؤ: بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر، ناظم مشاعرہ، ادیب اور ہر دلعزیز شخصیت انور جلال پوری کا 2 جنوری کو صبح تقریباً 10 بجے کے جی ایم یو کے ٹراما سنٹر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 برس تھی۔ ان کی بیٹی نزہت کا گزشتہ دنوں لندن میں انتقال ہوگیا تھا، جس کے بعد وہ ٹوٹ سے گئے تھے۔ گزشتہ 28 دسمبر بروز جمعرات اپنے آبائی وطن جلالپور میں اپنی بیٹی کے چالیسویں میں شرکت کے بعد لکھنؤ واپس آئے اور شام 6 بجے باتھ روم گئے تھے، جہاں اچانک انھیں برین اسٹروک ہوا اور وہ باتھ روم میں ہی غش کھا کر گر پڑے۔ کافی دیر تک باتھ روم سے جب باہر نہیں نکلے، تو ان کے اہل خانہ کو تشویش ہوئی، آواز دینے پر بھی جب اندر سے کوئی حرکت نہیں ہوئی اور دروزہ توڑا گیا۔ تبھی یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ انور جلال پوری باتھ روم میں بیہوش پڑے تھے۔ انھیں فوراً حرمین اسپتال لے جایا گیا، جہاں سے ٹراما سنٹر ریفر کیا گیا، تب سے وہ وینٹی لیٹر پر تھے۔ ڈاکٹروں کی تمام کوششوں اور مداحوں کی دعاؤں کے باوجود افاقہ نہیں ہوا اور 2 جنوری کو صبح تقریباً 10 بجے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

انور جلال پوری 6 جولائی 1947 کو حافظ محمد ہارون کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کا نام انوار احمد تھا جو بعد میں انور جلالپوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے 1966 میں گریجویشن کیا اور 1968 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اودھ یونیورسٹی سے 1978 میں اردو ادب میں ایم اے کیا۔ وہ این ڈی کالج جلال پور میں انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے۔ وہ اتر پردیش مدرسہ تعلیمی بورڈ کے صدر رہے۔ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ کی ورکنگ کونسل کے رکن، نیرج شہریار ایوارڈ انتخابی کمیٹی علی گڑھ کے رکن، این سی پی یو ایل نئی دہلی کے رکن، اتر پردیش اردو اکادمی کے رکن، اتر پردیش ریاستی

جج کمیٹی کے رکن اور لوک عدالت امبیڈکر نگر کے رکن رہے۔ وہ اردو اور ہندی دونوں حلقوں میں یکساں طور پر مشہور تھے۔ ان کی شاہکار تصنیف 'اردو شاعری میں گیتا' ہے جس کا ترجمہ انھوں نے اردو اور دیوناگری رسم الخط میں کیا۔ اس کے علاوہ ان کی اہم تصنیفات میں توشۂ آخرت، اردو شاعری میں گیتانجلی، اردو شاعری میں رباعیات خیام، جاگتی آنکھیں، خوشبو کی رشتے داری، کھارے پانیوں کا سلسلہ، پیار کی سوغات، ادب کے اکثر چنندہ اشعار، روشنائی کے سفیر، اپنی دھرتی اپنے لوگ، قلم کا سفر، سفیران ادب، ضرب لا الہ، جمال محمد، بعد از خدا، حرف ابجد، راہ رو سے رہنما تک شامل ہیں۔ انور جلال پوری پر ڈاکٹر اسلم الہ آبادی اور عبدالرشید نے تحقیقی مقالے لکھے جن پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 'انور جلال پوری ادب کے آئینے میں' شائع ہوا جسے ڈاکٹر جاں نثار عالم نے مرتب کیا۔ 'ریز آف تھاٹس' نام سے انگریزی میں بھی ان پر کام ہوا۔ انھوں نے فلم اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی خدمات انجام دیں۔ انھیں 16-2015 میں اترپردیش کے سب سے باوقار 'یش بھارتی' اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ اترپردیش اردو اکادمی نے اردو شاعری میں گیتا کے لیے قومی یکجہتی ایوارڈ، بہار اردو اکادمی نے بھی 2015 میں اردو شاعری میں گیتا کے لیے ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ اترپردیش گورو سمان، فراق ایوارڈ، مائی رتن ایوارڈ، اردو اکادمی نے 'کھارے پانیوں کا سلسلہ' کے لیے ایوارڈ، خوشبو کی رشتہ داری پر اردو اکادمی کا ایوارڈ، ہندی ساہتیہ سمیلن پریاگ الہ آباد سے ایوارڈ، میر اکادمی لکھنؤ کی جانب سے افتخار میر ایوارڈ، مہا کوی کبیر داس اسرتی مکھر مہوتسو ایوارڈ، بزم ادب روڑکی اتراکھنڈ کی جانب سے شہنشاہ نظامت ایوارڈ، راجیو گاندھی یادگار کمیٹی وارانسی کی جانب سے نظیر بنارسی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ مختلف تنظیموں کے سرپرست بھی رہے۔ انور جلال پوری نے نوجوانی میں سیاست بھی کی اور 62-1961 میں نریندر دیو انٹر کالج جلالپور میں وہ اسٹوڈنٹس یونین کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اور شبلی نیشنل ڈگری کالج کی میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انھوں نے مرزا غالب انٹر کالج اپنے آبائی وطن جلال پوری میں قائم کیا جو آج بھی تعلیمی خدمات بخوبی انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے ان تمام ممالک میں جہاں اردو سمجھی، پڑھی اور بولی جاتی ہے وہاں مشاعروں میں شرکت کی اور اپنے نظامت کا لوہا منوایا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 جنوری 2018

خراج عقیدت:

خداداد خاں مونس

نئی دھلی: اردو کے معروف شاعر اور درگاہ خواجہ کے سابق ایڈمنسٹریٹر خداداد خاں مونس کے انتقال پر اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی جانب سے 1739 پٹوڈی

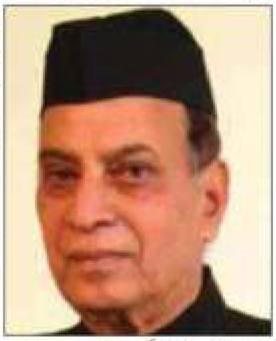

ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی میں ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ واضح ہو کہ ان کا انتقال 25 دسمبر 2017 کو 89 سال کی عمر میں بھواڑی گڑگاؤں، ہریانہ میں ہوا۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے، دو بیٹیاں اور بیوہ ہیں۔ اس موقعے پر معروف صحافی معصوم مرادآبادی (ایڈیٹر خبردار جدید) نے صدارت کی اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ سرزمین راجستھان میں پیدا ہوئے چند اہم اردو کے ادبا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے خلا کا پر ہونا بظاہر انتہائی مشکل ہے۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی کارگزار صدر ڈاکٹر سید احمد خاں نے جے پور میں دوران طالب علمی (میڈیکل) مختلف سرگرمیوں میں ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان سے بے حد متاثر تھے۔ اظہار تعزیت کرتے ہوئے معروف صحافی ندیم صدیقی نے بتایا کہ خداد خاں مونس راجستھان اردو کے اکادمی کے سکریٹری، مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کے ڈائرکٹر، ایم ڈی ایس یونیورسٹی (اجمیر) کے رجسٹرار بھی رہے اور ان کی چھ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ترجمان الفرید (بابا فرید شکر گنج کے پنجابی کلام کا منظوم ترجمے کی) شائع ہوئی تھی جو بعد میں انگریزی میں بھی طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ مونس مرحوم نے فارسی کلام خواجہ معین الدین چشتی کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا نیز مونس مرحوم نے شمیم جے پوری، مخمور سعیدی، احترام الدین شاغل، بلراج کھوسلہ واقف، لکشمی نارائن فارغ جیسے شعرا کا مونوگراف بھی لکھا تھا جبکہ دیوان اخگر (منشی عبدالحمید اخگر) اور مولوی اشفاق رسول جوہر پر اُن کا تحقیقی کام بھی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 دسمبر 2017

صحافی احتشام قریشی اور فوٹوگرافر سید فدا علی

نئی دھلی: معروف تھنک ٹینک انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی کے چیئرمین اور آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اپنے ایک اہم تعزیتی بیان میں انگریزی روزنامہ 'ہندوستان ٹائمز' سے طویل عرصے سے وابستہ معروف صحافی، احتشام قریشی اور اردو میڈیا کے سینئر جرنلسٹ سید فدا علی کے سانحۂ ارتحال پر اپنے شدید ملال کا اظہار کرتے ہوئے جہاں ان کے لیے دعائے مغفرت کی ہے وہیں متوفیان کے پسماندگان کے تئیں بھی اپنی ہمدردی و تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ مرکزی دفتر آل انڈیا ملی کونسل سے جاری بیان میں ڈاکٹر محمد منظور عالم نے کہا کہ مرحوم سید فدا علی رضوی نے صحافتی دنیا سے کم و بیش 56 سال وابستہ رہتے ہوئے تقریباً 5 لاکھ پروگراموں کو اپنے کیمروں میں قید کیا اور تقریباً 6 دہائیوں کے دوران متعدد اخبارات و جرائد کے ذریعے اردو دنیا کو اپنی غیر معمولی خدمات پیش کیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 دسمبر 2017

عمران راعین

فتح پور / بارہ بنکی: بزم شعر و ادب محمود آباد کے جنرل سکریٹری اور معروف شاعر محمد عمران راعین (52) کے سانحہ ارتحال پر مقامی بزم ارباب سخن کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کا انعقاد ہوا جس میں شعرا اور محبان اردو کے ذریعے مرحوم شاعر کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ قابل ذکر ہے کہ مرحوم کا انتقال 25 دسمبر 2017 کو ہوا تھا۔ مستان روڈ پر واقع بزم کے دفتر میں منعقدہ اس نشست کی صدارت کرتے ہوئے بزم کے بانی قاری عبدالستار بلالی نے مرحوم کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ عمران صاحب ایک اچھے شاعر، شہنشاہ ترنم اور اردو ادب کا ستون تھے، انھوں نے اپنی بزم کے ذریعے اردو ادب کو فروغ دینے میں جو خدمات پیش کیں وہ قابل قدر ہیں۔ قصبہ کے معروف افسانہ نگار رحمٰن عباسی نے اپنے تعزیتی کلمات میں کہا کہ مرحوم ایک کہنہ مشق شاعر تھے، ان کا انتقال ایک ادبی سانحہ ہے وہ شاعر کے ساتھ ساتھ باکمال اور مخلص انسان تھے، مشاعروں اور ادبی محفلوں میں اور اپنے مخصوص انداز ترنم اور معیاری کلام سے محفل میں ایک سماں باندھ دیتے تھے، ماہر معالج ڈاکٹر توصیف صدیقی نے کہا کہ مرحوم کا انتقال ادب کا بہت بڑا خسارہ ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ نشست کی نظامت امیر فیصل نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2017

سولاپور کل ہند کتاب میلے کی تصویری جھلکیاں

URDU DUNIYA Monthly, February-2018, Vol.20, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/01/2018**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

نئی دہلی عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کے اسٹال کے افتتاح کی تصاویر

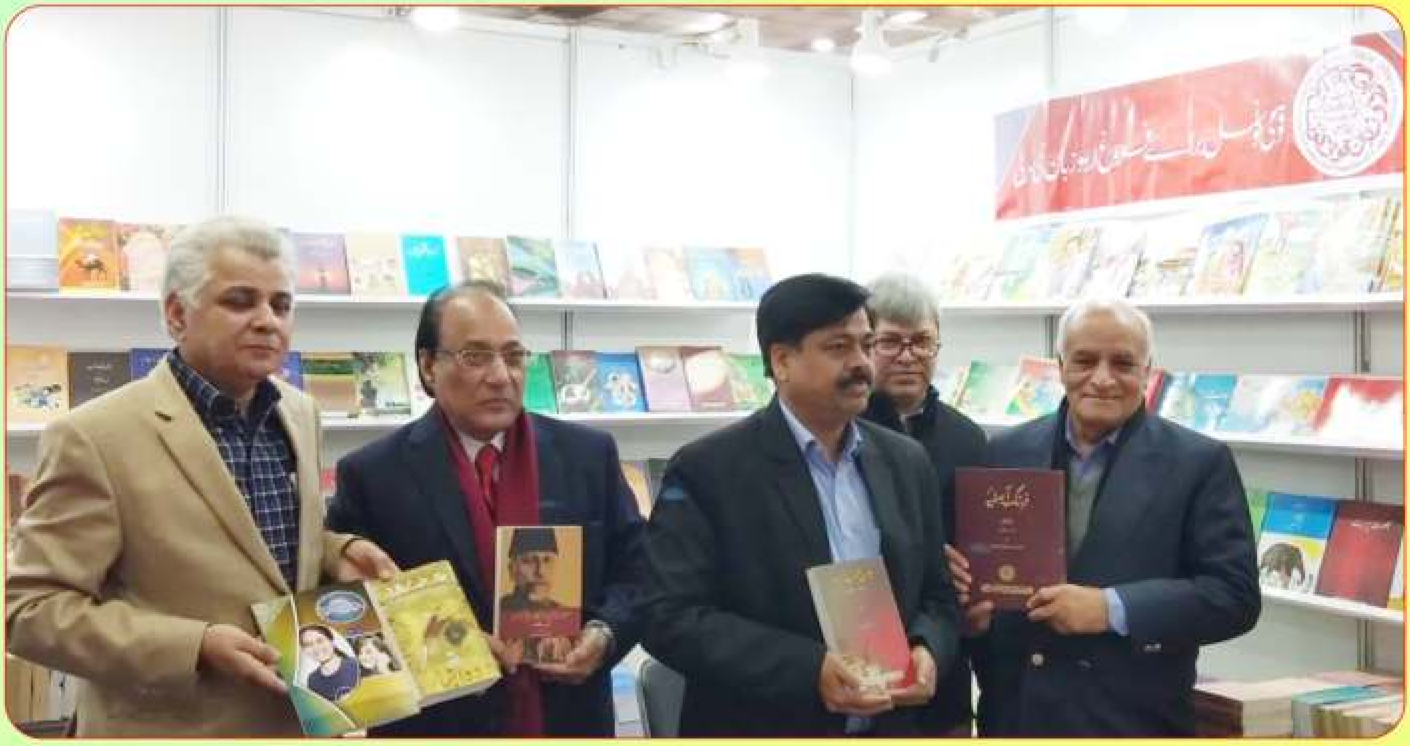

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025